وُرودِ مسعود

(خود نوشت سوانح حیات)

مسعود حسین خاں

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری
پٹنہ

وُرُودِ مسعود

(خود نوشت سوانح حیات)

مسعود حسین خاں

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری
پٹنہ

تقسیم

کار:

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی — 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ اردو بازار، دہلی — 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، بمبئی — 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ — 202002

قیمت

(لیتھو کلر پرنٹرس، اچل تال، علی گڑھ فون نمبر ۴۱۸۵)

فہرست

پہلا باب

خاندان ، وطن ، ولادت ، بچپن ۷

دوسرا باب

جامعہ ملیہ اسلامیہ (۱) ۳۷

تیسرا باب

‘بنگلہ دیس اک رنگ بھون .....’ ۴۷

چوتھا باب ۶۵

مرحوم دہلی کالج

پانچواں باب

علی گڑھ (۱) ۸۰

چھٹا باب

کچھ غمِ جاناں، کچھ غمِ دوراں ۹۵

ساتواں باب

علی گڑھ (۲) ۱۱۰

آٹھواں باب

'مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں' ۱۳۱

نواں باب

علی گڑھ (۳) ۱۵۵

دسواں باب

'ڈھونڈھنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں' ۱۷۷

گیارھواں باب

'دکن مُلک بھوتیچ خاصا اہے' ۱۹۳

بارھواں باب ۲۰۸

علی گڑھ (۴)

تیرھواں باب

جامعہ ملّیہ اسلامیہ (۲) ۲۲۱

چودھواں باب

علی گڑھ (۵) ۲۵۱

پندرھواں باب

"درخت بہ کاشمر کشا...." ۲۵۹

سولھواں باب

علی گڑھ (۶) ۲۷۹

سترھواں باب

"شادم از زندگیٔ خویش...." ۲۹۷

ع

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو

پہلا باب

خاندان۔ وطن۔ ولادت۔ بچپن

"دُرودِ مسعود" کی داستان کا آغاز ۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء بروز منگل، فجر کی اذان کے وقت غلام حسین خاں کی حویلی سے (جو عرفِ عام میں "محل" کے نام سے مشہور تھی) شروع ہوتا ہے جہاں بڑے گھر کی بیٹی فاطمہ بیگم نے اپنے چوتھے بچے اور دوسرے لڑکے کو جنم دیا۔ بچّے کے والد، مظفّر حسین خاں نے اُس کا نام مسعود تجویز کیا جس کے آگے مورثِ اعلیٰ کے نام "حسین خاں" کے اضافے کے بعد پورا نام "مسعود حسین خاں" قرار پایا۔

میرے والد مظفر حسین خاں، چھٹی پیڑھی میں حسین خاں کی نسل سے تھے جو قائم گنج ضلع فرخ آباد (یوپی) میں اپنی درویش صفتی اور علمیّت کی وجہ سے "مُلّا اخون" (مُلّا آخون / آخوند = بڑے استاد) کے لقب سے مشہور تھے۔ وہ ۱۷۱۵ء کے لگ بھگ اپنے توام بھائی حُسن خاں کے ہمراہ صوبہ سرحد کے آزاد قبائلی علاقے تیراہ سے تلاشِ معاش میں قائم گنج آئے تھے۔ تیراہ، بنّوں کوہاٹ کے شمال میں آفریدی پٹھانوں کا علاقہ ہے، جن کی آبادیاں درّۂ خیبر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آفریدی قبیلے کا ذکر پہلی بار سکندرِ اعظم کے مورّخ ہیروڈوٹس نے "اپریدا" کے نام سے کیا ہے۔ اُس کے مطابق اس قبیلے نے سکندرِ اعظم کی فوجوں کو درّۂ خیبر سے گذرتے ہوئے سخت پریشان کیا تھا۔

قائم گنج کی نوآبادبستی میں آفریدی پٹھانوں کی آمد فرخ آباد کے نوابانِ بنگش کے بلاوے پر اٹھارویں صدی کے نصفِ اول میں ہوئی تھی۔ بنگش قبیلہ اُن سے قبل آکر گنگا کے کنارے

'پرانی ڈانگ' (پہاڑی) کے علاقے میں بس چکا تھا اور اس کا ایک من چلا نوجوان، محمد خاں بنگش، فرخ آباد کے نوابانِ بنگش خاندان کی داغ بیل ڈال چکا تھا۔ اسی نے سنہ ۱۷۱۳ میں اپنے بڑے بیٹے قائم خاں کے نام پر قائم گنج کا قصبہ آباد کیا اور اس کے ایک سال بعد ۱۷۱۴ء میں فرخ سیر کے نام پر گنگا ہی کنارے بیس میل کے فاصلے پر فرخ آباد کو بسا کر اپنا صدر مقام بنایا۔ نو وارد آفریدی پٹھان اپنے اپنے 'خیلوں' کے نام پر قصبہ قائم گنج کے ارد گرد محلّے بسا کر آباد ہو گئے مثلاً کلاں خیل، گُکّی خیل، مَوالخیل، شُکَل خیل وغیرہ۔ بعض محلّوں کے نام قدیم بستیوں کے نام پر رہے، ان میں سے بعض ہمیں ہندو مسلمان مشترک طور پر اپنی اپنی حد بندیوں کے ساتھ بسے ہوئے ہیں، جیسے پتورہ، کبیر پور، چِلانکا، چلوکی وغیرہ۔ ہمارا آبائی مکان مَوالخیل میں ہے جب کہ ننہیال پتورہ میں واقع ہے جو صرف چند فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ ددھیال کے مکان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ محلّے کے دوسرے مکانوں سے الگ تھلگ چاروں طرف باغوں سے گھرا ہوا ہے۔ ابتدا میں ہمارے پردادا 'غلام حسین خاں' عرف جُھمّن خاں کا مکان موجودہ مکان سے تھوڑے فاصلے پر کھیتوں کے درمیان، شُکَل خیل میں واقع تھا۔ اس کی بنیاد کے آثار اب تک موجود ہیں۔ مَوالخیل کا مکان ہمارے پردادا نے دکنی کنٹنجنٹ سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے دوسرے وکیل بیٹے، فدا حسین خاں کی آمدنی سے ذاتی بھٹّا لگا کر لکھوری اینٹ کا (جسے قائم گنج میں 'لگیا' اینٹ کہتے ہیں) ۱۹۰۰ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کے بارے میں خاندان میں یہ روایت مشہور ہے کہ دورانِ تعمیر ایک دن انھوں نے نہایت غیض و غضب کے عالم میں مزدوروں اور معماروں کو سخت سُست کہا، اس وقت درویش کرم علی شاہ میاں، جن سے انھیں حد درجہ عقیدت تھی، وہاں موجود تھے۔ وہ نہایت خاموشی سے اس منظر کو دیکھتے رہے۔ جب جُھمّن خاں کا غصّہ (جس کے لیے وہ سارے قائم گنج میں مشہور تھے) فرو ہو گیا تو انھوں نے انگلی کے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا "جُھمّن خاں، اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا تعمیر کردہ نیا مکان آباد رہے تو تمہیں آج کی نازیبا حرکت کا کفارہ دینا ہوگا اور وہ یہ

---

[1] "سرحدی پٹھانوں کی سیاسی اور معاشرتی تنظیم کی اکائی 'خیل' کہلاتی ہے" (یادوں کی دنیا) ان کے اوپر 'جرگہ' ہوتا ہے۔

ہے کہ تعمیر کا کام فوراً بند کر دو اور میرا رقعہ لے کر فلاں سادھو کے پاس متھرا چلے جاؤ۔ وہاں چالیس روز تک اپنے مٹھ میں وہ جو خدمت تم سے لے اسے خوش دلی کے ساتھ انجام دو۔" چنانچہ غلام حسین خاں نے اپنے مرشد کی ہدایت پر عمل کیا، تعمیر کا کام بند ہو گیا اور وہ مختصر سے زادِ راہ کے ساتھ متھرا کے لیے چل پڑے۔ کرم علی شاہ میاں کے سنّت دوست نے ان سے چالیس روز تک جاروب کشی کی خدمت لی۔ اس تزکیۂ نفس کے بعد وہ قائم گنج لوٹے اور تعمیرِ مکان کا سلسلہ پھر شروع کیا۔

اُن کے اِس کفّارے کا 'محل' کی آبادی پر کہاں تک اثر پڑا یہ محلِ نظر ہے، اس لئے کہ ۱۹۰۰ء تا حال یہ مکان صحیح معنوں میں کبھی بھی آباد نہیں رہا۔ البتہ شادی بیاہ کے موقعوں پر اہلِ خاندان جمع ہو جاتے اور یہ کچھ دن کے لیے کھُل جاتا۔ یا دادا اور والد دِق کے موذی مرض میں گرفتار ہو کر اپنی زندگی کے آخری دن بِتانے کے لئے یہاں آ گئے تھے، یا ہماری دادی بیوہ ہو جانے کے بعد ۱۹۰۷ء میں اپنے بچوں کی ٹولی لے کر چند سال تک اس میں مقیم رہیں اور پھر طاعون کی وبا کا شکار ہو گئیں۔

۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء کو میری پیدائش اسی گھر کے زنانے حصّے کی بائیں طرف والی کوٹھری میں ہوئی تھی۔

میری والدہ کے پاس کافی دودھ نہ ہونے کی وجہ سے مجھے گھر کی دھوبن پنجا کی جَرو (جورو) کا دودھ پینا پڑا۔ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا اثر میری شخصیت پر کیا پڑا (غالباً کچھ بھی نہیں) البتہ میری آمدنی پر یہ اثر ضرور پڑا کہ میرے برسرِ کار ہو جانے کے بعد ہمیشہ مجھ سے اپنا حق لیتی رہی۔ اور مسلمان ماں کی روایت کے مطابق مجھے یہ دھمکی دیتی رہی کہ اگر میں اس کا حق نہیں دوں گا تو وہ مجھے دودھ نہیں بخشے گی۔ آج جو میں اپنے نواسوں اور نواسیوں کے دودھ کے لئے حفظانِ صحت کے جس انتظام اور اہتمام کو دیکھتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے عہد طفلی کو جیتے جاگتے کیسے پار کر لیا۔ میں نے تو دھوبن ہی کا دودھ پیا تھا۔ میرے منجھلے ماموں کو تو گدھیا (گدھی) کا دودھ پینا پڑا تھا! اُس وقت میرے والد، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔ اے۔ اِل۔ اِل۔ بی کرنے کے بعد ریاست حیدر آباد کے ضلع ورنگل میں محکمۂ عدالت میں مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز

تھے۔ ابھی ملازمت کو تین سال کی مدت نہیں گزری تھی کہ دق کے خاندانی مرض نے گھیر لیا۔ اُن کی زندگی کے آخری سال مرض الموت میں گرفتار اسی مکان میں گزرے جہاں انھوں نے اپریل ۱۹۲۱ء میں صرف ۲۸ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اس وقت میری عمر دو سال دو مہینے کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ میں اکثر دبے پاؤں اُن کے کمرے میں پہنچ جاتا اور چارپائی کے پاس پڑی ہوئی جھاڑو اُٹھا کر زور سے مارتا۔ اُنھیں سراسیمہ دیکھ کر مجھے لطف آتا۔ وہ چھوت کی وجہ سے نہیں چاہتے تھے کہ کوئی بچہ ان کی چارپائی کے پاس آئے اس لیئے زور سے چلّا کر پکارتے "ارے کوئی ہے۔ دیکھو یہ مسعود نے پھر وہی حرکت کی"۔ ان کی شخصیت اور اعادات کے بارے میں اہلِ خاندان سے بہت سی کہانیاں سنتا رہا تھا لیکن حافظے پر زور دینے کے باوجود میرے ذہن میں ان کی کوئی تصویر نہیں بنتی۔ یہ بھی سنا تھا کہ وہ بہت کم سخن تھے۔ ان میں ایک خاص قسم کی متانت تھی جس سے ان کے تمام چھوٹے بھائی خوفزدہ رہتے تھے۔ چھوٹے بھائیوں سے جو انھیں "بھائی جان" کہتے تھے وہ عام طور پر رقعوں کے ذریعے بات کرتے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اُن میں تحفظِ زن کا افغانی جذبہ شدت سے موجود تھا اور ان کی ممانعت تھی کہ والدہ کسی قسم کا باریک کپڑا جس سے بدن جھلکے، نہ پہنیں، بلکہ اسی بات پر ایک بار اُنھیں مارا بھی تھا، جس پر میرے نانا "جان عالم خاں"، اپنی رئیس اعظمی کے زعم میں مکان پر چڑھ کر آئے تھے۔ اس پر میرے والد نے بھی سخت رویّہ اختیار کیا۔ بہر حال معاملہ آگے نہ بڑھا اور عزیزوں کی مداخلت سے رفع دفع ہو گیا۔

والد کے انتقال کے بعد ہماری والدہ بچّوں کو لے کر اپنے میکے پتورہ چلی آئیں۔ میری ننھیال ایک بھرا پُرا خاندان تھا۔ میری نانی صاحبہ اپنی بڑی بیٹی کو بہت چاہتی تھیں لیکن وہ بھی بیوگی کے صدمے کا کچھ علاج نہ کر سکیں۔ والدہ دن بھر روتی رہتیں، یہ تو دیکھنے والوں کا بیان ہے، دل پر کیا گذرتی ہو گی اس کا علم کسی کو نہیں۔ بالآخر رو رو کر انھوں نے خود کو اس درجہ ہلکان کیا کہ دماغ میں رسولی بن گئی۔ سال بھر تک میری نانی صاحبہ انھیں فتح گڑھ اور لکھنؤ ہر جگہ علاج کی خاطر لے گئیں لیکن ہونی اَن ہونی نہ ہو سکی اور بالآخر اپریل ۱۹۲۴ء کو والد کے انتقال کے تین سال بعد چار چھوٹے چھوٹے بچوں کو بلکتا چھوڑ کر وہ بھی راہیِ ملکِ عدم ہوئیں۔ میں اس وقت ۵ برس دو مہینے کا تھا۔ اُن کے کل پانچ اولادیں ہوئیں: ۱۔ امتیاز حسین خاں ۲۔ خدیجہ بیگم

۳- رقیہ بیگم- ۴- مسعود حسین خاں اور ۵- شاہد حسین خاں۔ رقیہ کا انتقال اُن کے سامنے بچپن میں ہو گیا تھا۔ شاہد والد کے انتقال کے بعد پیدا ہوا اور والدہ کے انتقال سے کچھ ہی عرصے کے بعد ڈیڑھ سال کا ہو کر، اپنی انّا کی ہڑک میں، جو اُسے چھوڑ کر چلی گئی تھی، اور جسے وہ اپنی ماں سمجھتا تھا، روتا رُلاتا گذر گیا۔ میرے حافظے میں اس کی موت کا منظر محفوظ رہ گیا ہے۔ ننہال کے زنانے میں چھجّے کے نیچے ایک چارپائی پر اس کی ننھّی سی لاش رکھی ہوئی تھی اور خاندان کی عورتیں اس کے نزدیک بَین و بکا کر رہی تھیں۔ بار بار میری والدہ فاطمہ کا نام لیا جا رہا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر میں ایسا مبہوت کھڑا ہوا تھا گویا میں خود مر گیا ہوں!

اس طرح مظفّر حسین خاں اور فاطمہ بیگم کی اولاد کا سلسلہ تین بچّوں سے چلا۔ ۱- امتیاز حسین خاں ۲- خدیجہ بیگم اور ۳- مسعود حسین خاں۔ امتیاز حسین خاں جنھیں میں قائم گنج کی زبان میں "ادّا"[۱] کہتا تھا عثمانیہ یونیورسٹی میں پہلے صدرِ شعبۂ کامرس اور بعد کو پرنسپل سکندر آباد کالج کے عہدے تک پہنچے۔ ملازمت ہی کے دوران مارچ ۱۹۶۶ء میں حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کیا۔

میری اور ان کی عمر کے درمیان تقریباً ۶ سال کا فرق تھا۔ اس لیے میرے اور ان کے مابین بڑے اور چھوٹے بھائی کی دوری کا رشتہ قائم رہا، دوستی کا نہیں۔ وہ بڑی محبت اور مروّت کے انسان تھے۔

میری بیوی کا خیال ہے کہ اُن سے زیادہ نیک انسان ہمارے خاندان میں کوئی دوسرا نہیں ہوا ہے۔ اُن کے بارے میں میرے جذبات کا اندازہ اس قطعے سے کیا جا سکتا ہے جو میں نے اُن کے لوحِ مزار پر کندہ کرایا ہے۔

وہ لختِ دل تھا مظفّر[۱] کا فاطمہ[۲] کا لال   محبِّ ذاکر[۳] و محبوبِ یوسف[۴] و محمود[۵]
جہانِ مہر و محبّت کا اک حسین خیال   دلِ خدیجہ[۶] تھا وہ اور دیدۂ مسعود[۷]

---

[۱] یہ لفظ پنجابی زبان میں بڑے بھائی اور باپ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور قائم گنج کی زبان میں اسی علاقے کے پٹھانوں کے ساتھ آیا تھا۔

[۱] مظفر حسین خاں (والد) [۲] فاطمہ بیگم (والدہ) [۳] ذاکر حسین خاں (چچا) [۴] یوسف حسین خاں (چچا) [۵] محمود حسین خاں (چچا) [۶] خدیجہ بیگم (بہن) [۷] مسعود حسین خاں (بھائی)

خدیجہ بیگم میری بڑی بہن ہیں جو حیات ہیں اور فی الحال اپنی چھوٹی صاحبزادی کے ساتھ علی گڑھ میں مقیم ہیں۔

والدہ/والدہ کا چہرہ مہرہ میرے حافظے میں بالکل محفوظ نہیں رہا۔ صرف اس قدر یاد ہے کہ لکھنؤ میں وہ جس محلّے میں علاج کے سلسلے میں مقیم تھیں وہاں بندروں کی کثرت تھی جو ان کی تشویش اور میری تشویق کا باعث رہتے۔ دماغ کی رسولی کا اثر اُن کی ایک آنکھ پر بھی پڑا تھا جو انگارے کی طرح سُرخ رہتی تھی۔ ننہال میں بچپن گذرنے کی وجہ سے اُن کا تذکرہ میں بار بار سُنتا، اس لئے اکثر تنہائیوں میں ان کو اپنے تصوّر میں لانے کی کوشش کرتا اور جب اس میں کامیابی نہیں ہوتی تو بے تحاشا میرے آنسو نکل پڑتے اور یتیمی کے غم کو مَیں شدّت کے ساتھ محسوس کرتا۔

مورثِ اعلیٰ حسین خاں (مدآخون) نے پٹھانوں کی کئی نسلوں کی تربیت کی تھی۔ ان کا انتقال سو برس سے اوپر ہوا تھا اس لیے آخر میں ایک صوفی باصفا کی حیثیت سے بہت سے پٹھانوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کرلی تھی۔ ان کے بیٹے احمد حسین خاں اور پوتے محمد حسین خاں نے قلم پر شمشیر کو ترجیح دی اور مختلف رجواڑوں میں فوجی ملازمتیں اختیار کیں۔ اِن دونوں کی حیات کے بارے میں تفصیلات نہیں ملتیں۔ پردادا غلام حسین خاں (عرف جھمّن خاں) نے ریاست حیدرآباد میں فوجی ملازمت اختیار کی۔ وہ افسرالملک کے ساتھیوں میں تھے۔ خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد، ساتھیوں کے اصرار کے باوجود، انھوں نے اپنے وطن قائم گنج کی سیدھ لی۔ تقریباً یہی وطیرہ قائم گنج کے اُن تمام پٹھان گھرانوں کا رہا ہے جو فوجی ملازمت کے سلسلے میں خود باہر رہتے اور بال بچّوں کو قائم گنج میں رکھتے، جہاں ہر گھرانے کی کچھ سکنی وصحرائی جائیداد ہوتی تھی۔ آموں کے موسم میں طویل مدت کی رخصت پر وطن آتے۔ اپنی طویل غیر حاضری کی وجہ سے وہ اپنے بال بچّوں کی تعلیم و تربیت پر خاطر خواہ توجہ نہیں دے پاتے تھے۔ یہی صورتِ حال ہمارے دادا فدا حسین خاں کی تھی جو جھمّن خاں کے دوسرے بیٹے تھے۔ اُن کے بڑے بھائی عطا حسین خاں نے تو والد کے نقشِ قدم پر چل کر ریاست حیدرآباد میں فوجی ملازمت اختیار کی اور رسالدار کے عہدے تک پہنچے لیکن چھوٹا بھائی جو جسمانی اعتبار سے بھی کمزور تھا قائم گنج ہی میں رہ کر مڈل اسکول کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس سے فارغ ہو کر کچھ مرادآبادی سامان کے ساتھ وہ ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد

پہنچے جہاں خاندان اور وطن کے کئی اشخاص بسلسلۂ ملازمت پہلے سے موجود تھے۔ تجارت کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے ٹروس کے ایک وکیل صاحب کی توجہ سے وکالت کے امتحان کی تیاری شروع کردی۔ چونکہ اِن امتحانات کا ذریعۂ امتحان اردو تھی اور اس پر اُنھیں خاصا عبور تھا، اس لئے امتیاز کے ساتھ وکالت کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد ترقی کے زینے کھُلتے گئے۔ کچھ عرصہ حیدرآباد میں وکالت کرنے کے بعد وہ اورنگ آباد منتقل ہوگئے۔ جب وہاں اپنی ذہانت کا سکّہ جمالیا تو ہائی کورٹ میں وکالت کرنے کی غرض سے پھر حیدرآباد مراجعت کی۔ یہاں اُن کی قانونی ذہانت کے جوہر اور کھلے اور بہت جلد ان کا شمار چوٹی کے وکیلوں میں ہونے لگا۔ پیشہ ورانہ کامیابی کے ساتھ ہُن برسنے لگا۔ اُن کا انتقال ۱۹۰۷ء میں صرف ۳۹ برس کی عمر میں ہوگیا اور اُنھوں نے صرف سولہ سال وکالت کی، لیکن اس قدر کمایا کہ حیدرآباد کے بیگم بازار میں ایک شاندار دو منزلہ تعمیر کرایا جس کے بالائی حصّے میں اہل خاندان کی رہائش تھی اور نچلی منزل میں اُن کا ذاتی پریس تھا جس میں انکی تصانیف، قانون کی کتب اور رسالہ 'آئینِ دکن'، طبع ہوتا۔ حیدرآباد پہنچ کر وہ قائم گنج کی جانب سے غافل نہیں رہے جہاں ان کے والد مقیم تھے۔ دو گاؤں خریدے اور اپنے والد کو آمادہ کیا کہ وہ اپنی نگرانی میں پختہ حویلی تعمیر کرائیں، جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس حویلی کا زنانہ حصّہ تو قائم گنج کے دیگر متمول گھرانوں جیسا ہے یعنی ایک کوٹھا ایک وسیع دالان جس کے کناروں پر دو کوٹھریاں یا کمرے ہیں سامنے اونچی کرسی کا چوڑا سا چبوترہ اور اس کے نیچے بڑا سا آنگن۔ البتہ مردانہ حصّہ قائم گنج کی عام حویلیوں سے مختلف ہے اور اس میں حیدرآبادی فنِ تعمیر کا ٹھاٹھ آگیا ہے جس کی وجہ سے عام لوگوں نے اسے 'جمّن خاں کا محل'، یا صرف 'محل'، کے نام سے یاد کرنا شروع کردیا۔

فدا حسین خاں کا انتقال ۱۹۰۷ء میں ہوگیا۔ اُس وقت تک اُن کے چھ بیٹے پیدا ہو چکے تھے، ساتویں محمود حسین خاں، انتقال کے کچھ عرصے بعد پیدا ہوئے۔ میرے والد مظفر حسین خاں سب سے بڑے تھے۔ اُن کا سنہ پیدائش ۱۸۹۳ء ہے۔ تیسرے بیٹے ذاکر حسین خاں اور پانچویں یوسف حسین خاں سے سب متعارف ہیں۔ دادا کے انتقال کے بعد ہماری دادی نازنین بیگم (عرف دجّو) حیدرآباد سے قائم گنج آئیں تو ان کے ساتھ چھوٹے بچوں کی ایک کھیپ سی تھی۔

محمود حسین خاں کو چھوڑ کر، جو بہت چھوٹے تھے، باقی پانچوں بھائی (چھٹے بھائی جعفر حسین خاں کا بچپن میں انتقال ہو چکا تھا) اٹاوہ اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل کر دیئے گئے جہاں سے فارغ ہو کر میرے والد علی گڑھ کالج میں ایف۔ اے، بی۔ اے اور ایل ایل بی کی تعلیم حاصل کرنے چلے گئے۔ ان کے دوسرے، تیسرے اور چوتھے بھائی عابد حسین خاں، زاہد حسین خاں اور ذاکر حسین خاں بھی پہنچ گئے۔ یوسف حسین خاں اور محمود حسین خاں نے کچھ عرصے علی گڑھ گورنمنٹ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۰ء میں نئی قائم شدہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لیا۔ والد نے علی گڑھ سے تمام امتحانات امتیازات کے ساتھ پاس کیئے اور اس کے بعد حیدرآباد جا کر ریاست کے محکمۂ عدالت میں مجسٹریٹ ہو گئے۔

میری والدہ فاطمہ بیگم، جانِ عالم خاں (عرف ننھے میاں) اور اصغری بیگم (عرف بی) کی سب سے بڑی اولاد تھیں۔ جانِ عالم خاں اس زمانے میں تموّل اور جائیداد کے اعتبار سے قائم گنج کے رئیسِ اعظم کہلائے جاتے تھے اور ان کا مکان عرفِ عام میں "بڑا گھر" مشہور تھا۔ ننہال کی خوشحالی کے اصل بانی میرے نانا کے چچا حاجی فضل امام خاں تھے جنھوں نے نہ صرف صحرائی جائیداد پیدا کی بلکہ کپڑے کی تھوک تجارت اور نیل کی کوٹھیوں سے اس قدر کمایا کہ پٹھانوں میں ممتاز حیثیت اختیار کر لی۔ وہ لاولد تھے، اس لیئے انھوں نے اپنے بھتیجے کو سب کچھ سونپ دیا۔ جانِ عالم خاں انھیں کی جائیداد اور کمائی کے بل بوتے پر ساری عمر جانِ عالم پیا کا کردار ادا کرتے رہے اور رامش و رنگ سے زیادہ سروکار رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے جب علی گڑھ میں اسکول اور کالج قائم کیا تو ان کے گماشتے مسلمان زمینداروں کے نوجوانوں کی تلاش میں قائم گنج بھی پہنچے اور حاجی فضل امام سے جانِ عالم خاں کے بارے میں بات چیت کی لیکن حاجی صاحب کسی قیمت پر اپنے بھتیجے کو فرنگی طرزِ تعلیم دلانے پر تیار نہیں ہوئے۔ قائم گنج کے ماحول میں ان کی اسلامی تعلیم کا بھی خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا۔ اس لیئے ان کی لیاقت اردو کے منشی سے آگے نہ بڑھ سکی۔

میری ننہال نہ صرف تموّل بلکہ مشترکہ خاندان کی آبادی کے لحاظ سے بھی "بڑا گھر" تھا۔ میرے نانا دو بھائیوں میں تنہا اولاد تھے لیکن خود ان کے نصف درجن سے زائد بچے پیدا ہوئے جن میں سے چار بھائی اور دو بہنوں کی نسل کا سلسلہ خوب چلا۔ میری والدہ فاطمہ بیگم سب سے

بڑی اولاد تھیں۔ دوسری بہن راحت بیگم عرصے کے بعد میرے چچا یوسف حسین خاں سے منسوب ہوئیں۔ ماموں سُلطان عالم خاں نے خاندان کی معاشی حالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یو۔پی کی سیاست میں خوب نام کمایا اور سمپورنانند کی کانگریسی وزارت میں نائب وزیر کے عہدے تک عروج حاصل کیا چوں کہ وہ کچھ عرصے تک مسلم لیگ کے بھی سرگرم رکن رہے تھے، اس لئے بعد کے ہر الیکشن میں ان پر اس کی فردِ جرم لگائی جاتی اور بالآخر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ میرے دوسرے ماموں، قدوس عالم خاں (جو میرے خسر بنے) جائیداد کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی انتظامی صلاحیت سے جائیداد کی آمدنی دونی کردی، باغات لگائے اور ایک بہت بڑا فارم بنالیا۔ دونوں بھائیوں میں عشق سا تھا اس لیے کہ میں نے جائیداد یا آمدنی کے حسابات کے سلسلے میں دونوں میں کبھی من و تو کا جھگڑا نہیں دیکھا۔ سُلطان عالم خاں کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ اُن کے پاس مالیات کا ماہر اور فراہم کنندہ ایک چھوٹا بھائی ہر وقت اُن کی پشت پر موجود رہتا۔ میرے تیسرے ماموں، ناکام وکیل اور کامیاب شاعر، غلام ربّانی تاباںؔ ہیں۔ جن کے اور میرے درمیان بہت سی ذہنی قدریں مشترک رہی ہیں۔ وہ خاندان کے پہلے شاعر ہیں اور میں دوسرا۔ ہم دونوں کے علاوہ خاندان کے کسی فرد کو پہلے یا بعد کو توفیقِ شعر نہیں ہوئی، حالانکہ ذاکر صاحب اور یوسف صاحب دونوں کا مذاقِ شعری نہایت لطیف تھا۔ یوسف صاحب نے اقبالؔ اور غالبؔ کے نقاد کی حیثیت سے نام بھی پیدا کیا۔ چوتھے ماموں خورشید عالم خاں، جو ڈاکٹر ذاکر حسین کے داماد بھی ہیں، پارلیمنٹ کے رکن اور مرکزی سرکار کے مختلف محکموں کے ریاستی وزیر کی حیثیت سے جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کی تخصیص یہ ہے کہ وہ میرے ہم عمر ہیں اور بچپن کے ساتھی۔ ان کا مزید تذکرہ اپنے بچپن کے حالات بیان کرتے وقت کروں گا۔

والدہ کے انتقال کے بعد مجھے بڑی ممانی (بیگم سلطان عالم خاں) نے اپنی نگرانی میں لے لیا۔ وہ بڑی نیک بی بی تھیں۔ ان کا تعلق رائے پور کے ایک ممتاز خٹک پٹھانوں کے خاندان سے تھا۔ میں ان کے ساتھ اکثر ڈولی میں بیٹھ کر اُن کے میکے رائے پور جاتا۔ اُن کی اور میری نانی میں ساس اور بہو کی روایت کے مطابق، اکثر چل جاتی۔ مجھے اس وقت بڑی تکلیف ہوتی جب نانی صاحبہ حقارت کے لہجے میں انھیں "خٹکنی" کہہ کر پکارتیں۔ گویا خٹک کوئی نیچ ذات ہے۔

ہمارے علاقے میں ایک پست ذات کا نام کھٹیک تھا۔ بچپن میں، میں سمجھتا تھا کہ یہ اُن کا سلسلہ اِس ذات سے ملا رہی ہیں۔ بعد کو معلوم ہوا کہ خٹک پٹھان نسلی اعتبار سے آفریدی پٹھانوں سے کم نہیں۔ لیکن پٹھانوں کی سب سے بڑی کمزوری ان کا نسلی تفاخر ہے جو صرف دوسری ذاتوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ جس کی زد میں پٹھانوں کے دوسرے قبائل تک آجاتے ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ میرے منجھلے ماموں، قدوس عالم خاں کی شادی جب علی گڑھ کے شیروانی پٹھانوں میں ہوئی تو قائم گنج میں اس پر بھی بڑی چہ می گوئیاں رہی تھیں۔

پتورہ کے 'بڑے گھر' کی سب سے عظیم شخصیت نانی صاحبہ یا 'بی' تھیں۔ میری ابتدائی زندگی پر اُن کا گہرا اثر رہا ہے۔ وہ ایک عجیب وغریب شخصیت کی مالک تھیں، ولایتی رنگ روپ، گوری چٹّی، کرنجی آنکھیں اور گراں ڈیل جس محفل میں بیٹھتیں، چھا جاتیں۔ حقّہ اور پان کی شوقین، آخر عمر میں جب منہ پوپلا ہو گیا تھا تو 'پن کٹّی' ساتھ چلتی۔ حقّہ کا ہر وقت تازہ رہنا ضروری تھا۔ وہ پڑھی لکھی تو معمولی تھیں لیکن علم مجلسی سے اچھی طرح واقف تھیں۔ مَردوں تک کے کان کاٹتی تھیں۔ ڈاکٹر امیر داد (ڈاکٹر محمد امیر خاں) کا بھائی کہتے منہ سوکھتا تھا اور وہ اپنے سامنے بحیثیت طبیب کے انھیں ہیچ پوچ سمجھتیں۔ اُن کے تجویز کردہ ہر نسخے کو 'کچھ دُت' کہہ کر رد کر دیتیں۔ طبّی معلومات رکھنے کے علاوہ چھوٹی موٹی سرجن بھی تھیں۔ دور دور دیہات سے لوگ ٹوٹے ہوئے ہاتھ پیر جڑوانے پتورہ آتے۔ آج بھی قائم گنج میں اُن کی اس مہارت کے معترف مل جائیں گے جنھوں نے اُن کے گھامڑ طریقوں کے ضرب و کرب جھیل کر اپنے اُترے ہوئے کولھے یا بازو ٹھیک کرائے ہیں۔ اس قسم کے علاج کے لئے جب کوئی دیہاتی پھنستا تو گھر کے بچوں کے لئے جشن کا سا سماں بندھ جاتا۔ پہلے اس کو فرش پر لٹایا جاتا پھر گھر کے ملازمین کی جس قدر کمک مل سکتی تھی وہ حاصل کر کے اس کو گانٹھ لیا جاتا، اس طرح کہ ہل ڈل بالکل نہ پائے۔ پھر ڈنڈا لے کر نانی صاحبہ آتیں۔ حکم ہوتا کہ منہ پر رومال ڈال، کہ پردے کا التزام لازم ہے۔ اس طرح وہ بیچارہ جلاد کی شقاوت کا نظارہ تک نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بعد عضو کی رعایت سے ڈنڈے کا سہارا لے کر ہلکا یا بھاری پاؤں رکھا جاتا۔ اِس دوران مظلوم درد سے بے قرار ہو کر چیختا تو ڈانٹ پڑتی اور پاؤں کا وزن بڑھا دیا جاتا۔ وہ جس قدر بلبلاتا اور 'دیّا رام مر گیا' کی آواز بلند کرتا اس کے عضو کو کچلنے کا عمل تیز تر کر دیا جاتا

غرض اسی دھاچوکڑی میں کہیں ہڈیوں سے چٹ یا کھٹ آواز آتی، اعلان کیا جاتا کہ ہڈی بیٹھ گئی۔ گرفت ڈھیلی کردی جائے اور دباؤ بھی۔ مریض اس عمل سے فارغ ہونے کے بعد ادھ مرا سا ہو جاتا۔ پھر اسے ملنے کی دوائیں تجویز کی جاتیں۔ وہ رونا ہوا جاتا لیکن ہفتہ عشرہ کے بعد دعائیں دیتا، ہنستا ہوا آتا۔

انھوں نے اپنے دو معرکۃ الآرا علاج میرے اور اپنی پوتی نجمہ پر بھی (جو بعد کو میری دلہن بنی) بچپن میں کامیابی سے آزمائے تھے۔ میری عمر آٹھ برس کی ہوگی کہ مجھے گنڈ مالا (کنٹھ مالا، خنازیر) کا مرض ہو گیا تھا۔ مختلف قسم کے علاج کیے لیکن گلے کی گانٹھیں مکمل طور پر ختم نہ ہوئیں۔ ایک دن بولیں مسعودا کا (قائم گنج میں غالباً پشتو کے زیر اثر ناموں کے آگے ایک الف کا اضافہ کردیا جاتا تھا) علاج اب میں کروں گی۔ چنانچہ اپنے بنجر پر بسے ہوئے کنجڑوں کو حکم دیا گیا کہ جہاں سے بھی ہو کالا سانپ مار کر فراہم کریں۔ جب وہ آگیا تو اسے کڑوے تیل میں اس قدر اُبالا گیا کہ اس کا گھلوا ہو گیا۔ اس کے بعد اس کو کپڑے میں چھان لیا گیا۔ یہ تھا کالے سانپ کا تیل۔ اب میرے گلے کے دونوں جانب کی گلٹیوں پر روزانہ اس کی مالش کی جاتی ساتھ میں شکر آمیز کسی چیز کے بیج کے لڈو بنا کر کھلائے جاتے۔ لیجیے صاحب! جو کام مہینوں میں نہیں ہوا تھا وہ ہفتوں میں ہو گیا اور اس کے بعد مجھے یہ عارضہ کبھی نہیں ہوا۔

اسی طرح نجمہ جو کہ تقریباً اندھی پیدا ہوئی تھیں اور جن کے بارے میں ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ یہ لڑکی اندھی رہے گی اس لئے کہ اس کی پُتلی نہیں بنی ہے، جب ہر طرف سے مایوسی ہو گئی تو اللہ اللہ کہہ کر اس کو صحتیاب کرنے کا بیڑا اغو دا ُٹھالیا۔ نانی صاحبہ کو طب کے مجربات کے علاوہ ٹوٹکے بھی بہت یاد تھے جو انھوں نے درویشوں، فقیروں اور جوگیوں سے سُن رکھے تھے۔ چنانچہ حکم دیا گیا بچّی کے لیے روز آدھ پاؤ بکری کے گوشت کے پارچے لائے جائیں۔ یہ پارچے آنکھوں کے اوپر ایک مخصوص مدّت کے لیے باندھ دیئے جاتے۔ رفتہ رفتہ سُرخی غائب ہونے لگی اور چند ہفتوں کے اندر آنکھوں میں روشنی آگئی۔ ایسی کہ آج ۵۸ سال کی عمر میں بھی قائم ہے!

بی، بڑی اچھی داستان گو بھی تھیں، ایسی کہ گھر کے سارے بچے اُن کے افسانوں

کو بھی حقیقت سمجھتے۔ مثلاً گورکھپور اور اس کے نواح کا (جہاں والد کے ساتھ ان کا بچپن گزرا تھا) ذکر کرتے ہوئے کہتیں: گھنے گھنے جنگل ہیں، جس میں سانپ ہیں کہ قدم قدم پر کلبلاتے پھر رہے ہیں۔ کہار ان کی ڈولی لیے جنگل سے گزر رہے ہیں کہ اتنے میں دیکھا سیتا پھل ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔ کہار اور ملازم دوڑ کر اٹھاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو کنڈلی مارے ہوئے سانپ ہیں! اس کے بعد ہم لوگوں کو ہر سیتا پھل ایک لپٹا ہوا سانپ نظر آتا تھا۔

میرے اُن کے درمیان ایک خصوصی ربط تھا۔ کہتی تھیں مجھے مسعود کو دیکھ کر اپنی مری ہوئی بیٹی فطّو (فاطمہ) یاد آجاتی ہے۔ وہ اکثر مجھے اپنی مری ہوئی بیٹی کی نشانی کہتیں۔ اس پر ہم دونوں کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں اور میں خیال کی دنیا میں اپنی ماں کو ڈھونڈھنے لگتا جن کی کوئی نشانی میرے حافظے میں محفوظ نہیں تھی۔ چنانچہ اس جذبہ کے تحت مجھے گھر میں کئی رعایتیں ملی ہوئی تھیں مثلاً دن بھر مٹی کی ہانڈی میں کئی بھینسوں کا دودھ ہلکی آنچ پر اوٹتا رہتا تھا، سہ پہر تک اس پر ملائی کی ایک سرخ روٹی سی بن جاتی۔ ملائی میری کمزوری اس وقت بھی تھی اور آج بھی ہے۔ مجال نہیں تھی کہ ان کی اجازت کے بغیر اس کا ایک ٹکڑا بھی کسی کو دیا جائے۔ وہ اسے بلو کر پہلے مکھن بنائیں اور پھر ارڈ کی دال اور جاڑوں میں کھچڑی کے لیے اصلی گھی نکال لیتی تھیں۔ لیکن جب کبھی یہ ان کی "مری بیٹی کی نشانی" بالائی پر بالادستی کر بیٹھتا تو اسے کچھ نہیں کہتیں۔ "چلو اسے کھا لینے دو"۔ بس یہ منہ سے نکلتا۔

ننھیال میں میرے ہاتھ میں پیسہ بہت کم آتا تھا۔ نانا صاحب بیٹوں اور پوتوں کو تو اپنی داد و دہش کا درخور سمجھتے تھے، لیکن نواسے اور لڑکیاں ان کی مرحمت کے دائرے میں بہت کم آتے۔ مجھے کبھی کچھ ملتا تھا تو انہی سے۔ یہ خاص طور پر اس وقت جب ان کا پیسوں کا صندوقچہ کھلا ہوا اور میں کھڑا تک رہا ہوں۔ ننھیال میں کھانے پینے کی چیزوں میں کوئی امتیاز اور تخصیص نہیں کی جاتی تھی اور چونکہ ان پر اختیار نانی صاحبہ کا ہوتا یا بڑی ممانی صاحبہ کا، مجھے دونوں کی ہمدردی حاصل تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں دودھ، ملائی، گھر کا نکلا ہوا تازہ مکھن، گھی دہی اور عمدہ گوشت خوب کھایا۔ باغات سے موسم کے پھلوں کی جنس، آجاتی، تالابوں سے مچھلیاں اور سنگھاڑے غرضیکہ ایک زمیندار گھرانے کے الّلے تلّلے تھے۔ تعطیلات میں جب

میں دہلی سے گھر آنا تو مہینے دو مہینے کی پُرخوری سے صحت بن جاتی اور چہرے پر سُرخی دوڑ جاتی، اس کے بعد سال کے باقی ۹، ۱۰ مہینے کی کم خوری انھیں زائل کرنے کے لیے کافی تھی، اِس طرح کہ داد و ستم کا حساب برابر ہو جاتا۔

بی، عبادت گزار تھیں۔ ایک چوکی پر ان کی جانماز بچھی رہتی جس پر پنج وقتہ پابندی سے ادا کرتیں لیکن انھوں نے تمام اسلامی شعائر و فرائض کو اپنی سہولت کے مطابق سہل بنا لیا تھا، مثلاً نماز پڑھتے وقت اگر وہ دیکھتیں (اور نماز میں وہ دائیں بائیں دیکھتی ضرور رہتیں) کہ کوئی ملازمہ اُن کی مرضی کے خلاف کام کر رہی ہے تو بلا تکلف نیت توڑ کر اس پر لام کاف شروع کر دیتیں۔ اِس سے فارغ ہونے کے بعد پھر اطمینان سے نیت باندھ لیتیں۔

ناناصاحب نے آخر عمر تک اپنے اوپر اس قسم کی کوئی مذہبی پابندی عائد نہیں کی۔ غالب کی طرح وہ روزہ کو روزی بنا لیتے تھے۔ غالب کو اپنی بیوی سے یہ گلہ رہتا تھا کہ وہ ہر وقت گھر کو فتح پوری کی مسجد بنائے رکھتی ہیں، ناناصاحب کو اپنی بیوی سے "ٹکریں" لگاتے رہنے کی شکایت تھی۔ دونوں رندِ شاہد باز تھے!

اِس ماحول میں میری ابتدائی تربیت ہوئی تھی۔ مذہب کی جانب میرا رویہ اسی لیے "پر طبیعت اِدھر نہیں جاتی" کا رہا۔ اپنے مسلمان ہونے پر فخر رہا لیکن اسلامی شعائر کی پابندی کو غیر ضروری جانا۔ جنسی آزاد خیالی کی بنیاد بھی اسی ماحول میں پڑی جہاں بزرگ اپنی جنسی فتوحات کا تذکرہ بے دریغ کرتے تھے اور ایسے ایسے لفظ اور فقرے فحشیات کے طور پر استعمال کرتے تھے جن سے فیلن اور سید احمد دہلوی جیسے فرہنگ نویس تک شرما جائیں۔ میرا دامن جو فحشیات سے بچا رہا وہ صرف اس لیے کہ میری ددھیال کی روایات میری ننھیال کی روایتوں پر غالب رہیں! جنس کی جانب سے میں خیالات میں آزاد رہا لیکن عملی طور پر جھینپو ہونے کی وجہ سے مَس و مَساس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پیرس کے نگار خانے میں یہ اعتراف نہ کرتا ؂

خیالِ دامنِ اُلفت کہاں، کہاں مسعود
وہ نارسا ہی رہا، اور شرمسار رہا (پیرس)

میری ننہال تین پختہ حویلیوں پر مشتمل تھی۔ زنانہ مکان، جو سب سے قدیم تھا، سنہ ستاون کے ہنگامے میں اُسے گوروں کے ساتھ مل کر گرمیوں نے جلادیا تھا، جس کے جلنے کے نشانات اس کے زینے کی کڑیوں پر اُس وقت تک موجود تھے۔ گھر والے بھاگ کر رشتہ داری میں تلہرا گاؤں میں چلے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی ساری نقدی گھر کے کنوئیں میں ڈال گئے تھے جو واپسی پر انھیں مل گئی۔ گلی کے دوسری طرف نیا مکان تھا، یہاں مردانی نشست رہتی۔ دونوں مکانوں کو ایک پُل کے ذریعے جوڑ دیا گیا تھا۔ زنانے مکان سے متّصل کسی اور کا کچّا گھر تھا اور اس کے بعد پھر لکھوری اینٹ کی بنی ہوئی پختہ کوٹھی، جہاں بوڑھے ابّا حاجی فضل امام خاں کی نشست تھی۔ میں نے بڑھاپے میں انھیں دیکھا تھا، سُرخ و سفید چہرہ، بھک سفید داڑھی، کاندھے پر رومال اور ہاتھ میں ملاکا کین کا موٹا سا بید۔ شام کا کھانا وہ پابندی کے ساتھ زنانے گھر میں آکر مغرب سے پہلے کھاتے تھے۔ ان کے ہم دسترخوان ہونے کا شرف صرف مجھے اور خورشید کو حاصل تھا۔ اور ہماری لاگ صرف اُن کی کھیر تھی جو سیر بھر دودھ میں تھوڑے سے چاول ڈال کر گھنٹوں پکتی رہتی تھی اس طرح کہ بالکل ربڑی بن جاتی تھی۔ وہ کھاتے وقت سٹر سٹر کرتے جاتے تھے جس سے ہمارا جی گھبراتا تھا۔ ہم دونوں بلیوں کی سی کھیر پر تاک لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ کھیر وہ اپنی انگشتِ شہادت سے کھاتے تھے اور حسبِ منشاء استعمال میں لانے کے بعد مٹّی کا طباق ہم دونوں کی جانب بے نیازی کی شان سے بڑھا دیتے تھے۔ ابھی وہ ہاتھ دھونے سے فراغت حاصل نہیں کر پاتے کہ ہم چھینا جھپٹی کر کے باقی ماندہ کھیر چٹ کر جاتے۔ اس قدر سوندھی اور مزیدار کھیر میں نے اپنی عمر میں پھر کبھی نہیں کھائی۔

میرا زیادہ وقت زنانے میں گذرتا، یہاں بہت سی ماموں زاد بہنیں تھیں۔ ہر وقت ایک ہنگامہ سا رہتا۔ اس میں ماماؤں اور ملازماؤں کے بچّے بھی شامل ہو جاتے، جن کی تعداد ہم لوگوں سے بھی زیادہ تھی۔ اَشرا کی ماں (اشرف کی ماں)، ہم سب کے لیے بہت زیادہ اہمیت کی مالک تھی۔ وہ بڑی باکمال باورچن تھی اور نانی صاحبہ کا ترکی بہ ترکی جواب۔ شاید ہی کوئی دن جاتا ہو جب دونوں میں نوک جھونک نہ ہوتی ہو۔ بی کی گالی گفتاری کے باوجود یہ ناممکن تھا کہ وہ بڑے گھر کی ملازمت چھوڑ دے۔ کبھی بیماری کی وجہ سے یا لڑ کر غصّے میں گھر بیٹھ جاتی تو نانی صاحبہ

کو اس دن کھانا اچھا نہیں لگتا۔ کہتی تھیں کہ اشرا کی ماں کے ہاتھ کی بات ہی اور ہے۔ وہ خود بھی کھانا بہت اچھا پکاتی تھیں اور انھیں اچھے کھانے کی پرکھ بھی خوب تھی۔ دونوں کا پکایا ہوا قورمہ اور چپاتی خاصے کی چیز ہوتا۔ اشرا کی ماں نہ صرف کھانا پکانے میں استاد تھی، کھانے میں بھی باکمال تھی۔ وہ اپنی پسند کی بوٹیاں گرم گرم پوپلے منہ میں رکھ لیتی اور جب تک کوئی بچہ چیخ کر کہتا کہ کھا گئی، کھا گئی وہ انھیں نگل لیتی اور پھر منہ کھول کر دکھاتی اور کہتی "دیکھو تو بچے بھی کیا طوفان لگاتے ہیں"۔ گھر جاتی تو اپنے سارے گھر کے لیے کھانا چھپا کرے جاتی

گلی کا ایک سرا ایک گول کھلے میدان میں کھلتا۔ یہیں پر محلّے کی مسجد تھی۔ ایک طرف جہان خانی پٹھانوں کا پھاٹک اور احاطہ تھا اور اس سے ملحق اَلّو خاں کا زنانہ اور بیٹھک تھی۔ اَلّو خاں عمر کے اُس حصّے میں تھے جب انسان نماز اور گالی دینے کے علاوہ اور کوئی دوسرا کام نہیں کرتا۔ ان کی سب سے دلچسپ گالی خود 'پٹھان' سے متعلق ہوتی جسے وہ 'بدذات' کہتے تھے۔ میدان کے عین درمیان میں نیم کا ایک چھتنار درخت تھا، جس کی عمر کے بارے میں مختلف روایتیں تھیں۔ اس کے نیچے کھٹّے پڑے رہتے اور آس پاس درختوں کی کچھ موٹی جڑیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں جو اسٹول کے طور پر کام آتیں۔ اس جگہ کو محلّے والوں نے 'نیم تلّے' کا نام دے رکھا تھا۔ اسی سے نانا جان نے 'نیم تلّے کی دوستی' کا محاورہ تراشا تھا۔ ظاہر ہے صدرِ مجلس جان عالم خاں ہی ہوتے باقی سب چھٹ بھیئے۔ لیکن ان چھٹ بھیئوں کو مساوات کا حق حاصل تھا۔ انھیں محبّت سے قابو میں رکھا جا سکتا تھا کسی دباؤ سے نہیں۔ مجال نہیں کہ جان عالم خاں اپنی دولت یا رسوخ کے باوجود کسی کو تم سے تو کہہ دیں۔

نیم تلّے کی نشست میں پابندی سے موجود ہونے والوں میں ایک گل شیر خاں تھے جو سامنے کے پھاٹک میں رہتے تھے۔ وہ جنّو خاں (جان عالم خاں) کے کارندے رہ چکے تھے لیکن بے تکلفی سے انھیں 'جنوا' کہتے تھے۔ شہباز خاں تھے جو جان عالم خاں کے ہم پیشہ و ہم راز تھے اور باہر کے معرکوں کے گماشتے۔ آخر عمر میں جب جنّو خاں بہت اونچا سننے لگے تھے تو شہباز خاں کو چیخ کر بات کرنا پڑتی تھی۔ لطف جب آتا جب وہ کسی 'نوبہارِ ناز' کو تاک کر آتے اور اس کی اطلاع پنچم سُروں میں یہ کہہ کر دیتے کہ 'بڑے راز کی بات بتا رہا ہوں'، اور یہ راز کی بات

ضرورت کے پیشِ نظر اس قدر بلند آواز سے کہی جاتی کہ ع

ایں راز ہماں راز کہ معلومِ عوام است

مجھے یاد نہیں کہ میری بسم اللہ ہوئی یا نہیں ہوئی یا کب ہوئی؛ البتہ یہ جانتا ہوں کہ چھ سال کی عمر میں مجھے محلّے کے میونسپل اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اسکول میں ایک ہیڈ منشی احمد حسین تھے (جو یک چشم تھے، اس لیے کانے منشی کے نام سے معروف تھے) اور دو چھوٹے منشی تھے جن میں ایک ذات کا کُرمی تھا۔ ٹاٹوں پر پڑھائی ہوتی تھی، صرف منشی صاحبان کرسیوں پر براجمان ہوتے۔ تختیوں پر لکھائی، درسی کتب کی رٹائی اور رجولا ہے کا ایک لڑکا، جس کا کوئی قریبی عزیز کو ئٹہ میں تھا۔ اس کے لائے ہوئے اخروٹوں کا کھانا یاد ہے۔ پڑھائی سے فارغ ہونے کے بعد مدرسے کے پشت پر واقع میدان میں دوڑ لگوائی جاتی تھی۔ پتورے کے اس اسکول میں میں نے کیا سیکھا اور کیا نہیں سیکھا، ذرا بتانا دشوار ہے۔ کانے منشی کو جب لڑکے تنگ کرتے تو مدرسے کے نیم سے ایک تازہ سنٹی توڑ کر ان کی خبر لیتے بلکہ اکثر سنٹی کے ساتھ ٹاٹوں کے درمیان ٹہلتے رہتے۔ اس وقت ہم لوگ کم از کم نصف وقت تک خود کو محفوظ سمجھ کر خوب شرارتیں کیا کرتے تھے۔ جب منشی جی کی کانی آنکھ دوسری جانب ہوتی تو دوسرے رُخ کے طلبہ کو ہری جھنڈی دے دی جاتی تھی، یعنی اب انھیں آزادی ہے۔ اس طرح باری باری سے ہم لوگ لطف اندوز ہوتے تھے۔

چھوٹے مسلمان منشی کے طاقت ور ہونے کا بڑا رعب تھا۔ کہتے تھے کہ وہ وکٹوریہ کے زمانے کا موٹا پیسہ کرسی کی درز میں پھنسا کر انگوٹھے سے موڑ دیتے تھے۔ یہ بھی روایت تھی کہ ان کے قبضے میں جن ہیں۔ ہمارے کُرمی منشی سے اس قسم کی کوئی روایت منسوب نہیں تھی۔ وہ محنت کے ساتھ پہاڑے رٹاتے تھے۔ جب اسکول چھوڑا ہے تو ہمارے علم کی کل کائنات اردو لکھنا پڑھنا اور حساب کی گنتی اور پہاڑے تھے۔ آگے اللہ اور صفر!

دس برس کی عمر تک میرے ارد گرد جو ماحول تھا اور اس کے کردار جب حافظے کے پردے پر اُبھرتے ہیں تو بیٹھا گھنٹوں محظوظ ہوتا ہوں۔ مردانے میں روز کے حاضر باشوں میں نور عالم خاں تھے جنھیں عزیز داری کی بنا پر احتراماً چچا نوری کہا جاتا تھا۔ ان کی مالی حالت خستہ تھی۔

اس لیئے بڑے گھر والوں کی جانب سے حسد کا جذبہ رکھتے تھے۔ باوجود جاہلِ مطلق ہونے کے علم مجلسی میں طاق تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ انھوں نے اپنی دوسری بیوی کو جوئے میں جیتا تھا۔ جب مقابل کا پٹھان جواری مسلسل ہارتا گیا تو اس نے آخر میں اپنی کنواری لڑکی کو داؤں پر لگا دیا۔ زہے قسمت، چچا نوری وہ داؤں بھی جیت گئے۔ جیتنے کے بعد جھٹ بچہ لائے اس پر چادر باندھی اور نئی نویلی کو لے کر گھر چلے۔ بات کے دھنی پٹھان نے اُف تک نہ کی۔ گھر پر پہنچتے ہی کسی ملّا کو پکڑ کر لائے اور کھڑے کھڑے نکاح کیا۔ اس کے بعد وہی اُن کی چہیتی بیگم رہیں اور اُن سے کئی اولادیں ہوئیں۔ چچا نوری غریب تھے لیکن پٹھانوں کی مساوات کی روایت کے مطابق وہ اپنی عزت کرانا جانتے تھے۔ مجال نہیں تھی کہ کوئی ان پر فقرہ بھی کس سکے۔ سب کا نام لیتے اور تخاطب میں برابری کا سلوک رکھتے۔ فخاری اور ہیکڑی ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ مبالغہ آرائی سے بھی کام لیتے تھے۔ اگر کسی کے ساتھ میلے میں جا کر بھینس خریدنے میں (جس کی شناخت کے وہ ماہر تھے) مشورہ دے دیتے تو اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے کہ میں نے فلاں خاں کو بھینس خرید وادی۔

زنانے گھر کے پڑوس میں ڈاکٹر امیروا (محمد امیر خاں) کا پختہ مکان تھا وہ فوج میں گھوڑوں کے ڈاکٹر تھے۔ جنگِ عظیم اوّل کے بعد تخفیف میں آگئے۔ اب ان کی توجہ چوپایوں کے بجائے دوپایوں، کے علاج کی جانب ہوگئی۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد انھوں نے محض دل لگی کی خاطر اپنا مطب قصبے کے بازار میں کھول لیا تھا۔ ان کا زیادہ تر وقت برادری کے پٹھانوں کی مفت خدمت کرتے گزرتا۔ گھر میں کسی کی بھی طبیعت خراب ہو جاتی، سب سے پہلے وہی طلب کئے جاتے۔ ۱۹۳۰ء میں جب میں ڈھاکے سے انٹر میڈیٹ کا امتحان دے کر اعصابی امراض میں گرفتار آیا تو مجھے بھی ان کی 'حذاقت' سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ مجھ پر جب دورے کی سی کیفیت ہوتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے اور میں موت کے قریب آ کھڑا ہوا ہوں۔ یہ منظر میری نانی اور دیگر تمام عزیزوں کے لیئے بہت تکلیف دہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر امیروا ایک دو ملاقاتوں میں میری بیماری کو بھانپ گئے۔ کچھ انھیں اس بات سے بھی کوفت تھی کہ وہ وقت نا وقت بلائے جاتے تھے۔ ایک بار جب میں نے اس قسم کی تکلیف کی شکایت

کی اور چیخا چلایا اور ڈاکٹر امیر دا کو فوری طور پر طلب کیا گیا تو انھوں نے آتے ہی کہا "مجھے دیا سلائی لا کر دو میں آج مسعودا کے پاجامے میں آگ لگا دوں گا"۔ دیا سلائی آگئی اور جب وہ واقعتاً اسے جلا کر میری جانب بڑھے تو میں نے خیال کیا کہ یہ پاگل ڈاکٹر آج مجھے نہیں چھوڑے گا۔ چنانچہ یا تو میں حد درجہ کمزوری کا اظہار کر رہا تھا یا مجھ میں اس قدر توانائی آگئی کہ چارپائی سے تڑپ کر سیدھا دروازے کی جانب بھاگا۔ ڈاکٹر امیر دا کو اس کے بعد یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ "اسے مراق ہو گیا ہے، یہ بیمار و بیار کچھ نہیں ہے، بس جب دورہ پڑے اس کے ساتھ یہی حرکت کرو۔ اس کے بعد کبھی میری طبیعت غیر بھی ہوتی تو میں کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کرتا لیکن ڈاکٹر امیر دا کے بارے میں عرصہ تک میری رائے خراب رہی۔

میری اس رائے کی تصدیق اُن کے بعض طبی کارناموں سے بھی ہوتی ہے جو اُن سے سرزد ہوئے۔ محلّے کے قمر دا خاں کی داڑھ میں سخت درد اٹھا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے وہ گھر میں جا کر اندر سے ایک زنگ خوردہ زنبور لائے۔ کہا منہ کھولو اور درد والی ڈاڑھ کے قریب کی اچھی داڑھ زنبور سے پکڑ لی۔ اب قمر دا خاں لاکھ چیخیں چلّائیں، دو جھٹکوں میں اچھی ڈاڑھ زنبور سے مروڑ کر کھینچ لی۔ جب قمر دا خاں نے واویلا مچایا تو کہنے لگے اب دوسری داڑھ خود بخود اچھی ہو جائے گی۔ بازار کے مطب میں جہاں وہ کبھی کبھی جاتے تھے ایک لڑکا دوا کی خشک شیشیوں میں پانی ڈال کر انھیں ہلاتا اور مکسچر تیار کر دیتا۔ ان کے علاج سے جو بھی اچھا ہو جائے اسے خدائی شافی کا معجزہ سمجھنا چاہیئے تھا۔

ان کے بھائی نواب میر خاں کو میں زیادہ پسند کرتا تھا۔ وہ قائم گنج کے شاید پہلے میٹرک تھے اور اُن کی انگریزی کی استعداد بہت اچھّی تھی۔ ساتھ ساتھ ذوقِ سخن بھی رکھتے تھے اور استادانہ انداز کے گرم گرم عشقیہ شعر نکالتے تھے۔ میری اور اُن کی عمر میں بڑا تفاوت تھا لیکن عمر کا یہ فاصلہ ہمارے مشترک ادبی ذوق نے ختم کر دیا تھا۔ وہ اکثر مجھے اپنے اشعار سناتے اور داد کے طالب ہوتے۔ بہت بعد کو میں نے ان کی شاعری پر ایک مضمون "ہماری زبان" میں لکھا تھا۔ عقیدے کے اعتبار سے وہ مائل بہ الحاد تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ دہریے تھے۔ میرے خیال میں بنیادی طور پر وہ آزاد خیال تھے۔ یعنی "سر گشتۂ خمارِ رسوم و قیود" نہیں تھے۔ نانی صاحبہ سے ان کی بھی

نوک جھونک رہتی۔ کبھی ہمارے یہاں شام کو لڑکیاں مل کر مولود شریف پڑھتیں تو دوسرے دن صبح نمودار ہوتے۔ نانی صاحبہ کو پڑوس کے رشتے سے بھاوج کہتے تھے۔ آواز دیتے کہ ذرا دوپٹے کی اوٹ کر لو تو میں آجاؤں۔ آکر پاس کے پلنگ پر بیٹھ جاتے اور نہایت سوکھے منہ سے پوچھتے۔ "بھاوج! رات کو کیا ہنگامہ تھا، یہ کون گا رہا تھا۔

ہاتھوں میں چھیک چھلّے کانوں میں بالیاں

ہم کو غریب جان کے دیتے ہیں گالیاں

یہ سن کر نانی صاحبہ سر پیٹتیں اور کہتیں "دیکھو تو بڈھے کو کیا ہو گیا ہے؟" اور نواب میر خاں ہنستے ہوئے دروازے کے باہر لپک جاتے۔ محلّے کی مسجد میں جب کبھی لوٹا چوری ہوتا (اور یہ اکثر ہوا کرتا تھا) تو لوگ کہتے ہو نہ ہو یہ چوری نواب میر خاں نے کروائی ہے۔ وہ اس کی کبھی تردید بھی نہیں کرتے۔ حالانکہ اس فعل سے ان کا دور دور واسطہ نہیں ہوتا۔ ع بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا

دونوں بھائیوں کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ قدرے مشترک تھی تو صرف یہ کہ دونوں نے اپنی پسند کی لونڈیوں سے نکاح کر لیا تھا۔ قائم گنج کے پٹھانوں کیلئے سانولی سلونی لونڈیوں، مہترانیوں اور دھوبنوں میں گوری چٹی پٹھانیوں سے زیادہ جنسی کشش ہوتی تھی۔ اسی کشش کے نتیجے کے طور پر اکثر گھرانوں میں خانہ زادوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جنھیں قائم گنج والے "خناوار" کے نام سے پکارتے تھے۔

جنسی آزادی کی اس فضا میں اِکّا دُکّا ایسی شخصیتیں بھی موجود تھیں جنھیں خیرِ مجسّم کہا جا سکتا تھا۔ انھیں میں ایک حافظ عطا میاں تھے، جن کا پیشہ مدرّسی تھا اور محلّے کی مسجد میں امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ اس کے علاوہ بچوّں اور بچیوں کو مکان پر آکر قرآن کا درس دیتے۔ ہمارے گھر کے سب بچوں اور بچیوّں نے ان ہی سے درسِ قرآن لیا ہے اور سب کے سب اس فرشتہ صفت انسان کی نیکی کے معترف رہے ہیں۔ مجھ پر بچپن میں ان کی شخصیت کا جادو اس قدر چل گیا تھا کہ ہر چند میں اُن کے نجی مدرسے کا طالب علم نہیں تھا لیکن اکثر وہاں پہنچ جاتا۔ مدّھم لہجے اور مدّھم چال کا یہ فرشتہ لنگی باندھے لمبا کرتا

زیب تن کئے اور ہاتھ میں چھوٹا سا ڈنڈا لیئے جب ہماری گلی سے گزرتا تھا تو خیال ہوتا تھا کہ پٹھانوں کی اِس بستی کا انسان نہیں ہے۔ عطا میاں کوئی عالم نہیں تھے لیکن ان کے ساتھ ساتھ نیکی کا ایک ہالہ سا چلتا تھا۔ یہ میرا ہی نہیں گھر کے دوسرے بچّے اور بچیوں کا بھی خیال تھا۔

محلّے کے ایک ٹھیٹھ پٹھان سون خاں بھی تھے۔ وہ "نیم تلّے" کے سامنے کے پھاٹک کے احاطے میں رہتے تھے۔ عمر ساٹھ کے پیٹے میں تھی لیکن دانت گر جانے کی وجہ سے منھ پوپلا بہت پہلے ہو گیا تھا۔ ہر وقت اضطراری کیفیت میں رہتے اور اس قسم کی حرکتیں بھی کرتے تھے۔ وہ ہمارے مردانہ مکان کی روزانہ نشست کے مستقل حاضرین میں تھے۔ انھیں غصہ دلانا بہت آسان تھا۔ ذرا سی بات میں بھڑک اُٹھتے۔ اس وقت ان کی ٹھڈّی کپکپانے لگتی۔ بعض اوقات ہم لوگ صرف یہ دلچسپ منظر دیکھنے کے لئے ان کو غُصّہ دلایا کرتے تھے۔ غصّہ کی انتہائی کیفیت میں وہ ایک دم مونڈھے سے اُٹھ کھڑے ہوتے اور اپنا چمڑودا جوتا اتار کر اپنے سر پر تڑ تڑ مارتے اور کہتے جاتے "اب اگر سونا تمھارے یہاں آئے تو اس میں کھِلانا جس میں کتا کھاتا ہے"۔ اس کے بعد یہ جا وہ جا۔ چند روز تک اُن کی غیر حاضری رہتی۔ اس کے بعد پھر اس طرح چلے آتے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا! ہم لوگوں میں آپس میں اشارے ہوتے کہ سون چچا کی چاند کو اب کچھ دنوں تک آرام کر لینے دو۔ تھوڑے دنوں کے وقفے کے بعد یہ عمل پھر شروع ہو جاتا۔

اسی طرح عزیز چچا (عزیز خاں) تھے۔ جو بڑھاپے میں پنجر بن گئے تھے لیکن باتیں وہی ہیکڑی کی جب آتش جوان تھا۔ انھیں بڑھاپے یا کمزوری کے الزام کی برداشت نہیں تھی۔ فوراً ہاتھ زمین پر رکھ کر ڈنڈ لگانے کی پوزیشن لے لیتے حالاں کہ ایک دو ڈنڈوں کے بعد ہی زمین پر چٹ دھڑ سے جاتے۔ قائم گنج کی زبان میں آن بان کے لیے ایک لفظ ہے "مڑک" اور دوسرا "ٹھٹولی" ہے۔ یہ سب اسی کے کرشمے تھے۔

چوں کہ بڑے ماموں، سلطان عالم خاں ابتدا سے ایک سیاسی شخصیت کے مالک تھے اس لیئے اُن سے ملنے کے لیئے ہمارے مردانے میں بھانت بھانت کے لوگوں کا صبح سے شام تک تانتا بندھا رہتا حقّہ اور پان سے تواضع ہوتی تھی اور ایک ملازم، اجوا (آرزو حسین) مسلسل زنانے اور مردانے مکانوں کے درمیان دوڑتا رہتا۔ اجوا مردانے مکان کی ٹیک تھا اُس سے زیادہ وفادار ملازم کا تجربہ مجھے اپنی زندگی میں نہیں ہوا۔ جس گھر میں۔۔ عمری

میں داخل ہوا اسی سے مر کر نکلا۔ وہ میرے دونوں بڑے ماموؤں کی صبح سے شام تک ہر قسم کی خدمت کرتا، گھر کے بچّے اس سے مانوس تھے۔ گھر میں اس کی حیثیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ جب میری شادی کا مسئلہ چھڑا اور گھر ہی کی ایک 'بنتِ عم' سے ہونا قرار پائی تو اسے باقاعدہ شکل دینے کے لیے احواہی کو استعمال کیا گیا۔ اسی نے آکر میرے سامنے یہ تجویز رکھی کہ میں اپنے بڑے بھائی اور بہن کو حیدرآباد لکھوں کہ وہ میری نسبت کے لیے باقاعدہ سلسلہ جنبانی کریں۔

محلّے کے بچّوں (اور بعد کو نوجوانوں) میں ایک اور شخصیت جس کا میری زندگی میں بڑا عمل دخل رہا ہے، حکیم سرور عالم خاں کی ذات ہے۔ وہ میرے بچپن کے ساتھی ہیں اس وقت سے جب وہ عرفِ عام کے 'حکیم جی' ابھی تک نہیں بنے تھے۔ انھوں نے طبابت کی سند بہت بعد کو طبیہ کالج دہلی سے لی تھی۔ میں اُن کی طبابت کا تو کبھی قائل نہیں رہا لیکن بحیثیت مخلص دوست اور اچھے انسان کے ہمیشہ قدر کی۔ ان کی وضع داری کا یہ عالم ہے کہ وہ اوّل تا آخر ایک ہی انداز میں تعلقات نباہتے رہے ہیں۔ دائمی نزلہ کے مریض ہونے کی وجہ سے اپنے سر اور کانوں کو ایک بڑے سے مفلر سے ہمیشہ لپیٹے رہتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے معاً غزل کے کسی شاعر کا وہ خیال یاد آجاتا ہے کہ جب 'مسیحا' خود بیمار ہو تو مریض کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔

درونِ خانہ میرے ہر وقت کے ساتھیوں میں میرے چھوٹے ماموں خورشید عالم خاں تھے۔ ہم دونوں کی عمروں میں صرف سوا سال کا فرق تھا۔ میں ان سے چھوٹا تھا۔ لیکن عمر یا رشتے کی بزرگی سے ہماری یاری میں فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہر قسم کے کھیل کود میں میرا ان کا ہمہ وقت کا ساتھ تھا۔ وہ چاہے کنّوں کا شکار ہو، گلّی ڈنڈا ہو یا آموں پر زور آزمائی۔ ہمارا محبوب مشغلہ 'تعمیر' تھا یعنی اینٹوں یا مٹی سے گھروندے بنانا۔ یہ کام اکثر گرمیوں کی طویل دوپہروں میں ہوتا، جب گھر کے سارے بڑے خرّاٹوں کے ساتھ فرشی پنکھوں کے نیچے سوتے تھے اور ہم باوجود نانا صاحب کی تنبیہ اور ہدایت کے تھوڑی دیر لیٹ کر دبے پاؤں باہر نکل جاتے۔ گھروندے سازی کے اس کھیل میں مجھے خورشید سے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ وہ خود راج کا رول ادا کرنے لگتے اور مجھے مزدور کا کام کرنے کے لیے کہتے۔ اینٹیں لاؤ، گارا بناؤ، چھت کے لیے پٹاؤ تیار کرو۔ میری انا کو اس سے

ٹھیس لگتی، میں بغاوت کر بیٹھتا اور پھر اس کے بعد سارا کھیل بگڑ جاتا۔

پنورے کے مدرسے سے نکل کر میں تو جامعہ ملیہ چلا گیا اور خورشید فرخ آباد کے مشن اسکول۔ اس کے بعد ملاقات صرف تعطیلات میں ہوتی۔ خرگوش کے شکار کا سلسلہ جاری رہا لیکن اب توجہ زیادہ تر ڈنڈ مگدر، دودھ کی 'پلائی' اور آموں کی 'کھلائی' کی جانب ہو گئی تھی۔

قائم گنج کی یادوں میں میرے لیے سب سے دلچسپ وہاں کی مخصوص زبان تھی۔ قائم گنج کا قصبہ قنّوجی بولی کے علاقے میں آباد ہے جو برج بھاشا سے بہت ملتی جلتی ہے۔ وہاں پونے تین سو برس پہلے پٹھان خاندان درۂ خیبر سے پشتو بولتے ہوئے آئے تھے۔ دو تین پیڑھیوں تک پشتو کے اثرات نمایاں رہے خاص کر عورتوں کی بولی میں۔ میرے زمانے تک آتے آتے پشتو کے صرف چند لفظ رہ گئے تھے وہ بھی نسوانی محاورے میں مثلاً مَندِگر (عصر) مُشختن (عشا)، پیغلا (کنواری لڑکی)، تربُور (دشمن، لغوی معنی چچا زاد بھائی جو خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے ہمیشہ دشمن ہوتا تھا)۔ پِشے (بلّی) تَنبے (کواڑ) واپے زان (پیچھے ہٹو)۔ خوارا (خواہر)۔ غزغڑے کا وقت (مشکل کا وقت) شر سینو بیٹی (جس کے سب مر گئے ہوں) حریان پیٹی (بدتمیز)

مفرد الفاظ اور محاورات کے علاوہ پشتو کے کچھ گیت بھی تھے جو ڈومنیاں (افغانی نسل کی)، بچّے کی پیدائش یا شادی کی رسموں کے وقت بغیر معنی سمجھے گاتی تھیں۔ بچّے کی پیدائش کے گیت کو 'رامے خوری' کہتے تھے جو اس کی ابتدا میں آتا ہے۔ اسی طرح سہرے کے گیت تھے بچّوں کی لوریاں تھیں حتیٰ کہ خاندان کی بڑی بوڑھیاں نماز کی نیت تک پشتو میں کرتی تھیں۔

پشتو کے ان اثرات سے قطع نظر جو نسلاً بعد نسلٍ کم ہوتے گئے، قائم گنج کے پٹھان گھرانوں میں کھڑی بولی اردو بولی جاتی تھی جس میں قدیم اردو کے متروک الفاظ اور تراکیب کثرت سے ملتی تھیں مثلاً کدھو، کدھیں (کبھی) لئوں (تک)، اِتّا، اَتّا، جِتّا، اِن نے، اُن نے کن نے، محاورے بھی بہت دلچسپ تھے جو اور کہیں سننے میں نہیں آتے جیسے:

لار بار ہونا = خوشامد کرنا

پینکبڑے باڑی = پاگل ہونا

کونیوں سے نکل جانا = بالکل ختم ہو جانا (دوستی وغیرہ)

اَبّے تبّے = الٹے تلّے

پنپیر پڑنا = صلح صفائی کرانا

کُلف پڑنا = لڑائی ہونا (قفل)

اُدرے پُورے کرنا = خوشی کو ختم کر دینا

منّوے پڑنا = منانا

لگّے مگّے = یار دوست

نخ نخ کرنا = گلا سوکھنا (پیاس سے)

تخ پخ کرنا = ڈر سے ہگ دینا

گونا گر جانا = زور ختم ہونا

بلکیّاں کھانا = بل کھانا

پٹھانوں کی زبان گالیوں اور کوسنوں سے بھری ہوتی۔ گالیوں کی تو فہرست کیا دوں اُن سے ان کی ”جنسیت“ کے علاوہ کچھ اور ظاہر نہیں ہوتا۔ البتہ کوسنے جو میں نے نانی صاحبہ کی زبان سے سنے ہیں وہ دلچسپ ہیں۔

تجھے سہار کا دیو/ کالا دیو مارے (سہار = سحر)

تو کالی آندھی پر اُڑے = برباد ہوئے

تو پیلے تکوؤں سے نکلے = اچانک مر جائے

پچھپاتی کھٹیا نکلے = اچانک مر جائے

رنس کی ایڑھیاں رگڑے = لمبی بیماری سے مرے

کڑ کڑاتی بجلی گرے = اچانک موت ہوئے

دانہ دانہ کرنا = برباد کرنا

تنت منت ہونا = برباد ہونا

ننّدو خاں کے ڈھیلے کھائے = مرادمرجائے (ننّدو خاں قائم گنج کا پُرانا قبرستان ہے جہاں ہمارے مورثِ اعلیٰ حسین خاں دفن ہیں)

دلچسپ بات ہے کہ قائم گنج کے پٹھانوں کی آبادی قنوجی کے بحرِ ذخّار میں ٹاپوں کی طرح تھی۔ یہاں کے پٹھان اپنے علاقے کی بولی بہ خوبی سمجھتے تھے لیکن شان یہ تھی کہ بولتے تھے اپنی کھڑی (اردو) میں نے بچپن میں اکثر یہ سین دیکھا کہ اسامی نانا جان کے پاس آئے ہوئے ہیں۔ وہ مونڈھے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسامی زمین پر اکڑوں بیٹھے سرکار، ہجور کر رہے ہیں۔ وہ اپنی بات قنوّجی میں کر رہے ہیں اور نانا جان اس کا جواب کھڑی میں دے رہے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی بات مکمل طور پر سمجھ رہے ہیں۔ لیکن ایک پارٹی بہ مجبوری اور دوسری بہ فخر بے جا کے طور پر ابلاغ کے زینے پر چڑھنے یا اُترنے سے انکار کرتی ہے۔ کھاں صاحب، خاں صاحب رہتے ہیں اور گنوّار گنوّار!

پٹھانوں کی اس اردو میں بہت سی لسانی خصوصیات ایسی تھیں جن کی معیاری اردو متحمل نہیں ہو سکتی۔ قنوّجی کی صرفی و نحوی شکلیں بھی درآئی تھیں جن کا خاں صاحب کو احساس تک نہیں تھا لیکن ہماری نسل جو جامعہ ملیہ اور علی گڑھ کی تعلیم یافتہ تھی متبسّم ہو جاتی تھی مثلاً ہیئن (یہاں) ہوّن (وہاں)، اُتے خن (اسی وقت۔ خن = کھن = لمحہ) منوں آدمی (بہت سے آدمی)۔ چکّو (چاقو)، کرآن (قرآن)، کلُف (قفل)۔ وہ جاتا ہیگا۔ (جا رہا ہے)، ہوئے گا (ہوگا)۔ بعدی (بعد)، متی (مت) ہلا (ہاں) وغیرہ۔ قائم گنج کے پٹھانوں کی زبان کی ایک جھلک ذیل کے مکالموں میں مل جائے گی۔

دو پٹھانوں کے درمیان مکالمہ

مِدّو خاں (مدبّر الدین خاں)

مُدّو خاں (عبدالحمید خاں) ہوت! ارے تم کاں جارئے اُو

کہاں جا رہے ہو

دال بچو۔ میں بی آبا۔

ٹھہرو بھی

مُدّو خاں (عبدالحمید خاں)

ہَلا، ارے ادّا تو ہمیاں؟ کلاں خیلوں سے کب آیا؟ ارے آمیرے سنگ، ایک

ہاں بھائی یہاں (محلہ کا نام) ساتھ

ضروری کام ہے۔

مِدّو خاں:

ارے مَیں کل سے تیرے مارے ہینگو ہینگو پھر رَیا ہوں بَرے تو ملتا ای نیئں۔ ملوم

وجہ سے ڈانواں ڈول رہا لیکن ہی نہیں معلوم

بھی ہے کُکی خیلوں میں متّو خاں اور بنی عالم خاں میں لٹھ پونگا چل گیا۔ ارے مُدوا! دونوں بڑے

(محلہ کا نام)

بِسنگ اور بہت چھٹ ہیں، پٹھنولی پر آجاتے ہیں تو نہ کنواں دیکھتے ہیں نہ کھائی۔ کل جو اُن میں

بِسنگھ 'پٹھانیت'

لٹھ پونگا ہوا تو میں بھی ہُوایئں کھڑا تھا۔ اللہ کی سوں بال بال بچ گیا نیئں تو ہُواں ہی ڈھیر

وہاں ہی قسم نہیں وہیں

ہوتا۔ یہ پٹھان بھی بڑے مُڑک کے لوگ ہوتے ہیں۔ جان چلی جائے مونچھ نیچی نہ ہونے پائے۔

آن بان

اِسی کو 'پٹھنولی' کہتے ہیں۔

زنانی بولی میں محاورے کا رنگ اور چوکھا ہو جاتا ہے۔

دو پٹھانیوں کا مکالمہ

حمیدن: اری خوارا تینے کھول نا، کِتّے خن کھڑی بھئی ہوں۔ کوئی ہیَن سُنتا ای نیئں۔

خواہر ابہن کواڑ کتنی دیر ہوئی یہاں ہی نہیں

مُنّا: اری آرئی ادن بولو! کیو سب خیر سلّا ہے۔

رہی ہوں (دہن) کہو خیریت

حمیدن: اری کائے کی خیر سلّا۔ مَڑد کا زن کدن چل رَیا ہے۔

مرد جھمیلا

کوئی ڈانکٹر مرض کو سمجھ ای نئیں پاتا۔ میں کیتی اوں یہ اوپر کی ہوا ہے۔ وہ

ہی نہیں کہتی ہوں

بڈھا اڑیاں رگڑے گا برّے میری سُنے گا نئیں۔

لیکن نہیں

مُنّا: اری یہ متی کہو۔ یہ گھرا گھر پٹیا ہے۔ جرواں تو کسی گنتی شمار میں کا ہے کو

مت کہو عورتیں

ہونے لگیں میں نے کیا تھا لڑکی کو سُسرال متی بھیجو برّے اُس کے بھائیں

کہا مت لیکن اثر

نہیں ہوئی۔ اب ہواں پھاتے کرے۔ یا چندو پیٹے کوئی خبر کا لیوّیا نئیں ہے۔

وہاں فاقے سر لینے والا نہیں

حمیدن: اری خوار اتو اُسے بُلائے گی کیسے۔ وہ تو دوسرے جی سے ہے۔ کیا اُس کی

بہن حاملہ

سُسرال کے ٹول ٹبّر کو بھی کھلائے گی۔ اچھا یہ بتا کل نئے ادّا کے وَزر کو چلے گی۔

خاندان تعزیت

اب میں چلتی ہوں۔ وہ، آگیا ہوگا، نِدگر کی نماز پڑھنا ہے۔

شوہر عصر

مردوں کی زبان ہو کہ عورتوں کی جنسی اشاروں اور حوالوں سے بھری ہوتی تھی۔
جامعہ ملیہ کے ثقہ ماحول میں رہنے کے بعد ان کی جانب عجیب وغریب قسم کا ردِّ عمل ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں منجھلی مُمانی (قدوس عالم خاں کی اہلیہ اور میری ساس) جن کا تعلق علی گڑھ کے شیروانی خاندان سے تھا، اِس عجیب وغریب آزاد محاورے، کو سُن سن کر شرم سے زمین میں گڑ جاتی تھیں۔ وہ شیروانی خاندان کی روایت کے مطابق ہم سب کے ناموں کے آگے 'میاں' لگا دیتی تھیں۔ مسعود میاں، خورشید میاں لیکن جب دوسرے دالان سے مسودا، خورشیدا کا نعرہ بلند ہوتا تو بھونچکی رہ جاتیں۔ ہماری ددھیال کا تعلق چوں کہ حیدرآباد

دکن سے رہا تھا اس لئے ہمارے خاندان میں 'میاں' کا لفظ احتراماً یا شفقت کے طور پر بڑے چھوٹے دونوں کے لیئے استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً میں اپنے چچا کو یوسف میاں کہتا اور وہ مجھے مسعود میاں کہتے۔

اس ماحول سے گھبرا کر منجھلی ممانی صاحبہ نے اپنی مستقل رہائش بالائی منزل پر کرلی تھی' اسی لیئے نانی جان طنزاً انھیں 'چھینکے کی ہنڈیا' کہا کرتی تھیں۔ کہتیں " اری اس حریان (حیران) بیٹی سے کہو (کہو) کہ کبھو نیچو (نیچے) بھی آجایا کرے"۔

قائم گنج کے پٹھانوں کے عموماً دو نام ہوتے تھے' ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا۔ بعض اوقات دونوں میں صوتی تعلق نظر آتا جیسے جنوّ خاں (جان عالم خاں) اجوّ (آرزو حسن)' مدّو خاں (مدیرالدین خاں)۔

اور بعض اوقات دونوں میں کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا اور دوسرا نام عموماً غیر اسلامی دیسی ہوتا تھا مثلاً بدّا خاں (عبدالستار خاں)' حَو خاں (عبدالغفار خاں)' کنجو خاں (چراغ الدین خاں)' بُدھن خاں' چِنّا خاں' مُنّا خاں' نتھّو خاں' نَھنیا خاں' مَدھن خاں' مُنن خاں' مُنّو خاں۔ یہاں تک کہ بعض انگریزوں تک کے نام فوجی ملازمت کے توسط سے قائم گنج پہنچ گئے تھے' جیسے لٹور خاں جو اصل میں 'لینٹور' تھا۔

پٹھانوں کا عمومی لہجہ کھڑا ہوتا لیکن اکھڑ نہیں جیسا کہ میرٹھ اور اطراف کے اضلاع کی کھڑی بولی میں پایا جاتا ہے۔ کوئی پٹھان 'پڑی' بولی' نہیں بولتا لیکن برج بھاشا کے کچھ اثرات اس کے لہجہ میں پائے جاتے ہیں جو دوآبہ کے کھڑے لہجہ سے اسے ممیز کرتے ہیں۔ پٹھان بچے کو اردو کے معیاری لہجے یا محاورے پر قدرت حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی اس لیئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اردو کے نقطۂ نظر سے اہلِ زبان ہوتا ہے۔

پٹھانوں کی زبان کے زیرِ اثر ہندوؤں کی بعض ذاتیں اور طبقات بھی کھڑی کا استعمال کرنے لگے تھے جیسے کائستھ اور بازار کے بنیئے۔ چھوٹی عدالتوں میں ابھی تک اس کا چلن تھا اور قصبے کے 'تحصیلی اسکول' میں اردو ہی کا رواج زیادہ تھا۔ مسلمان بچوں کی دینی پڑھائی زیادہ تر مساجد سے ملحق مکتبوں میں ہوتی یا بعض متموّل گھرانوں میں مولوی اور منشی گھر پر آکر پڑھا

جاتے تھے۔

یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ قائم گنج کے پٹھانوں کا لباس دھوتی تھا۔ جان عالم خاں آخر وقت تک اسے استعمال کرتے رہے۔ حالاں کہ تحقیراً وہ گنوار اور بزدل کے لیے "دھتیال" کی ترکیب بھی استعمال کرتے رہے۔ جب قائم گنج سے باہر جاتے تو لمبا کوٹ اور علی گڑھ کٹ پاجامہ ضرور نکل آتا۔ خود میں نے بچپن میں دھوتی باندھی ہے۔ دھوتی "سنگی" (بہادری) کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ نوجوان پٹھان لونڈے جو کسرت اور دودھ کے شوقین تھے اپنی پنڈلیوں کے بالوں کو اُسترے سے مونڈتے تھے جس سے ان کی پہلوانی کا شوق نمایاں ہوتا تھا۔ جیب میں قائم گنج کا بنا ہوا خنجر نما چھوٹا یا بڑا چاقو رکھتے تھے۔ یہ قائم گنج کی خاص صنعت شمار کیا جاتا تھا۔ میں نے بھی اِس قسم کے چاقو کو برسوں اپنے ساتھ رکھا ہے۔ اس کے پاس ہونے سے ایک نفسیاتی مضبوطی کا احساس ہوتا تھا۔ یہ اور بات ہے جب کہ قائم گنج کے لونڈے اس کی بار بار آزمائش کرتے رہتے تھے مجھے اس کے کھولنے تک کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ قائم گنج کی زبان میں اسے "چکو" کہتے تھے اور سب سے چھوٹے چاقو کو "چکیا"۔ لکھنؤ کا چوڑی دار تو قائم گنج کو نہ زیر کر سکا لیکن علی گڑھ کے تنگ مُہری کے پاجامے کا رفتہ رفتہ میرے بچپن میں رواج بڑھتا گیا۔ سر پر عموماً صافہ باندھا جاتا تھا لیکن نئی نسل کسی قسم کی ٹوپی بھی پہننے لگی تھی۔ شیروانی کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ اس کا رواج تو ان خاندانوں کے ذریعے رفتہ رفتہ پھیلا جن کا تعلق علی گڑھ یا حیدر آباد سے ہو گیا تھا جب گھر سے باہر نکلتے تو ہاتھ میں لاٹھی یا مرزا پور کا ڈنڈا ضرور ہوتا۔ بیت یا چھڑی بھی تعلیم یافتہ نسل قائم گنج میں لائی ہے۔ البتہ بندوق رکھنے اور شکار کھیلنے کا شوق عام تھا۔ ہمارے پردادا شیر کا شکار کھیلنے ہمالیہ کی ترائی تک جاتے۔ ہم لوگ شکاری کتوں کو لے کر آس پاس کے کھیتوں اور باغات میں نکل جاتے جہاں خرگوش کے شکار میں بڑا مزہ آتا۔ شکاری کتوں کو "لگے لگے" کہہ کر للکارنا اور پھر شکار کے پیچھے دوڑنا، ہم جوئی کا سا لطف آجاتا تھا۔ ہمارے گھر میں ماموؤں کے پاس ہر قسم کے آتشیں اسلحہ تھے لیکن احتیاط تھی کہ بچے اس کو ہاتھ نہ لگائیں۔ چنانچہ میں نے بندوق سے پہلا فیر ۱۹۰۰ء میں کیا۔ وہ بھی لائسنس کی تجدید کراتے وقت، حالاں کہ میرے پاس بندوق پچھلے اٹھارہ برس سے موجود ہے، اور میری بیوی اس بندوق سے کئی بار فیر کر چکی ہیں۔

جب وہ اس سلسلے میں میرے اوپر ہنستیں تو میرا بندھا ٹکا جواب یہ ہوتا کہ میں نے بندوق کا لائسنس چوروں کی وجہ سے لیا ہے۔ جب کسی چور سے سابقہ پڑے گا تو اس وقت فیر کردوں گا۔ پندرہ برس تک میرے لائسنس کی تجدید سفارشوں کے ذریعے بغیر ذاتی حاضری کے ہوتی رہی۔ پچھلے سال اچانک حکم ملا کہ تھانے میں ذاتی حاضری دینا ضروری ہے اور سب انسپکٹر کے سامنے دو فیر داغنا ہوں گے۔ بندوق لے کر دو دپور تھانے میں اپنے ایک عزیز کے ساتھ حاضر ہوا۔ میرے عزیز کو تشویش تھی کہ جب آج تک بندوق نہیں چلائی ہے تو یہ امتحان کیسے دے سکوں گا۔ خیر انسپکٹر صاحب نے تھانے کے احاطے میں کھڑے نیم کے درخت پر لٹکے ہوئے سیاہ کپڑے پر مجھ سے فیر کرنے کو کہا۔ میں نے نہایت اطمینان سے کارتوس نال میں ڈالا، گھوڑا چڑھایا اور دن سے سیاہ کپڑے پر مار دیا۔ جس اطمینان اور صفائی کے ساتھ میں نے یہ پہلا فیر کیا اس پر مجھے اور داروغہ جی دونوں کو تعجب ہوا۔ کہنے لگے "شری مان جی، آپ تو بہت اچھے بندوقچی معلوم ہوتے ہیں اب دوسرے فیر کی ضرورت نہیں"۔ میں نے اپنے جی میں کہا ع سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

اب میں اپنے دوسرے فیر کے لیے یا تو کسی چور اچکے یا تین سال کے بعد تجدید لائسنس کا انتظار کر رہا ہوں!

خرگوش کے شکار کے لیئے علاوہ میں نے پتنگ بازی کا بھی ناکام شوق کیا ہے۔ یعنی میری پتنگ کبھی دس فٹ سے اوپر نہ جاسکی جس پر مجھے بہت غصہ آتا اور اسے پھاڑ کر پھینک دیتا۔ گلی ڈنڈا بھی کھیلا معمولی کامیابی کے ساتھ۔ گولیاں اور تاش بھی کھیلے، اس طرح کہ ہمیشہ ہارا۔ شطرنج سے بھی شوق کیا لیکن ہمیشہ مات کھائی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں کسی کھیل میں کامیابی حاصل نہیں کر سکوں گا اور نہ کی۔ بچپن سے کانوں میں یہ تک بندی پڑی ہوئی تھی ؎

پڑھو گے لکھو گے تو ہو گے نواب
جو کھیلو گے کودو گے ہو گے خراب

حواس خمسہ میں میری قوتِ شامّہ اور سامعہ بچپن سے نمایاں رہی ہیں چنانچہ جب بھی بچپن کی یادیں ذہن میں آتی ہیں تو دماغ معطر ہو جاتا ہے۔ نیم اور مٹھے کے پھولوں

کی مہک سے اور آم کے بور کی بھینی بھینی خوشبو سے۔ ہمارے مکانات میں نیم یا مولسری کے درخت کا ہونا لازمی تھا۔ اس کے ساتھ پاس کے باغات کے تُرشاوے کے پھولوں اور آم کے بور کی لپٹیں آتیں۔ صبح کے وقت ان میں گہری سانسیں لینا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ گھروں کے اندر بیلے، چمیلی اور جوہی کے درخت ہوتے۔ نواڑی سب سے پہلے پھولتی اس کے بعد بیلا اور پھر چمیلی۔ شوقین نوجوان اُن کے گجرے بنا کر پہنتے۔ عورتیں بالوں میں گوندھتیں۔ میں رات کو انھیں سرہانے رکھتا۔ پھولوں کی قدرتی مہک میری آج بھی کمزوری ہے، جس کو میں ہر قسم کے عطر پر ترجیح دیتا ہوں۔

قوتِ شامّہ کی طرح میرا سامعہ کا حس بھی بچپن سے تیز رہا ہے۔ اس لیئے بچپن میں چڑیوں کی چہچہاہٹ، کوئل کی کُوکُو اور شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ میرے لیئے ہمیشہ سامعہ نواز ہوتی تھیں۔ خاموشی میرے لیئے ہمیشہ باصدا ہوتی اس لیئے کہ جس قدر یہ گہری ہوتی میں گلہریوں، چوہوں اور ٹڈوں کی آوازیں سنتا۔ قوت سامعہ کی اس مہارت ہی کی وجہ سے آگے چل کر میں اچھا ماہرِ صوتیات بن سکا۔ شور و غل چاہے وہ نوحۂ غم، کا ہو یا نغمۂ شادی کا میرے لیئے ہمیشہ عذابِ جان بن جاتا ہے۔

دوسرا باب

جامعہ مِلّیہ اسلامیہ (۱)

ننھیال میں بچّوں کی تعلیم و تربیت کی جانب بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ نانا صاحب علی گڑھ جاتے جاتے رہ گئے۔ بڑے ماموں ضرور پہنچ گئے لیکن انٹرمیڈیٹ کی پہلی کلاس سے ایسے بھاگے کہ مڑ کر نہ دیکھا۔ منجھلے ماموں جامعہ ملیہ اسلامیہ بھیجے گئے انھوں نے بھی آٹھواں درجہ پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مذہبی تعلیم کی جانب بھی توجہ کم رہی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کسی بھی مولوی سے قرآن کا ایک سیپارہ بھی پڑھا ہو۔ میری جہالت کا یہ دور شاید طویل تر ہو جاتا اگر ۱۹۲۶ء میں بڑے چچا ڈاکٹر ذاکر حسین جرمنی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ کے منصب پر فائز نہ ہو جاتے۔ وہ منظر میں کبھی نہیں بھولوں گا جب فروری ۱۹۲۶ء کی ایک سہ پہر اہلِ قائم گنج کا ایک ہجوم انھیں لینے کے لیئے ریلوے اسٹیشن پر آگرے کی جانب سے آنے والی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں بھی اپنی لمبی ٹانگوں کے باوجود ایک ملازم کی گود میں لدا وہاں موجود تھا۔ ریل سیٹی دیتی ہوئی پلیٹ فارم پر آ کر رکی۔ اس سے ایک متین و مقطّع جوان گاڑی سے برآمد ہوا جسے ہجوم نے گھیر لیا۔ مجھے اُن تک پہنچتے پہنچتے کافی عرصہ لگ گیا، لیکن انھوں نے مجھے ایک نظر میں پہچان لیا اور گود میں لے کر سینے سے لپٹا لیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ میرے چھوٹے چچا محمود میاں (ڈاکٹر محمود حسین خاں) مجھے اپنے ساتھ لے کر جامعہ ملیہ داخلے کے لیئے جائینگے۔ جو اس وقت قرول باغ میں کرائے کی عمارتوں میں تھی۔ جامعہ ملیہ میں میرا داخلہ ۱۰ اگست

۱۹۲۷ء کو درجۂ دوم میں ہوا۔ چھوٹے چچا نے اندازے سے میری عمر ایک سال چار مہینے زیادہ لکھوا دی جو بعد کو میٹرک کے سارٹیفکٹ میں جوں کی توں رہی اور مجھے یونیورسٹی کی ملازمت سے اس مدت کے بقدر پہلے ریٹائرڈ ہونا پڑا۔

جامعہ ملیہ میں میری رہائش بچوں کی اقامت گاہ، خاکسار منزل میں رہی جس کے دو حصے تھے ایک کے نگراں ارشاد الحق صاحب تھے اور دوسرے حصے کے جہاں نسبتاً زیادہ عمر کے بچے رکھے جاتے تھے، اختر حسن فاروقی صاحب۔ ارشاد الحق صاحب، ہمارے انگریزی کے استاد بھی تھے اور اختر صاحب ڈرائنگ کے ٹیچر۔ ساتھی طلبہ میں پوربی یو۔پی کے آفتاب، قائم گنج کے شفیق احمد اور قدوائی خاندان کے اخلاق الرحمٰن قدوائی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میری اور آفتاب کی دوستی اور ہمہ وقت کی یکجائی پر اختر صاحب کو اکثر فقرہ کستے ہوئے سنا، حالاں کہ معاملہ صرف 'افلاطونی محبت' تک محدود تھا۔ پانچوں وقت کی نماز کی پابندی تھی۔ فجر کی نماز کے بعد لائن بنا کر سب طالب علم کچھ فاصلے پر پہاڑیوں سے گھرے ہوئے میدان کا رُخ کرتے جہاں جامعہ کالج کے استاد پروفیسر کیلاٹ عمر اور غذا دونوں سے غیر متناسب ڈنڈ بیٹھک اور دوڑ لگواتے۔ شام کو ہاکی کھیلنے کے لیے پھر اسی میدان میں آنا پڑتا تھا جہاں تک جسمانی تربیت اور ڈسپلن کا تعلق ہے اس میں کیلاٹ صاحب کے انہماک کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ ایک مالاباری عیسائی تھے جو نہ معلوم کس طرح ۱۹۲۲ء میں بھٹک کر جامعہ آگئے تھے۔ کنوارے تھے اور دمہ کے دائمی مریض۔ بایں ہمہ انھوں نے کالج میں درس دینے کے ساتھ جامعہ کے اسکول کے بچوں اور کالج کے طلبہ کی جسمانی حالت بہتر بنانے کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ دہلی کی کڑاکے کی سردی میں بھی وہ سب سے پہلے میدان میں پہنچتے اور ورزش اور کھیل دونوں میں لباط بھر حصہ لیتے۔ ان کا کرایہ کا مکان قرولباغ کی پہاڑیوں کے کنارے پر تھا، جہاں سے ان کی ہمہ وقتی موجودگی کا احساس رہتا۔ ان کی شخصیت کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ علی گڑھ اور دہلی میں ایک عمر بتانے کے بعد بھی وہ بہت ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی بول سکتے تھے۔ چنانچہ جب کوئی لڑکا ڈنڈ لگاتے لگاتے اپنا سینہ زمین پر ٹیک دیتا یا دوڑ میں پھسڈی رہ جاتا تو اس کے چوتڑوں پر ہاتھ مار کر کہتے "تم گدا (گدھا) الّو کا موانک (موافق)"، یا "تم دوتی (دھوتی) والا" حالاں کہ مکان پر وہ خود بنیان اور مدراسی

قسم کی دھوتی میں ملبوس رہتے تھے۔ انھوں نے ایک طرح سے کالج کی اعلیٰ درسیات کے علاوہ نونہالانِ وطن کی جسمانی تربیت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ جامعہ ملیہ کے نظم و ضبط میں اس جسمانی ورزش اور تربیت کا خاص مقام تھا۔ قوم کے ننھے سپاہی کو ایک روشن ذہن اور سیرت کے ساتھ ایک مضبوط جسم کی بھی ضرورت تھی۔ آج جامعہ ملیہ کیلاٹ صاحب جیسے خدائی خدمت گار کو بالکل بھول گئی ہے۔ انھوں نے ایک پوری نسل کی ذہنی اور جسمانی تربیت کی ہے۔ جسمانی تربیت کی شہادت کے لیئے مجھ پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ کیلاٹ صاحب کالج میں پڑھاتے تھے اور میں اسکول کا طالب علم تھا اس لیئے ذہنی سطح پر انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں اس کا ذکر ایک سینیر جامعی ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی زبانی سنیئے:

"ہمارے اساتذہ میں سب سے زیادہ لائق اور بافیض مسٹر کیلاٹ تھے جو سیاست اور تاریخ کے پروفیسر تھے۔ نصاب کے علاوہ وہ طالب علموں کی عام معلومات بڑھانے کے لیئے روزانہ ایک لکچر دیتے تھے جو نہایت دلچسپ ہوتا تھا اس کا موضوع بدلتا رہتا تھا۔ کبھی مذہب اور اخلاق اور کبھی علم انسان (انتھراپولوجی) طرزِ بیان شُستہ اور برجستہ تھا انگریزی زبان پر بڑی قدرت تھی۔ بولتے بھی اچھی تھے اور لکھتے بھی اچھی تھے ...... تاریخ کے علاوہ انھیں انگریزی ادب سے بھی خاص لگاؤ تھا .... کیلاٹ صاحب کے لکچروں میں ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے ہمارے سامنے علم کی دنیا کے دروازے کھل گئے ہوں جو اب تک بند تھے۔

کیلاٹ صاحب کی وضع اور سیرت کے اُستاد آج ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ناپید ہیں ..... کیلاٹ صاحب کا اوڑھنا بچھونا جامعہ تھی۔" (یادوں کی دنیا)

کیلاٹ صاحب کی آج کوئی یادگار جامعہ ملیہ میں نہیں لیکن ان کے شاگردوں کے دلوں میں موجود ہے ؎

رفتید ولے نہ از دلِ ما

جامعہ ملیہ کے دارالاقامہ کی زندگی میں "اسپارٹن" اسپرٹ کی خاص اہمیت تھی۔

ورزش کے میدان سے لوٹتے تو دو بڑے پاپے اور ایک پیالی دودھ کا ناشتہ ملتا۔ جی میں کہتا: قائم گنج کے مکھن، ملائی اور گھی والے مسعود کہاں آکر پھنسے ہو؟ لیکن رفتہ رفتہ اس تزکیۂ نفس کا عادی ہوتا گیا۔ ناشتے کے بعد کتابیں لے کر اسکول چلے جاتے جس کی عمارت خاکسار منزل سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ یہیں شیخ الجامعہ کا صدر دفتر تھا۔

چھوٹے بچوں کے دارالاقامہ کے نگراں، ارشاد الحق صاحب ایک با اصول شخصیت کے انسان تھے۔ وہ بچوں سے ہمدردی بھی رکھتے تھے اور ڈسپلن پر نظر بھی۔ پابندئ نماز و اوقات پر اصرار کرتے۔ بچوں کو صفائی کی تاکید رہتی۔ صبح اٹھتے ہی ہر بچہ اپنا بستر خود ٹھیک کرتا۔ میرے دل میں ان کی بہت عزت تھی اور وہ میرا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں جب میں جامعہ ملیہ کا وائس چانسلر ہو کر دہلی پہنچا تو اس وقت وہ بستر مرگ پر تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں وہ چمک آگئی جو ایک استاد کو اپنے چہیتے شاگرد کو اعلیٰ منصب پر فائز دیکھ کر ہوتی ہے۔ میری توجہ جامعہ ملیہ کی زیر تعمیر جامع مسجد کی جانب خصوصی طور پر مبذول کرائی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ میں ان کے یہاں ایک وقت کا کھانا ضرور کھاؤں۔ میرا جواب ہمیشہ یہی ہوتا کہ جلدی کیا ہے جب آپ کی طبیعت سنبھل جائے گی تو کھا لوں گا، لیکن اس کی نوبت کبھی نہیں آئی اور وہ اپنے مولا سے جا ملے۔

خاکسار منزل کے بڑے بچوں کے دارالاقامہ کے (جہاں میں چند سال کے بعد منتقل ہو گیا تھا) نگراں اختر حسن فاروقی صاحب تھے جنھوں نے لکھنؤ کے اسکول آف آرٹس میں تعلیم پائی تھی۔ وہ اپنے فن کے ایک کامیاب استاد تھے اور طالب علموں میں آرٹس سے دلچسپی پیدا کر دیتے تھے۔ حلیے کے اعتبار سے بھی وہ آرٹسٹ معلوم ہوتے تھے۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ بیگم کو دو مختصر سے کمروں میں جو انھیں بحیثیت نگراں ملے ہوئے تھے پس پردہ رکھتے تھے، حالاں کہ ہم میں سے کسی کی عمر اس وقت چودہ برس سے زیادہ کی نہیں ہوگی۔ بورڈنگ ہاؤس کے اس حصے میں اخلاق الرحمٰن قدوائی میرے روم فیلو تھے۔ اخلاق تحریر و تقریر کے اعتبار سے اوسط درجے کے طالب علم تھے، لیکن انسانی معاملات میں ان کی سوجھ بوجھ مجھ سے اچھی تھی۔ خود جوڑ توڑ سے فوڈ مانیٹر بن جاتے اور مجھے کہہ سن کر پریر مانیٹر بنوا دیتے۔ انھیں

اپنی دنیا اور میری عاقبت کا بہت خیال رہتا تھا۔ میں اِس بار اِس انتخاب پر بہت زیادہ خوش نہیں تھا، خاص طور پر دہلی کے کڑاکے کے جاڑے ہیں فجر کی اذان کیلئے صبح صبح اٹھنا قیامت تھا۔ وضو کے لیے گرم پانی کا انتظام بس یوں ہی سا تھا۔ زیادہ تر ہمیں کنوئیں کے تازہ پانی پر اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ان حالات کے تحت اکثر ایمان متزلزل ہو جاتا۔ ایک صبح میری آنکھ ذرا دیر سے کھلی۔ پو پھٹ چکی تھی۔ اس لئے تڑپ کر اٹھا اور بغیر وضو کئے برآمدے میں کھڑے ہو کر اذان دینا شروع کر دی۔ اختر صاحب اس وقت تک اُٹھ چکے تھے اور گرم پانی سے وضو کر کے اذان کا انتظار کر رہے تھے۔ جونہی میں نے اللہ اکبر کہا وہ اپنے کمرے سے برآمدے میں برآمد ہوئے۔ ایک نظر میں بھانپ لیا کہ میں بغیر وضو کے اذان "ٹرخا" رہا ہوں۔ چپکے سے پیچھے آکر انھوں نے عین اذان میں میرا کان پکڑ لیا۔ اذان یک لخت رُک گئی۔ بولے "ہت نالائق! پر پر ماسٹر ہو اور بغیر وضو کے اذان دیتے ہو"۔ غالباً میری اس ترکیب کے بارے میں وہ کئی روز سے شبہ کر رہے تھے اور موقع کی تاک میں تھے۔

میں نے اپنے جرم کا فوراً اقرار کر لیا اور اس کے ساتھ یہ اعتذار کہ "ماسٹر صاحب! (ماسٹر صاحب) اس کڑاکے کی سردی میں بغیر گرم پانی کے وضو کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ میں نے خدا کو حاضر ناظر کر لیا تھا"، لیکن وہ کب ماننے والے تھے۔ مجھے طلبہ کے سامنے رسوا کیا گیا۔ البتہ اس واقعہ کا یہ مثبت نتیجہ ضرور نکلا کہ دوسرے روز سے فجر کی نماز کے لیے طالب علموں کو گرم پانی ملنے لگا۔ میں نے اپنی عاقبت خراب کر کے اپنے ساتھیوں کی دُنیا اچھی کر دی!

اِسی زمانے کا ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے۔ تعلیمی سال کے شروع میں طالب علم اپنے گھروں سے آتے تو از قسم حلوہ وغیرہ ضرور ساتھ لاتے، جسے وہ سینت سینت کر رکھتے تاکہ زیادہ دنوں تک لطف اندوز ہو سکیں۔ اخلاق الرحمٰن نے سونگھ لیا کہ بعض متموّل گھرانوں کے طالب علم اس سال حلوہ اور خشک میوہ جات قسم کی چیزیں کافی مقدار میں لائے ہیں اور اپنے خاص خاص دوستوں کے علاوہ کسی کو ان کی ہوا تک نہیں لگنے دیتے۔ مجھ سے بولے کہ فجر کی نماز میں جس دن اختر صاحب نہ آئیں اور تم امامت کرو اس روز صورت طویل کر دینا اور رکوع وسجود میں خشوع خضوع بڑھا دینا۔ چنانچہ ایک روز یہی ہوا اور ایسا ہی کیا گیا۔ اُدھر اخلاق چند باکمالوں کے ساتھ پچھلی صف سے نیت توڑ کر دھیرے سے کھسک لیے اور کمروں میں جا کر غارت گری شروع

کر دی۔ جب کام مکمل کر لیا تو مالِ غنیمت کو چھپا کر پچھلی صف میں آ کر پھر کھڑے ہو گئے اور کھنکھار کے ذریعے اپنی کامرانی کا اشارہ کیا۔ پھر سلام پھیر کر دعا مانگی گئی "اے میرے رب! تو سب کا رزاق ہے" اس کے تھوڑے ہی دیر بعد ایک طرف کہرام تھا اور دوسری طرف 'فتوحات' کے شادیانے۔ شکایت ہوئی لیکن اس سے قبل 'فتوح' خلوئے معدہ کو پُر کر چکی تھیں۔

اسکول کے اساتذہ میں سب سے بارعب شخصیت برکت علی صاحب کی تھی جو عام حاضری بھی لیتے تھے اور ریاضی بھی پڑھاتے تھے۔ بڑے رکھ رکھاؤ کے استاد تھے لیکن چوں کہ ساری عمر عالم تجرد میں گزری تھی اس لیے طبیعت میں قدرے سختی تھی۔ وہ اردو خالص کھڑی بولی کے (بجنور سے تعلق تھا) لہجہ میں بولتے تھے یعنی 'اُس کو' کو واؤ معروف سے اور فعل مضارع کے صیغے کو "تا" کے بغیر جیسے کرے ہے جائے ہے وغیرہ۔ ہم سب ان کے پڑھانے اور سمجھانے کے معترف تھے لیکن ان کے قریب آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ کچھ آتش اور آتش پرست کا سا رشتہ تھا۔ اُن کی ہنسی سے بھی ڈر لگتا تھا اور زکام سے بھی، معلوم نہیں دونوں کس وقت بگڑ جائیں۔

اُن کے برعکس ہمارے عربی اور دینیات کے استاد مولوی سعد انصاری صاحب طلبہ میں بہت مقبول تھے۔ وہ اپنی ناراضگی زیادہ سے زیادہ "نالائق" سے ظاہر کرتے۔ مصر ہو آئے تھے اور وہاں کے قومی ترانے "مصرُ عزیزۃٌ لِی وطن" سے بہت متاثر تھے۔ ایک لفظ کی تحریف کے بعد اُنھوں نے اسے ہندی ترانے میں بدل دیا تھا۔ "ھندُ عزیزۃٌ لِی وطن"۔ کلاس میں ہم سے اسے گانے کے لیے کہتے۔

اردو کے استاد سعید انصاری صاحب تھے جو بعد میں جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر ہو کر آنے تک حیات تھے۔ اس وقت وہ جامعہ کی جامع مسجد کی تعمیر کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے اس کی تعمیر میں دل و جان سے مصروف تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ مسجد کا سارا فرش سنگِ مرمر کا ہو۔ میں نے لاکھ اقبال کے اس شعر کا حوالہ دیا ؎

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

لیکن وہ اپنے منصوبے پر اڑے رہے۔ آخر میں جب روپے کی کمی پڑ گئی تو میں نے سعودی سفارت خانے

سے اس سلسلے میں رابطہ قائم کیا اور وہاں سے تین لاکھ کی نقد رقم ملنے کے بعد اس کام کی تکمیل ہوئی۔ یہ مسجد حیدر آباد کے مشہور آرکیٹیکٹ فیاض الدین صاحب کے ذہن کا نقشہ ہے اور اس کا مادّی وجود سعید انصاری صاحب کی لگن اور ریاضت کا پھل ہے۔

جامعہ ملیہ کے اسکول میں، مَیں نے ۱۹۲۷ تا ۱۹۳۳ء تعلیم حاصل کی۔ اس چھ سال کے قیام نے میری کایا ہی بدل دی۔ میں قائم گنج سے ایک کندۂ ناتراش آیا تھا جس میں '۱،۲،' کی صفت کے علاوہ اور خصوصیت نہیں تھی۔ جامعہ ملیہ کے ماحول میں مجھے قومی احساسات اور تصورات کا پہلی بار علم ہوا۔ ساری فضا قومیت اور ایثار سے سرشار تھی۔ ہر دفتر میں اقبال کا یہ شعر کتبے کی شکل میں آویزاں پایا ؎

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم   از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

اور مولانا حالی کی یہ رباعی:

دنیائے دَنی کو نقشِ فانی سمجھو   ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا   ہر لمحے کو مہرِ جاودانی سمجھو

یہیں میں حالی اور اقبال کی عظمت سے بھی آشنا ہوا۔ فکرِ اقبال جو تقسیمِ ملک کے بعد عرصہ تک 'فکرِ ممنوعہ' کے طور پر عتاب کی نظروں سے دیکھی گئی ہے، اُس وقت اس کا غلغلہ تھا۔ جامعہ کے طلبہ کے سامنے ایک اچھے ہندوستانی اور سچّے مسلمان کا مسلک تھا اور بتایا جاتا تھا کہ دونوں میں تضاد نہیں ہے۔ یہیں میں نے غالب کی فرضی تصویر اور اصلی دیدہ زیب دیوان کو دیکھا جو 'شرکتِ کاویانی' برلن نے شائع کیا تھا۔ جامعہ ہی کی چہار دیواری میں میں نے ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور گاندھی جی کو پہلی بار دیکھا۔ گاندھی جی اپنے پوتے کی وفات پر آئے تھے جسے انھوں نے جامعہ کے لیئے وقف کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنے پوتے کے انتقال کا ذکر نہایت رقّت آمیز لہجہ میں کیا جس سے ہم سب بہت متاثر ہوئے لیکن جب انھوں نے مِیں مِیں کرنا شروع کیا (گجراتی مَیں کا تلفظ یں کرتے ہیں) تو مجھے اُن پر رحم آنے لگا۔ برا ہو اردو والوں کے اس احساسِ تفوق کا! انھیں کے ایماء سے بعد کو ان کے صاحبزادے دیوداس گاندھی نے جامعہ میں کئی سال تک قیام کیا اور ہم لوگوں کو ہندی پڑھانے کے علاوہ تکلی اور چرخہ

کاتنے کا فن سکھایا۔ ہاتھ کے کام کی تعلیم میں اہمیت کو یہیں جانا۔ ماسٹر عبدالحیٔ صاحب سے کارپینٹری سیکھی اور رستم قلم محمد علی فرخ آبادی سے خوشخطی۔ باغبانی اور زراعت کے فن کی شُدبُد یہیں ہوئی۔ جامعہ میں سب کھدّر پوش تھے کیا اُستاد کیا طلبہ۔ کئی بار ہمارے ساتھیوں نے ولایتی کپڑوں کے ڈھیر لگا کر اسے نذرِ آتش کیا تھا۔ تیرہ اپریل کو جلیانوالہ باغ کے خونی حادثے کی یاد میں دن بھر کا سارا کام ہم لوگ اپنے ہاتھوں سے کرتے، جس میں بیت الخلا کی صفائی بھی ہوتی۔ اردو زبان و ادب کا چسکا بھی جامعہ کی دین ہے۔ ہماری انگریزی کی استعداد تو واجبی رہی لیکن اُردو میں اسی زمانے میں چھوٹے موٹے ادیب بن گئے۔

اسی زمانے میں مجھے پہلی بار کشمیر جانے کا موقع ملا۔ یہ اس اعتبار سے بھی یادگار ہے کہ اسی سفر میں علامہ اقبال سے اُن کے درِ دولت پر ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں جامعہ ملیہ کے کالج کے استاد سید نذیر نیازی صاحب نے جو علامہ اقبال کے ہموطن اور عقیدت مند تھے، ڈھائی مہینے کی طویل رخصت اس غرض سے لی کہ وہ کشمیر جاکر وہاں علامہ کے انگریزی خطبات کا اردو میں ترجمہ کریں گے۔ اس کا وعدہ وہ بہت پہلے کر بیٹھے تھے، لیکن دہلی کی مصروفیات میں اس کام کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ اس کا ذکر جب انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے کیا تو انھوں نے کہا کہ "آجکل مسعود کی صحت ٹھیک نہیں رہتی ہے بہت دُبلے ہو گئے ہیں انھیں بھی اپنے ہمراہ لیتے جایئے۔ اُن کا خرچ میں برداشت کروں گا"۔ کشمیر جاتے ہوئے ہم لوگ راستے میں دو روز کے لیے لاہور ٹھہرے۔ ظاہر ہے نذیر نیازی صاحب علامہ اقبال سے بغیر ملے کیوں کر آگے بڑھ سکتے تھے۔ چنانچہ دوسرے ہی دن سہ پہر کو علامہ اقبال کی کوٹھی پر گئے جو میکلوروڈ پر واقع تھی۔ علامہ کوٹھی کے باہر مونڈھے پر پاؤں سمیٹے ہوئے قمیص اور شلوار زیب تن کیے تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ نیازی صاحب کو پہچانتے ہی انھوں نے کہا "آؤ جی نیازی جی! کہو کیا حال چال ہیں؟" نیازی صاحب نہایت نیاز مندی کے ساتھ ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے علامہ سے بولے: "یہ مسعود حسین ہیں، ڈاکٹر ذاکر حسین کے بھتیجے۔ صحت کی تلاش میں میرے ساتھ کشمیر جا رہے ہیں۔ آپ کے پرستار ہیں اور انھیں آپ کا سارا اردو کلام ازبر ہے"۔ علامہ ایک مشفقانہ نظر ڈالتے ہوئے

مجھ سے بولے "کشمیر جا کر ایک شفتالو روز کھاؤ، سرخ ہو جاؤ گے" اتنا کہہ کر وہ نیازی صاحب سے محو گفتگو ہو گئے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا دونوں کی گفتگو کا محور علامہ کے خطبات تھے۔ انھوں نے اس بات پر طمانیت کا اظہار کیا کہ اب نیازی صاحب کشمیر کے دورانِ قیام میں انھیں ضرور مکمل کر لیں گے لیکن کشمیر میں ڈھائی ماہ قیام کرنے کے بعد جب لوٹے تو ترجمہ چند صفحات سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ انھوں نے اب مصلحت اسی میں سمجھی (میرے اصرار کے باوجود) کہ علامہ سے ملاقات نہ کی جائے۔ علامہ سے انھوں نے اپنا وعدہ اُن کے انتقال کے بیس برس بعد پورا کیا!

دہلی پہنچ کر لوگوں نے جب علامہ اقبال کے بارے میں میرے تاثرات معلوم کرنے چاہے تو میں نے یہی کہا کہ میرے ذہن میں جو شاعر کا تصور تھا میں نے انھیں اس سے مختلف پایا۔ باریک ترشی مونچھیں، کروکٹ بال، بھاری بھر کم ڈیل ڈول۔ مجھے ان پر پنجابی پہلوان ہونے کا گمان زیادہ گزرا۔ میرے ذہن میں اردو شاعر کی نستعلیق شخصیت کا جو تصور تھا وہ یک لخت پاش پاش ہو گیا اور میری ذہنی کیفیت کچھ اس طرح کی ہوئی ؎

تماشا کامیاب آیا تمنا بے قرار آئی

میرا کشمیر کا یہ سفر کئی لحاظ سے کامیاب رہا۔ وہیں میں نے پہلا شعر کہا۔ ڈھائی مہینے میں وہاں کی خوشگوار آب و ہوا اور فواکہات نے مجھے سرخ و سفید بنا دیا۔ ہمارا وہاں قیام ستمبر تا وسط دسمبر ۱۹۳۲ء رہا۔ اس لیے وہاں کے خزاں کی رنگینی بھی دیکھی اور سیب، ناشپاتی اور خشک میوہ جات کی بہتات بھی۔ قیام نذیر نیازی صاحب کے رشتے کے بھائی کے یہاں "دیند" پر سرکاری کوارٹرس میں تھا۔ روز شام کو ٹہلتے ہوئے لال چوک پہنچ جاتے جہاں سے سیب، خشک میوہ اور خاص طور پر علامہ اقبال کے تجویز کردہ شفتالو خرید کر لاتا۔ نذیر نیازی صاحب کی بھاوج کشمیری کرم کا ساگ بہت اچھا پکاتی تھیں جو چاولوں کے ساتھ بڑا مزہ دیتا تھا۔ اس مستقر سے وادی کے دوسرے دلچسپ مقامات کے دھاوے مارے جاتے گلمرگ اور کھلن مرگ کے دھاوے میں سیالکوٹ کے صہبائی پال بھی ساتھ تھے۔ وہ وہاں کسی مقدمے کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے لیکن شاعر کی حیثیت سے زیادہ معروف تھے۔ ان کی اور نذیر نیازی صاحب کی ادبی بحثیں ہوتیں۔ میرے لیے تفریح کا سب

دلچسپ مشغلہ دریائے جہلم کے کنارے کا 'بند' تھا۔ اُس زمانے میں ولایتی اسباب سے بھری ہوئی دوکانوں اور منتخب سیاحین کے خرید و فروخت کا بازار ہونے کی وجہ سے یہ بہت بارونق تھا۔ جہاں آج سرکاری ایمپوریم ہے، اس میں ریزیڈنٹ کی رہائش گاہ اور دفاتر تھے۔ دریا کے پار پبلک لائبریری تھی جہاں شکارے میں پار کر کے جاتا اور وہاں سے شرر کی ناولیں پڑھنے کے لیے لاتا۔ میں نے جس قدر ناولیں اُس زمانے میں پڑھی ہیں بعد کو سب مِلا کر بھی اتنی نہیں پڑھیں۔

پاس میں ریزیڈنٹ کے میر منشی سراج الدین صاحب کا مکان تھا، جہاں کبھی کبھی چلا جاتا تھا وہ علامہ اقبال کے بڑے معتقد تھے۔ ان کے مکتوب الیہ بھی رہے ہیں۔ وہ بڑے صاحب عِلم اور سخن فہم تھے۔ ڈاکٹر اقبال نے ایک خط میں انھیں لکھا تھا "آپ ہندوستان کے اُن چند لوگوں میں سے ہیں جن کو شاعری سے طبعی مناسبت ہے اور اگر نیچر ذرا سی فیاضی سے کام لیتی تو آپ کو زمرۂ شعراء میں شمار کرتی۔"

لیکن میری دلچسپی کا مرکز وہ اِس لیئے بنے کہ وہ ایک چابکدست جِلد ساز تھے اور اپنے فرصت کے اوقات میں اپنی کتابوں کی نہایت خوبصورت جلدیں باندھنے میں معروف رہتے۔ اُن کے پاس جلد سازی کا مکمل ساز و سامان تھا۔ باتیں کرتے جاتے اور اپنے ہاتھوں کے کام میں مصروف رہتے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ بھی دیکھنے کے لائق تھا۔ ہر چند وہ اپنی کُتب مُستعار دینے کے قائل نہیں تھے لیکن اس کو دیکھ کر ہی خوش ہوتا اور جی میں منصوبہ باندھتا کہ علم سے ہر دلچسپی رکھنے والے کو انھیں کی طرح جِلد ساز ہونا چاہیئے۔

یہ مہاراجہ کے استبداد کا زمانہ تھا۔ پوری وادی پر سیاسی سکوت چھایا ہوا تھا! البتہ کبھی کبھی لال چوک میں جھنڈیاں اڑتی نظر آجاتی تھیں۔

ہر طرف چہل پہل رہتی صرف مظلوم کشمیری منظر سے غائب رہتا۔

تیسرا باب

"بنگلہ دیس، اک رنگ بھون" (دو نیم)

۱۹۳۳ء کا سال میری زندگی میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی سال میرے چھوٹے چچا، ڈاکٹر محمود حسین خاں، جرمنی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس آئے اور تلاشِ روزگار میں اپنے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے یہاں حیدرآباد میں مقیم ہوئے۔ اتفاق سے دہلی سے بڑے چچا، ذاکر میاں، بڑے بھائی امتیاز حسین خاں اور میں بھی گرما کی تعطیلات گزارنے کے لیئے وہاں پہنچے۔ یہ ایک طرح کا عرصے کے بعد "خاندان ملن" تھا۔ محمود میاں ریاست حیدرآباد کے محکمۂ تعلیم میں کسی اسامی کے لیئے کوشاں تھے اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں بھی درخواست دے رکھی تھی۔ حسنِ اتفاق ایک روز ڈھاکے سے اطلاع ملی کہ وہاں یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں اُن کا انتخاب بحیثیت ریڈر ہو گیا ہے۔ احساسِ دوری کے باوجود فوراً وہاں کے لیئے پابہ رکاب ہو گئے، شرط یہ لگا دی کہ مسعود کو بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ اُس وقت تک اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ دوری اور تنہائی دونوں کو بہ یک وقت برداشت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سب بزرگوں نے اُن کی ہاں میں ہاں کی۔ بس پھر کیا تھا بے سروسامانی کی حالت میں اُن کے ساتھ طویل سفر پر روانہ کر دیا گیا۔ اس طرح جامعہ سے میرا چھ سال کا تعلق ختم ہو گیا۔ کلکتے اور اس کے بعد دریائی بندرگاہ گوالندو تک کا سفر ہم نے ریل سے طے کیا۔ اس دوران محمود میاں کے "جھمن خانی" جلال کا مظاہرہ دیکھا جب انھوں نے ایک قلی کے حجت کرنے پر

اپنی چھتری اس کے سر پر توڑ دی۔ وہ بہت باغ و بہار انسان تھے۔ ان کا قہقہہ مشہور تھا، لیکن غصّے میں بے آپے ہو جاتے۔ قائم گنج کی بوڑھیوں کا ایک محاورہ اُن جیسوں ہی کے لیے تھا، 'پٹھان کا پوت، زرا میں ولی زرا میں بھوت!'

گوالندو سے اسٹیمر پکڑا جس نے چند گھنٹے کے دریائی سفر کے بعد ہمیں اندرگاہ نرائن گنج پہنچا دیا۔ وہاں سے پھر ریل لی اور گھنٹہ بھر میں ڈھاکہ پہنچ گئے۔ یونیورسٹی کیمپس کے اندر نیل کھیت روڈ پر پہلے سے ایک مکان الاٹ ہو چکا تھا۔ یہ سلیم اللہ مسلم ہال کی پشت پر تھا۔ آس پاس یونیورسٹی کے اساتذہ کی رہائش کے لیے دوسرے چھوٹے بڑے مکان بنے ہوئے تھے۔ ہمارے ایک پڑوسی رام پور کے فدا علی خاں تھے، جو شعبۂ فارسی و اردو کے صدر تھے۔ تھوڑے فاصلے پر 'شیر شاہ' کے مشہور مصنف قانون گو صاحب کا مکان تھا۔ وہ بڑے محنتی انسان تھے۔ برآمدے میں ایک فارسی داں منشی صبح تا شام بیٹھا رہتا جس سے استفادہ کرتے رہتے۔ صدرِ شعبۂ انگریزی حسن صاحب کی کوٹھی تھی۔ وہ انگریزوں کے انداز میں نہایت ٹیپ ٹاپ سے رہتے تھے۔ یہ تو بعد کو علی گڑھ پہنچ کر راز کھُلا کہ انگریزی کا پروفیسر بہ حلیۂ اردو بھی پایا جاتا ہے۔

ڈھاکہ پہنچ کر اب میرے داخلے کی فکر ہوئی۔ میں نے جامعہ سے آٹھواں درجہ پاس کیا تھا، اردو ذریعۂ تعلیم سے۔ ڈھاکے میں ہر جگہ انگریزی میڈیم تھا۔ تلاش بسیار کے بعد مجھے آرمنی ٹولہ گورنمنٹ ہائی اسکول کی نویں کلاس میں داخلہ مل گیا۔ یہ اسکول ایک ٹریننگ کالج سے ملحق تھا اس لیے دوسرے اسکولوں کے مقابلے میں اچھا سمجھا جاتا تھا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر، مسٹر بسواس، ایک بنگالی عیسائی تھے۔ اسکول کے دیگر تمام اساتذہ بھی بنگالی ہندو تھے۔ صرف اردو فارسی کے استاد عندلیب شادانی صاحب کے ایک مسلمان شاگرد تھے۔ وہ بھی بنگالی نژاد تھے اور اسی لہجہ میں اردو بولتے تھے۔ اردو پڑھنے والے طالب علموں کی تعداد صرف تین تھی۔ ایک 'میں'، ایک نورالدین اور ایک ڈھاکہ میں بسے ہوئے ایرانی خاندان کے فرد، جن کا نام یاد نہیں رہا۔ نورالدین کے والد کا تعلق بہار سے تھا۔ اس لیے ان کے گھرانے میں ایک اردو نما زبان بولی جاتی تھی۔ یوں تو ڈھاکہ سرتاسر بنگالی

کا علاقہ ہے لیکن ڈھاکے کے نوابین کے خاندانوں اور اسلام پورہ جیسے کچھ محلّوں میں بنگالی لہجہ میں اردو کا رواج تھا۔ یہاں کے لوگوں کو دونوں زبانوں کی واقفیت تھی لیکن وہ اپنی مادری زبان اردو کو ہی سمجھتے تھے۔

نوابینِ ڈھاکہ کے اردگرد اہلِ اردو کا جو طبقہ تھا اس میں سبھی تھے۔ طبیب بھی تھے اور اہلِ علم بھی۔ ڈھاکہ ہی میں بیٹھ کر مرزا آغاجان طپشؔ دہلوی نے وہاں کے شعراء کو اردو کے دہلوی محاورے سے متعارف کرانے کے لیے ۱۷۹۲ء میں "شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان" تصنیف کی۔ میں جب وہاں تھا تو حکیم حبیب الرحمٰن نہ صرف ڈھاکے کے مشہور طبیب کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، اہلِ علم اور شاعر بھی تھے۔ ان کے محمود میاں سے گہرے تعلقات تھے۔ مجھ پر بڑی شفقت رکھتے تھے۔ نواب خاندان کے کئی نوجوان مختلف اوقات میں میرے کلاس یا کالج فیلو بھی رہے۔ ان میں سرناظم الدّین کے بھتیجے، شہاب الدّین صاحب کے دو فرزند اب تک حافظے کے نہاں خانے میں محفوظ ہیں۔ انٹرمیڈیٹ کالج میں مجھ سے ایک سال سینیر نواب خاندان کے قیصر تھے، جو بہت اچھے طالب علم اور اسپورٹس مین تھے بعد میں ترقی کر کے وہ چین میں پاکستان کے سفیر ہو گئے تھے۔ یہ سب لوگ اردو والے تھے۔ البتہ مجھ سے بات کرتے وقت تھوڑی سی جھجک محسوس کرتے، دہلی اور لکھنؤ کے علاقے کی اردو کی یہاں اس قدر دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ حضرات بنگالی بھی فراٹے کے ساتھ بولتے تھے لیکن اردو کو اپنی مادری زبان تسلیم کرتے تھے، اس لیے تعلیمی اداروں میں اُسے مادری زبان کی حیثیت سے پڑھتے اور گھروں میں اسی زبان میں بات چیت کرتے۔ بنگال میں مرشدآباد اور ڈھاکہ اُردو کے دو جزیرے تھے جو بنگالی کے بحرِ ذخّار میں، میرے زمانے تک اپنی انفرادیت قائم رکھے ہوئے تھے۔

میرے اسکول کے ساتھیوں میں دو طالب علموں نے اپنے اپنے طور پر امتیاز حاصل کیا۔ ایک نورالدّین جو اپنے والد کی طرح بعد کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے رجسٹرار ہوئے۔ وہ بڑے شرمیلے انسان تھے۔ اس لیے مجھ سے کھلنے میں انھیں خاصی دیر لگی۔ لیکن جب کھُل گئے تو میرے ساتھ گرمیوں کی تعطیل میں قائم گنج اور دہلی تک آئے اور پھر میری تحریک پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ آکر بی اے میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ نے انھیں زیادہ دنوں تک انگیز نہیں کیا، اس لیے

بہت جلد چھوڑ کر واپس ڈھاکہ چلے گئے۔ دوسرے ساتھی نَورانرائن چودھری کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ٹھیٹھ بنگالی تھے، لیکن "ہمارا باپ آیا، ہمارا ماں آیا، ہمارا بہن آیا، شب آیا" قِسم کی ہندوستانی میں گفتگو کر لیتے تھے۔ وہ طالب علمی کے زمانے میں مجسمہ سازی اور سنگ تراشی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ میں اکثر ان کے یہاں جاتا تھا۔ میری فرمائش پر اُنھوں نے مجھے اِس زمانے کے گراموفون ریکارڈوں پر بنے ہوئے کُتے کی تصویر کا مجسمہ تراش کر تحفہ کے طور پر دیا تھا جو اب تک میری میز پر پیپرویٹ کی شکل میں رکھا رہتا ہے۔ عرصہ کے بعد جب وہ شہرت یافتہ شنکو چودھری کے نام سے دہلی میں مقیم تھے اور ایک روز مجھ سے ملنے جامعہ ملیہ آئے تو میں نے اُن کا تراشا ہوا کُتا انھیں دکھایا۔ خیال تھا کہ وہ اسے اپنے ایّامِ جاہلیت کی یادگار سمجھ کر عزیز رکھیں گے، لیکن اُنھوں نے زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی، اِس لیے میری نیت، جو تحفہ کے طور پر انھیں واپس دینے کی تھی، بدل گئی۔ اور وہ میرے پاس ہی رہ گیا ہے۔ شنکو مجسمہ سازوں کے حلقوں میں آج ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ہائی اسکول کے بعد وہ برسوں شانتی نکیتن سے منسلک رہے اور وہیں انھوں نے پہلے نام کمایا۔ اب لِلت کلا اکیڈمی کے صدر ہیں۔

ڈھاکہ میرے لیے ایک اجنبی ماحول تھا۔ اردو بولنے کے بہت کم مواقع ملتے تھے۔ عمر ایسی نہ تھی کہ میں اپنے تکلّمی ذریعۂ ابلاغ کو میرؔ صاحب کی طرح بند کر دوں۔ ایک طرح سے غالبؔ اور اقبالؔ کے ماحول سے نکل کر میں ٹیگورؔ اور نذرؔل کے ماحول میں آ گیا تھا۔ اسکول میں انھیں کے گانے اور ترانے گائے جاتے، رابندر سنگیت کا ہر طرف چرچا تھا۔ میں اس وقت تک بنگالی سے اچھی طرح واقف نہیں ہوا تھا۔ لیکن جب اس کے گیت سُنتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ بغیر معنوں کے کوئی چیز میرے خون میں اُترتی جا رہی ہے۔ انھیں دنوں اردو کے شعر میری زبان سے پھوٹنے لگے۔ اب جو اس زمانے کی چند غزلوں کو دیکھتا ہوں تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ وارداتِ قلبیہ ہیں یا روایتِ شعری کے زائیدہ:

میں ہوں اقرار سراپا مجھے پھر کیا انکار
وہ ہیں انکار سراپا انھیں پھر کیا اقرار

جہاں میں کچھ بھی بنو تم مگر خیال رہے
مرے لیے تو وہی ہو جو مجھ کو یاد رہو

بیٹھنا وہ ناز سے اور دیکھنا سوئے شفق
چاہتے ہیں وہ بھلانا ہم کو اِس انداز سے

میرا خیال ہے کہ اگر میں عمر کے اس حصے میں ڈھاکہ منتقل نہ ہو گیا ہوتا تو میری باقاعدہ شاعری کا آغاز بہت پہلے ہو جاتا۔ بعد کو اس کی تحریک علی گڑھ پہنچ کر ۱۹۴۲ء میں ہوئی۔

میٹرک کا امتحان میں توقع سے زیادہ امتیازات سے پاس ہوا۔ اردو اور فارسی میں پچھتّر فیصد سے زائد نمبر پائے اور ڈھاکہ بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے وظیفہ مِلا اور ڈھاکے کے ممتاز گورنمنٹ اِنٹر کالج میں داخلہ لیا۔ اس کی عمارت رَمنہ کے علاقے میں ریس کورس کے سبزہ زار سے ملحق تھی۔ یہ دراصل تقسیم بنگال کے بعد مشرقی بنگال کے گورنر کی رہائش کے لیے تعمیر ہوئی تھی۔ مشہور تھا کہ اس میں آ کر لڑکوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں اس کے پرنسپل فخرالدّین صاحب تھے جن کا تعلق بہار سے تھا اور جو انگریزی لہجے میں اردو بولتے تھے حالانکہ وہ سرراس مسعودؔ کے زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار بھی رہ چکے تھے اور انھیں کی حمایت میں سرراس نے وائس چانسلری سے استعفےٰ دیا تھا۔ اساتذہ سب کے سب بنگالی تھے۔ اردو فارسی کے استاد، ہمارے اسکول کے استادوں سے بھی گئے گزرے تھے، عبارت اور لہجہ دونوں اعتبار سے۔ البتہ انگریزی کے ایک استاد کا نقش اب تک حافظے میں محفوظ ہے۔ وہ شیکسپیئر کا ڈرامہ Tempest پڑھاتے تھے اور اس کے کردار Prospero کی مانند لہراتی ہوئی داڑھی کے ساتھ ڈرامائی منظر کشی کر دیتے تھے۔ ساری کلاس انھیں Prospero کہتی تھی۔ انگریزی فارسی کے علاوہ میرے پاس معاشیات اور تاریخ کے مضامین تھے۔ میں معاشی انسان کبھی نہیں رہا۔ البتہ ادب اور تاریخ سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ بالآخر بی۔ اے میں جا کر یہی میرے دو مضمون رہ گئے۔

انٹرمیڈیٹ میں میرا عزم فرسٹ پوزیشن پانے کا تھا۔ اب میری انگریزی بھی اچھی ہو گئی تھی۔ تعلیمی سال کے شروع سے میں نے نہایت منظّم اور مرتّب طور پر پڑھائی شروع کر دی۔ دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ میری قلعہ بندی پر بعض اوقات محمود میاں ناراض تک ہو جاتے۔ بالآخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ انٹرمیڈیٹ کے دوسرے سال میں امتحان کے قریب میں شدید قسم کے خلل اعصاب کا شکار ہو گیا۔ ریڑھ کی ہڈی سے سردلہر اٹھتی ہوئی حرام مغز تک جاتی اور مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے دل بند ہونے جا رہا ہے۔ طبّی مشورہ کیا تو ضعفِ اعصاب کا مرض (Neurasthenia) تجویز ہوا۔ بے شمار ٹانک پیے، لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ محمود میاں کی رائے ہوئی کہ امتحان میں نہ بیٹھوں۔ میرا اصرار تھا کہ مجھے بیٹھنا ہے۔ بالآخر بیٹھا، بیمار کی طرح لیٹ کر امتحان دیا، فرسٹ ڈویژن تو پایا لیکن پوزیشن نہ مل سکی۔ میں اب ڈھاکے سے سخت دل برداشتہ تھا۔ چاہتا تھا کہ فوراً چھوڑ دوں۔ محمود میاں نے بہت روکا لیکن مَیں جوں ہی سفر کے قابل ہوا، دہلی کے لیے روانہ ہو گیا، اور وہاں سے ایک ملازم کے ساتھ مسوری چلا گیا جس کا خرچہ مجھے میرے چھوٹے چچا نے دیا تھا۔ اب میں اُبلا سُبلا کھاتا، پابندی سے صبح و شام ٹہلتا اور دواؤں کا پٹارا میرے ساتھ رہتا۔ رفتہ رفتہ اپنی قوّتِ ارادی کے بل پر میں نے اپنے مرض پر قابو پا لیا اور اپنا تعلیمی سال نہیں ضائع ہونے دیا۔ میرے اس کمال کا ذکر بعد کو ذاکر میاں اکثر لوگوں سے کیا کرتے تھے۔ طبیعت کی بحالی کے باوجود ضعفِ اعصاب کے دورے عرصے تک پڑتے رہے۔ اُس وقت میرا دل بیٹھنے لگتا اور موت کا اندیشہ رگِ جاں کے قریب ہوتا۔ یہ سلسلہ بی۔ اے کی تعلیم کے دوران تک چلتا رہا۔

اس بیماری کے علاج کے سلسلے میں میرا سابقہ ڈھاکہ اور دہلی میں بہت سے ڈاکٹروں سے پڑا۔ ذاکر میاں کے مشورے سے میں نے یونانی علاج بھی کیا۔ شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم، جن کی شفقت کا ایک زمانہ معترف تھا، مجھے شریف منزل (بلیماران) حکیم محمد احمد خاں کے مطب لے گئے۔ حکیم صاحب، حکیم اجمل خاں مرحوم کے بھتیجے تھے اور اُن کے بعد، اُن کی حذاقت کا دہلی میں عام شہرہ تھا۔ پہنچ کر دیکھا کہ حکیم صاحب گاؤ تکیہ لگائے مسند پر تشریف فرما ہیں۔ سامنے فرش پر مریض ایک حلقے کی شکل میں بلائے جانے کے منتظر بیٹھے ہیں۔ حکیم صاحب

کے بائیں بازو پر ایک بڑا سا اُگالدان رکھا ہوا ہے جس میں وہ ہر دو چار منٹ کے بعد پان کی پیک 'پڑپچ' سے تھوک دیتے ہیں۔ منہ پان سے اس قدر بھرا ہوا ہے کہ اردو فارسی بن کر نکلتی ہے۔ دائیں جانب پر ایک چا بکدست نسخہ نویس 'یک زانو' ان کے 'فرمودات' کا منتظر بیٹھا ہے۔ میرا نمبر آیا ہے تو انھوں نے دو انگلیاں میری نبض پر رکھیں اور حال پوچھے بغیر دو بار 'پڑپچ پڑپچ' کر کے نسخہ نویس سے کچھ بُدبُدائے۔ لیجیے نسخہ تیار تھا۔ شفیق صاحب نے لپک کر نسخہ لے لیا اور باہر نکل کر دوا خریدنے کے لیے سامنے 'ہندوستانی دواخانہ' پہنچے۔ ایک شربت تھا، ایک معجون تھی، مغلظ جواہر والی اور آخر میں ایک اور دوا جس کے بارے میں شفیق صاحب کا اصرار تھا کہ یہ رہنے دی جائے۔ میں جس قدر اس کے بارے میں دریافت کرتا وہ ٹالنے کی کوشش کرتے۔ میں نے بحث بھی کی کہ آدھے نسخے سے کیا فائدہ ہوگا۔ وہ کچھ شرماتے جاتے مگر خریدنے پر تیار نہ ہوئے۔ بعد کو میں نے معلوم ہی کر لیا، یہ عضوِ خاص کے لیے 'طلا' تھا۔ گویا حکیم صاحب نے میرا مرض 'جلق' تجویز کیا تھا۔ اس کے بعد سے طبِ یونانی سے میرا اعتقاد بالکل اُٹھ گیا۔

ڈھاکے میں پڑھنے سے جب تھک جاتا تو دھان کے لہلاتے کھیتوں میں گھومنے نکل جاتا۔ ڈوبتے ہوئے سورج اور اس کی کرنوں سے رنگی ہوئی بدلیوں کو گھنٹوں بیٹھا دیکھتا رہتا۔ میری عمر اس وقت سترہ برس کی تھی وہ عمر جس میں کسی شے کی ہر شے میں تلاش ہوتی ہے

ع یعنی ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

بنگال کے حسنِ ملیح پا زلفِ سیاہ پر کہیں نظر پڑ جاتی تو اسی سے لطف اندوز ہوتا۔ تسکین کی عدم دستیابی میں ذوقِ نظر اور بڑھ جاتا۔ میرا رپورتاژ 'روپ بنگال'، جو میں نے اس کے دس برس بعد لکھا، ہرگز نہ لکھا جاتا اگر اس کی مادّی بنیاد وں کا میں نے اس دور میں مشاہدہ نہ کیا ہوتا۔ اس کے اقتباسات یہاں دینا اس لئے ضروری ہیں کہ انھیں پڑھتے وقت میں عمر کے فاصلے طے کر کے ایک بار پھر 'بنگلہ دیس' پہنچ جاتا ہوں۔

بنگلہ دیس

کس جادوگر کا یہ گھر ہے؛
بنگلہ دیس اک رنگ بھَوَن!
گھنے گھنے بانسوں کے جنگل
ہرے بھرے سب کھیت اور بَن
کرشن برَن سے بھی کچھ گہری
جس کی دھرتی اور گگن

روپ اَنیلا نیلا نیلا
اور ندیوں کی روپہلی باہیں
اُجلی اُجلی پھیلی راہیں
ڈالی ڈالی میں آ رِنگن
سوتی لتاؤں میں ہوتی کانا پھوسی سی
پھول بنوں میں یہ چِھٹکی چھٹکی سی پھبن

دیس بھی نیلا، بھیس بھی نیلا
پھولوں کی خوشبو سے بوجھل
مند ہوا کا آنچل
دھان، دھنک اور ساگر جَل تھَل

پَوَن کے جھونکے ہانپتے پھرتے
وہ ٹوٹا سا چاند کا درپن!

سارے دیس پہ اک دھانی آنچل سا پھیلا
ایک اُداسی، ایک اُداہٹ
اک سپنا سا، ایک نشہ سا
کھُلے کھُلے سارے بندھن!

اُودی اودی نیلی گھٹائیں
دھان کی ہر بالی دُوسری بالی سے
کان میں کچھ چپکے سے کہتی،
کھیتوں کی کوروں سے لگ کر
دور پہ وہ اک ندّی بہتی
دھیرے دھیرے،
اک سپنا سا بہہ نکلا ہو
رادھا کی آنکھوں سے جیسے!

اِک سویا سا دیس!
نیند کی ماتی جس کی ندیاں
چُپ چُپ روئیں، غم کو سہنیں، بہتی جاتیں
درد بھری سی، دھیرے دھیرے چلتیں مری سی
نیَن میں دکھ کو گھولے
جی میں لاکھوں پھپھولے
ملن کی آس لئے چلتی ہیں، ہولے ہولے

- - - - - - - - - - - - - -

یہاں کی ہر ڈالی پچکیلی

پھول بھی جیسے نیند کے ماتے
چاند بھی چپ، تارے بھی چپ چپ
کرم سے سب انجان
پریم سے سب بے جان

اِس بِھٹکے آکاش کو دیکھو،
دیکھو! تاروں کی وہ آنکھیں،
اپنی کرنوں کی پلکوں سے
دھیرے دھیرے، اَن تھک، اَن تھک،
نت بُنتیں سپنوں کے جال!
ہے دُکھ سے بھرپُور یہ دیس!
دُکھ بھری آہیں ہر جھاڑی میں
کمل کمُھلائے، بادل چھائے
پریم کی پیر سے ڈھیلا انگ ہے
سوئی سوئی من کی ترنگ ہے
کرم کا پریم سے کیا سنجوگ
پریم تو بنگلہ دیس کا روگ!

بنگلہ دیس تو پریم کی بھومی، راگ کی بھومی، رنگ کی بھومی ہے۔ بنگلہ دیس کی یہ سرزمین یادوں کے ان سینکڑوں رنگین ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائی گئی ہے جو میرے حافظے میں محفوظ رہ گئے تھے۔ کچھ یہی حال 'روپ' کا ہے جو بے شمار روپوں کا بہروپ ہے:

روپ

مَنجُل وہ بنگال کی بالا
جس کے روپ انوپ کے کارن

بنگلہ دیس ہے کرشن بَرَن !

وہ بھتی نیلے دیس کی سندری

اُس کا جوبن ــ

کالے کیس، کلس اور کاجل

جامنی ہونٹ رسیلے،

نَین ہٹیلے،

ڈھیلا انگ ــ بدن کی رنگ ترنگ آبی ساری... چھب رہی تھی '

مہک وہ کیسر تن کی! ہوش اُڑا دے

آنکھیں! رنگ کی اک پچکاری

جیسے دن سے آنکھ مچولی!

کھیلتی ہو اندھیاری!

بنگلہ دیس کی سندر بالا

اس کے گلے میں

کومل کملوں کی اِک مالا

انگ انگ میں چہکار

آنکھوں میں اک اُلجھی بولی

مُکھ میں بھری ہوئی جھنکار

ڈھلا ڈھلایا روپ

جیسے چاند کی دھوپ

یا جیسے سنگیت

کوئی مسعود کا گیت !

کالے کیس، جھکی جھکی ساون کی گھٹائیں

نپی تُلی مُسکان، بنی ہوئی انجان

پون سی ڈولتی پھرتی اِدھر اُدھر

وہ —

شام کی پلکوں میں سوتی تھی

شبنم سے مُنہ کو دھوتی تھی

لہروں سے نِت کھیل تھا اُس

چڑیوں سے کچھ میل تھا اُس کا

خوشبو پیتی، ہنس ہنس جیتی،

لے کر من میں پریم کی اُلجھن

پلکوں کی جھالر سے کچھ موتی برساتی

متوالی، نیلم پیالی سے مد چھلکاتی

ایک کلی جو ——

بادلوں کے سایوں میں پل کر

نکھر اُٹھتی ہو

راگ کی آگ تھی جس کے من میں

دُھلی دُھلی نتھری سی آنکھیں

تیکھے چتون — جن میں تھا اک نرم لچاؤ

چاہت، چاہ، چہل اور چاؤ

اُچپل، چنچل، ایک سبھاؤ

ٹھمک ٹھمک اٹھکیلیاں کرتی

چال میں نرت کے بھاؤ!

کھیلتی تھی کانن کانن میں
پھولوں کے کچھ سُندر کھیل
کیول کلیوں سے تھا میل ۔
آنکھ نشیلی، بات رسیلی
آنکھیں! جن میں لاکھوں سپنے
ساگر، لہریں، جھیلیں — اُودی گھٹائیں
رادھا کرشن کی آنکھ مچولی!

دھانوں کے کھیتوں کی روح، مہک رہی تھی
بانسوں کے جنگل کی بالا، چہک رہی تھی
پریم کا اَمرت پی پی کر وہ پلی بڑھی
اس کے دل میں بند کلی کا راز!
بول سُریلے، پریم اتھاہ!!

اِس روپک میں اقبال اور ٹیگور کے فلسفے کی آمیزش بعد کی چیز ہے، لیکن 'دیس' اور 'روپ' کا تمام تر پس منظر میرے قیام ڈھاکہ کی کمائی ہے۔

میرے شعری تجربے کا یہ پس منظر 'دیس' اور 'روپ' تک محدود نہیں۔ اس روپک کے دوسرے 'کینٹو' 'ایک شام' 'بانسوں کے جنگل میں' اور 'آموں کے کنج میں' بھی دیکھا جا سکتا ہے، جہاں بنگالن لڑکی 'منجل' 'افغانی' کو لے کر گھومتی ہے اور دونوں اپنے مکالموں کے ذریعے زندگی کے دو مختلف فلسفوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ 'منجل' ٹیگور کی ویدانتی فکر 'وحدت وجود' کی نمائندہ ہے اور 'افغانی' اقبال کے فلسفۂ خودی کا۔ میرے لیے 'منجل' کی تجسیم دشوار ہے لیکن 'افغانی' میں غیر شعوری طور پر 'منم' کی کارفرمائی ہو سکتی ہے۔ یہ 'روپک' میں نے اس زمانے میں لکھا گیا جب تقسیم کا آرا سروں پر چل رہا تھا۔ اپنے مجموعۂ کلام 'دو نیم' کے پہلے ایڈیشن میں (١٩٥٢ء) میں نے روپک کو بغیر کسی تشریحی نوٹ کے شائع کیا تھا، بخوف متر مادل

نے شاہراہ میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس بات پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ ہمارے شاعر کو کم از کم اس وقت تو پریم کے گیت نہیں گانا چاہیئے تھا۔ چنانچہ دوسرے ایڈیشن (۱۹۸۶ء) کو شائع کرتے وقت 'روپ بنگال' کے لیئے مجھے یہ تشریحی نوٹ لکھنا پڑا:

"روپ بنگال" (۱۹۷۰ء) ایک ایسے عالمِ کرب و ضرب کی یادگار ہے، جب ہر شے 'دو نیم' نظر آرہی تھی۔ ایک تاریخ ——— اور ایک تہذیب کے دو ٹکڑے ہو رہے تھے۔ سیاست کی موجِ خوں سے بہت دور روشنی کے صرف دو مینار سہارا بنے ہوئے تھے۔ ایک ٹیگور کا بے خودی کا ویدانتی تصور اور دوسرا اقبال کا اثباتِ ذات کا فلسفۂ خودی۔ اس روپک میں 'افغانی' جو حیات و حرکت کا پیکر ہے، اقبال کی فکر کا ترجمان ہے۔ بنگالی لڑکی 'منجل' ٹیگور کی ویدانتی فکر کی نمائندہ ہے۔ بنگال کے مختلف مناظر میں یہ ساتھ ساتھ گھومتے ہیں اور مصروفِ گفتگو نظر آتے ہیں! افغانی 'وجود' کا سبق پڑھاتا ہے۔ منجل، وحدتِ وجود کا۔ دونوں کی راہیں مختلف ہیں۔ شاعر نے اپنی ترجیح کے مطابق اس کا حل آخری 'کینٹو' "آموں کے کنج" میں پیش کیا ہے۔ مجھے اس بات کا افسوس رہا کہ 'دو نیم' کے پہلے ایڈیشن پر تبصرہ کرنے والے ناقد اس 'روپک' کی تہ تک نہ پہنچ سکے ع

آشکارم دیدہ پنہانم ندید

بہرحال یہ 'روپک'، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسکول کے طلبہ نے (۱۹۷۵ - ۷۷ء) کے درمیان کئی بار ڈاکٹر ترنگ کی ہدایت کاری میں اسٹیج کیا۔ مبصرین کا خیال تھا کہ تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھتا ہے، البتہ اسے ایک افتتاحیہ کی ضرورت تھی جو اب فراہم کر دیا گیا ہے۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے ڈھاکہ کے چار سالہ قیام میں 'معاشرتی حقیقت' کی طرف سے میری آنکھیں زیادہ تر بند رہیں۔ سیاسی اعتبار سے میں بنگالیوں کی دہشت پسندی سے، یہ تقاضائے عمر متاثر تھا لیکن سوائے چند انقلاب پسند دوستوں سے گفتگو کرنے کے، اور کسی چیز کا مرتکب نہ ہو سکا۔ البتہ اس بات کا شدید احساس تھا کہ بنگالی مسلمان

وہاں کے ہندوؤں کے مقابلے میں ہر اعتبار سے پس ماندہ ہے۔ اسلام پورہ کے کچھ "مار پچھلے دیموں دربار کے پھینک ددں گا" قسم کے دادا لوگوں کے علاوہ جسمانی اعتبار سے بھی وہ ہیٹے تھے۔ تعلیم میں تو وہ بہت پیچھے تھے ہی، صنعت و تجارت میں بھی ہاتھ کی دستکاری اور چھوٹی دوکانداری کے علاوہ کچھ نہیں کرتے تھے۔ صرف نوابانِ ڈھاکہ کا خاندان تھا جو اُن کی سیاسی زندگی کا محور تھا' لیکن خود اُن کا وجود تاجِ برطانیہ کا مرہونِ منت تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب اسلام کے نام پر پاکستان وجود میں آیا تو چند سال کے لیے ایسا معلوم ہوا کہ نئی قومیت ایک مذہبی اساس پر تعمیر کی جا سکتی ہے۔ میں ذہن کے تعمیری دور میں ڈھاکہ میں رہ چکا تھا۔ اس لیے میں نے اِس نئی قومیت کو ہمیشہ مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ بنگالی مسلمان اور پنجابی مسلمان میں سوائے مذہب کے اور کوئی قدرِ مشترک نہیں تھی۔ قومیت کے دوسرے عناصر ترکیبی، مشترک جغرافیائی حدود، مشترک تہذیب، مشترک معیشت اور مشترک زبان بالکل مفقود تھے۔ مفکرِ اسلام لاکھ کہا کریں ع

نوائے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بے کراں ہو جا

بنگالی مسلمان دیندار ہوتے ہوئے دین کے نام پر اپنی انفرادیت کو پاکستان میں مکمل طور پر ضم کر دینے کو تیار نہیں تھا۔ اردو کے مقابلے میں اسے اپنی بنگالی عزیز تھی۔ ٹیگور اور نذرُل کے نغموں کا جو بچپن سے دلدادہ رہا وُہ اقبالؔ اور جوشؔ کی شاعری کی داد کس طرح دے سکتا تھا۔ آخر آخر میں 'حروف القرآن' کے حوالے سے بنگالی کے لیے اردو رسم خط اختیار کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق بھاتے گئے "اسلام کی جوئے شیر کے کوہ کن" سید سلیمان ندوی آیاتِ قرآنی پڑھتے ہوئے پہنچے لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ قائداعظم کے عین اعلان کے وقت کہ "اردو اور صرف اردو نئی مملکت کی قومی زبان ہو گی" شیخ مجیب کی قیادت میں بنگال کے طلبہ نے "بنگالی زندہ باد" کے نعرے لگائے۔

میں نے اسی احساس کے پیشِ نظر یکم ستمبر ۱۹۷۱ء کے ہماری زبان میں آخری صفحہ کے تحت 'کفارہ' کے نام سے یہ الفاظ لکھے تھے:

"مشرقی و مغربی پاکستان کا موجودہ المیہ، سیاسی و معاشی ہی نہیں،

ایک سانحہ واقعہ ہائلہ بھی ہے۔ میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اس المیہ کے ستم گر اردو زبان سے منسوب ہیں"۔

رشید احمد صدیقی صاحب کے یہاں اس مضمون کا ردِ عمل یوں ہوا:

" اردو والے جس طور پر اردو کو ایک غیر رضامند طبقے یا خطّے پر تھوپنا چاہتے (اور) بنگالی کو بے حیثیت کرنا چاہتے تھے اس کو میں کب پسند کرتا ہوں۔ ایسوں کی مخالفت میں آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اپنی جگہ پر بالکل درست ہے لیکن آج کل جن حالات کا سامنا ہے اس میں نہ کہتے تو بہتر تھا"۔

خواجہ غلام السیّدین صاحب کا اس مضمون کو پڑھ کر جو اچانک مراسلہ ملا" اس کا لہجہ اس سے بالکل مختلف تھا

عزیزی التسلیم

" میں نے یکم ستمبر " ہماری زبان میں آپ کا مضمون کفارہ" پڑھا۔ مجھے مضمون اور اس کا طرزِ بیان دونوں بہت پسند آئے۔ بات کہنے کی تھی اور خوشی ہے کہ اس کو آپ نے مضبوطی اور سلیقے سے کہا"۔

مخلص، غلام السیّدین

بنگالی زبان کی محبت نے مشرقی پاکستانیوں کو حیاتِ نو بخشی۔ ڈھاکہ کے "شہید مینار" کی قیمت دے کر انھوں نے بنگالی کے مساوی حق کو منوایا اور جب بات یوں بھی نہ بنی تو آزاد بنگلہ دیش کی تحریک کا آغاز ہوا۔

میری بنگلہ دیش کی تفہیم اپنے نوجوانی کے تجربات کی بناء پر کچھ اسی انداز کی تھی۔ بنگالی مسلمان اپنی زبان کے سلسلے میں ظرافت تک برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ اس کا مجھے اندازہ برسوں پہلے اس وقت ہوا تھا جب میں نے پیامِ تعلیم میں "بنگالی بابو" کے عنوان سے یہ مزاحیہ نظم بچوں کیلئے شائع کی تھی۔

بُونگالی بابو

ہام ہے اِک بُونگالی بابو
ٹوٹی پھوٹی زانتا اُردو
پھر بھی تم سے ہم بولے گا
بنگلہ بولی ہم کھولے گا
اُردو کیا اِک بولی ٹھولی
بنگلہ اِک رشُ گُلّا بولی
کیا ہے گولیب کیا ہے اِکبؔل
دیکھو ٹھاکر دیکھو نجرُؔل
بنگلہ دیش کی بات ہی آرہے
شُندر لوگ ہے شُندر گھار ہے

مزاح کی یہ کوشش سروں پر سے گزر کر میرے ہی سر آ پڑی، اور کلکتہ کے کئی اخباروں میں اس کے خلاف خوب خوب خامہ فرسائی ہوئی۔

ڈھاکہ دوسری بار میں مَیں ۱۹۷۶ء میں ایک سرکاری ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے گیا تھا۔ بنگلور انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کے ڈاکٹر راؤ میرے رفیقِ سفر تھے۔ ہم لوگ رَمَ کے علاقے میں ایک بڑے ہوٹل میں مقیم تھے۔ ڈھاکہ کو بالکل بدلا ہوا پایا۔ خیر یہ تبدیلی تو ہر بڑے شہر کا مقدر ہو گئی ہے۔ سب سے بڑی تبدیلی بنگالی مسلمان کی نفسیات میں پائی۔ خود اعتمادی کے ساتھ اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کا شدید جذبہ ملا۔ ہر اردو بولنے والا اب بھی وہاں بہاری کہلاتا ہے۔ ان کے مسئلے کے باوجود اردو سے عناد ختم ہو گیا ہے۔ بنگلہ دیش اب اپنے وجود پر پیچ و تاؤ کھا رہا تھا۔ وہ کس قدر اسلامی رہے

اور کس قدر بنگالی۔ مغربی بنگال سے شناخت کے لیئے وہ اسلام کا سہارا لے رہا تھا۔ ٹیگور اسے عزیز تھا لیکن ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں مغربی بنگال کے بنگالیوں کو۔ ٹیگور کی فکر کا بہت بڑا حصّہ عام مسلمان بنگالی کے لیئے کوئی کشش نہیں رکھتا تھا۔ میں نے بنگلہ دیش کے بہت سے دانشوروں سے اِس بارے میں گفتگو کی، کسی کا بھی ذہن صاف نہیں پایا۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔

طویل عرصے کے بعد ہمدمِ دیرینہ ہائی اسکول کے ہم جماعت، نورُالدّین سے ملاقات ہوئی۔ وہ اب ڈھاکہ یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔

چوتھا باب

مرحوم دہلی کالج

مسوری سے واپس آکر دو سال تک میرا قیام بڑے چچا (ڈاکٹر ذاکر حسین) کے ساتھ قرول باغ میں رہا جہاں وہ جامعہ کے قریب کرائے کے ایک مکان میں مقیم تھے۔ میں نے اب اینگلو عربک کالج (مرحوم دہلی کالج) کے بی۔ اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ یہ کالج اپنی پرانی عمارت غازی الدین حیدر کے مدرسے میں اجمیری گیٹ کے پاس واقع ہے ۱۹۴۷ء کی غارت گری کے بعد اس کا احیاء دہلی کالج کے پرانے نام سے کیا گیا۔ چند سال قبل اس کا نام پھر بدل کر ذاکر حسین کالج کر دیا گیا۔ میں جامعہ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے اس وقت کالج کی سوسائٹی کا صدر تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ خورشید عالم خاں صاحب کے اشارے پر جب اس کا نام بدلنے کی تجویز پیش کی گئی تو مفتی عتیق الرحمٰن نے جو مجلس کے رکن تھے، یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی تھی کہ ذاکر صاحب کے نام پر تو اور بڑی عمارتوں اور سڑکوں کے نام رکھے جا رہے ہیں، دہلی کالج کے نام سے اہلِ دہلی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں اس لیے اُسے اسی طرح رہنے دیا جائے تو بہتر ہے۔ میرا خیال تھا کہ مفتی صاحب کی رائے نہایت صائب تھی لیکن صدرِ مجلس کی حیثیت سے میرا خاموش رہنا ہی اَولیٰ تھا۔ بہرحال خورشید عالم صاحب کی اس درپردہ دھمکی کی وجہ سے کہ شاید اندرا گاندھی کالج کا نیا ٹرسٹ، نام کی تبدیلی کے بغیر بنانے پر آمادہ نہ ہوں، کالج کا نام بدل کر ذاکر حسین کالج کر دیا گیا۔ اس طرح دہلی کالج دو بار مرحوم ہوا۔ اس کے اینگلو عربک کالج نام سے تو میری طبیعت بھی منغّض رہا کرتی تھی۔ بہرحال بی۔ اے میں میں اسی

کا طالب علم رہا۔ بی۔ اے۔ میں میں نے تاریخ اور فارسی اختیاری مضامین کے طور پر لئے تھے۔ انگریزی، اُردو لازمی تھے۔ انگریزی، کالج کے انگریز پرنسپل مسٹر واکر اور ایک اسکاچ مسٹر ٹوری مَر پڑھاتے تھے۔ ٹوری مَر کا پڑھایا ہوا تو وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے، لیکن واکر صاحب بہت اچھے منتظم اور اُستاد تھے۔ شام کو کالج کے طالب علموں کے ساتھ ٹینس کھیلتے اور انگریزی تحفظاتِ ذہنی کے باوجود کسی چرچ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے طلبہ سے ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے۔ وہ جوہر شناس بھی تھے۔ میرا ٹیوریل کلاس اُن کے پاس تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کے لیے ایسے مضامین لکھے جائیں جن میں طالب علم کو بطور خود سوچنا پڑے۔ میں ان کے اس معیار پر پورا اُترا تو ڈاکٹر ذاکر حسین سے ایک ملاقات میں ذکر کیا اور کہا "مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ مسعود میں اپنے طور پر سوچنے کی صلاحیت ہے۔" میرے دوسرے اساتذہ میں قابلِ ذکر آفتاب صاحب تھے جو تاریخ پڑھاتے تھے، علی گڑھ سے ایم۔ اے کیا تھا۔ ہم لوگ نہ صرف اُن کی شخصیت سے متاثر تھے بلکہ طریقۂ تعلیم سے بھی۔ اُن سے سینیر چشتی صاحب تھے جو اُس وقت انگلستان گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر کچھ عرصے تک انھوں نے بھی ہماری کلاسیں لیں لیکن اُن پر انگلستان اور وہاں کی زندگی کی یادیں ایسی حاوی تھیں کہ اُن سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ البتہ ان کا انگریزی کا تلفظ بہت اچھا تھا، چہرہ مہرہ بھی سرخ سفید تھا۔ جب اس پر بحث ہوتی کہ کس کی کرامات، ہے تو میں باصرار کہتا کہ 'غازہ' کی تو بہرحال نہیں ہو سکتی۔ ذاکر کے بڑے عقیدت مندوں میں تھے اور جب جامعہ قرول باغ سے اوکھلا آگئی تو وہاں بھی اُن کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اکثر چھٹی کے دن آن دھمکتے اور قیام (بعدہٗ طعام) کا سلسلہ شام تک رہتا۔ ذاکر میاں اُن کی اِس بے تحاشا عقیدت سے عاجز تھے لیکن اپنی عادت کے مطابق کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ اتفاق سے ۱۹۴۷ء میں ایکدم پاکستان وجود میں آگیا اور چشتی صاحب ان لوگوں میں تھے جنھوں نے پر پرواز سب سے پہلے کھولے۔ بعد کو ایک دن ذاکر میاں کو یہ کہتے سُنا کہ بھئی پاکستان بننے سے ہمیں بھی ایک فائدہ ہوا اور وہ یہ کہ چشتی صاحب سے نجات مل گئی۔

فارسی کے اُستاد منظور حسین موسوی تھے۔ فقرے بازی، باتوں کے رسیا اور دبنگ، مجال کیا کہ کوئی کلاس میں دم مار سکے۔ ایک ہی فقرے میں چِت کر دیتے تھے، لیکن وہ بھی عاجز

تھے ہمارے ایک رنگروٹ ساتھی (نام ؟) سے جن کی سمجھ میں شعر بالکل نہیں آتا تھا۔ چنانچہ جب عُرفی یا نظیری اپنے قصائد میں محبوب کا سراپا بیان کرتے (جس میں زلفوں کو مارِ سیاہ، دانتوں کو موتیوں کی لڑی، گردن کو صراحی، بھنووں کو کمان، مژگاں کو تیر اور کمر کو معدوم بتاتے تو یہ حضرت مسلسل مسکراتے رہتے۔ موسوی صاحب کنکھیوں سے اُن کا مسکرانا دیکھتے رہتے اور اچانک بول اٹھتے۔ دیکھئے حضرت! اب یہ آپ ہی سے کسی نہ کسی سے ضرور پوچھ بیٹھیں گے کہ تم ایسی محبوبہ سے شادی کرنا پسند کروگے اور کلاس کے بعد واقعی ایسا ہی ہوتا!

موسوی صاحب کی مرزا محمود بیگ صاحب سے گہری دوستی تھی۔ مرزا صاحب خاص دِلّی وال، تھے اور کالج میں فلسفے کے اُستاد تھے۔ عمر بھر تجرّد میں گذاری۔ اس لیے وہ ہر فقرے پر سوچ میں ڈوب جاتے تھے۔ گفتگو کی اِس سُست روی کو وہ پھر ایک بے ساختہ قہقہے کے ذریعے تیز رفتار بناتے۔ میں اُن کا شاگرد نہیں رہا لیکن کالج سے نکلنے کے بعد مختلف حالات میں اُن سے قریب تر ہوگیا۔ یہ اپنے کالج کے شیدائیوں میں تھے جس کے بعد کو پرنسپل بھی ہوگئے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا اور تدفین کے لیے جامعہ ملیہ کے قبرستان لائے گئے تو موسوی صاحب جنازہ کے ساتھ تھے۔ اس وقت تک وہ بہت کمزور ہو چکے تھے۔ ایک عزیز دوست کی جدائی سے اور نڈھال نظر آئے۔ آکر پاس کی ایک پختہ قبر کے کنارے پر بیٹھ گئے، میں بھی ان کے پاس بیٹھ گیا اور غالبؔ کی طرح محسوس کرنے لگا ع

اب وہ رعنائی خیال کہاں؟

بی۔ اے۔ کے میرے دوستوں میں حبیب اللہ خاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے والد چودھری اللہ دیا ایک رانگڑ راجپوت تھے جنھوں نے ٹھیکیداری میں خاصا کما لیا تھا اور ایک پختہ دو منزلہ قرول باغ میں بنوا لیا تھا۔ حبیب اللہ خاں میں ایک عجیب راجپوتی شان تھی۔ ہمیشہ سینہ سپر رکھتے، یہاں تک کہ سائیکل پر بھی اُن کی یہی کوشش رہتی۔ والد نے طالب علمی کے زمانے میں شادی کر دی تھی جس سے وہ مطمئن و مسرور نظر آتے تھے جیسا کہ ان کے گھریلو تذکروں سے ظاہر ہوتا تھا۔ اس اعتبار سے میں ابھی تک 'بیرونِ قلعہ' کی مخلوق تھا لیکن حبیب اللہ کی متاہلانہ زندگی کی آسودگی سے متاثر تھا اور زندگی کے کسی ہم سفر اور ساتھی کی

تلاش کی خواہش دل میں پیدا ہونے لگی تھی۔ ہم دونوں کبھی کبھی سینما بھی جاتے تھے۔ ان دنوں دیویکا رانی اور نسیم پردۂ سیمیں کی رانیاں تھیں۔ حبیب اللہ سے میں اکثر مشورہ کرتا کہ میں کس جیسی کا انتخاب کروں، اس لیے کہ خاندان میں دو لڑکیاں تھیں جوان دونوں کی شکلوں سے مشابہت رکھتی تھیں۔ حبیب اللہ کا مشورہ دیویکا رانی جیسی کا ہوتا۔ میں نے بالآخر نسیم جیسی کا انتخاب کیا۔

ایک اور ساتھی جن کے دماغ میں کچھ سنک تھی (اور اب بھی ہے) انعام الحق تھے ان کا شمار اچھے طالب علموں میں ہوتا تھا۔ دوستی کے لیے میں انھیں زیادہ معتبر نہیں سمجھتا تھا۔ علی گڑھ سے انھوں نے انگریزی میں ایم۔اے کیا اور اس کے بعد زمانے میں گم ہو گئے۔ دو برس پہلے جب میں ایک ثقافتی ڈیلیگیشن کے رکن کی حیثیت سے پاکستان گیا اور لاہور الحمرا میں منعقد کی گئی ایک تقریب کے بعد ڈاکٹر سید عبداللہ سے محو گفتگو تھا کہ اچانک ایک گورے اور دراز قد شخص نے میرا بازو پکڑا اور دور تک کھینچتا لے گیا، پھر آنکھوں میں اپنی نیلی آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ پہچانا؟ مجھے انھیں پہچاننے میں مشکل سے ایک منٹ لگا ہوگا، البتہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے پاس سے یوں کھینچ کر چلے آنا مجھے کسی قدر ناگوار گزرا۔ میری اُن سے یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ میں نے کہا "ہاں پہچان لیا، تمھاری صورت سے نہیں تمھاری حرکت سے" معلوم ہوا کہ وہ اس وقت اقبال پبلک لائبریری، لاہور کے ڈائریکٹر ہیں۔ پکڑ کر لائبریری لے گئے، جو قریب تھی، پھر اصرار تھا کہ اس کا ہر گوشہ اُن کے ساتھ گھوموں۔ میں نے ایک شیلف پہ رکھی ہوئی کچھ کتابیں دیکھیں۔ بعض سے دلچسپی کا اظہار کیا۔ جب میں کئی گھنٹے گزارنے کے بعد وہاں سے رخصت ہوا تو میری پسندیدہ کتابوں کا ایک بنڈل میرے ساتھ تھا۔ میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "انعام الحق! اب تم سمجھدار ہو گئے ہو"۔

ایک اور ساتھی محمود علی تھے۔ وہ فلسفے کے طالب علم تھے۔ چنانچہ علی گڑھ پہنچ کر انھوں نے فلسفے میں ایم۔اے کیا۔ اس فلسفے دانی کا بُرا ہو کہ پہلے وہ وزارتِ تعلیم میں گھس گھس کرتے ڈپٹی سکریٹری ہو گئے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد سید حامد کی وائس چانسلری میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار کی حیثیت سے کچھ عرصہ کام کیا لیکن زیادہ نہیں

ٹھہر سکے۔ اُن کے متانت، خلوص اور دیانت کے ہم سب قائل رہے۔

بی۔اے۔ کے دوران مجھے پہلی بار ذاکر میاں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس سے قبل میں نے جامعہ میں چھ سال بورڈنگ ہاؤس میں گزارے تھے۔ اب اٹھتے بیٹھتے چوبیس گھنٹے کا ساتھ تھا۔ اس وقت وہ تنگ دستی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان کا گھر صرف چچی صاحبہ (شاہ جہاں بیگم عرف پتلی بیگم) کی سلیقہ مندی کی بدولت چل رہا تھا۔ گھر کے سامنے ششبا بنیئے کی دوکان تھی جہاں سے اکثر سودا اُدھار آتا تھا۔ یہ ششبا اس وقت حیات تھا جب ذاکر میاں وائس پریسیڈنٹ ہو کر ۱۹۶۲ء میں بہار سے دہلی آئے، وہ اُن سے ایک بار آکر ملا بھی۔ دونوں کے درمیان کیا گذری یہ معلوم نہیں۔

اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ مجھے اُن کے یہاں ایسے حالات میں جا کر نہیں پڑ جانا چاہیئے تھا۔ لیکن میرے اس فعل سے اُن کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔ چچی صاحبہ جو پکاتیں وہ سب کھاتے۔ دونوں بچیوں ــــ سعیدہ اور صفیہ ـــ کے کھانے پہننے کے لیئے کوئی خاص اہتمام نہیں تھا۔ انھوں نے بھی بچپن میں سادہ کھایا اور موٹا پہنا۔ چچی صاحبہ بڑی خوش دلی کے ساتھ کھانا پکاتیں۔ اُن کے اِس سادہ کھانے میں۔ ایک گوشت کا سالن اور ایک دال، جو مزہ ملتا تھا وہ کہیں نہیں ملا۔ باورچی خانے میں بیٹھ جاتا۔ وہ گرم گرم روٹیاں پکاتی جاتیں اور میں کھاتا جاتا۔ ذاکر میاں بھی اسی غذا پر مطمئن تھے۔ البتہ جب جرمن خاتون مس فلپس بورن جو ساری جامعہ کی آپا جان تھیں، جامعہ آگئیں تو ان کے یہاں جا کر منہ کا مزہ بدل لیتے۔ ان کی زندگی بھی اس شعر کے مصداق تھی ؎

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

کبھی کبھی وہ گھر آکر میرے توسط سے چچی صاحبہ سے گفتگو کا سلسلہ چھیڑتیں اور بتاتیں کہ ذاکر صاحب قوم کے لیئے بہت بڑا کام کر رہے ہیں، ہم سب کو ان کی مدد کرنا چاہیئے، تو چچی صاحبہ نہ معلوم کس جذبے کے تحت کہتیں "چل جھوٹی کہیں کی"۔ اسے میں انگریزی میں ترجمہ نہ کر پاتا۔

میں نے 'آپا جان' کو آخری بار بستر مرگ پر ڈاکٹر جوشی کے اسپتال میں ۱۹۶۳ء میں دیکھا۔ اس وقت جو میرے تاثرات تھے وہ اس گیت میں ڈھل کر نکلے۔

ہچکولے

وشن چندر ا

میں اِک گہرا ساگر!
جس کے سینے پر کچھ لہریں
(من کی ترنگیں)
بن، بن، ہنس ہنس کھیلیں
مٹ جانے کو!

چوم سکیں یہ چاند کو کیسے
اُچھل اُچھل کر
اُٹھیں پل پل
کیول
گر جانے کو

کایا سے جب چھو نہیں پاتا
دور رہو تم
لے کر چاہ ــــ اتھاہ تمھاری
ہو جاتا اپنے میں گُم
میرے سینے میں پھر تُم!!
(۱۹۶۳ء)

اِس زمانے میں مَیں نے ذاکر میاں کا جمال اور جلال دونوں دیکھے۔ جمال کی شہادتیں تو بہت سی مل جائیں گی، البتہ جلال کا ایک واقعہ سُناتا چلوں۔ گھر میں اوپر کے کام کے لئے ایک چھوٹا سا لڑکا لطیف مُلازم تھا۔ وہ شرارت کی پُڑیا تھا۔ کسی وقت نچلا نہیں بیٹھتا اور کوئی نہ کوئی حرکت کئے جاتا۔ نہ تو اس پر چچی صاحبہ کی لاگ ڈانٹ اثر کرتی اور نہ میرا یا کسی اور کا بُرا بھلا کہنا۔ ایک دن اُس کی اس قسم کی حرکت کی شکایت ذاکر میاں کے کانوں تک پہنچی، عرصے سے اُس کی شرارتیں دیکھتے اور سُنتے آئے تھے۔ ایک دم جلال میں آگئے اور کہا لاؤ آج اِسے مَیں ٹھیک کروں گا۔ گھر میں ایک بڑا گہرا کھاری پانی کا کنواں تھا۔ اس پر ڈول رسی پڑے رہتے تھے۔ فوراً رسی کا ایک سِرا لیا اور اس سے لطیف کی کمر اور ہاتھ جکڑ دیئے۔ اس کے بعد ڈول کی مانند اسے کنوئیں کے اندر سَرکانا شروع کیا۔ لطیف کی سینکڑوں چیخیں تھیں۔ گھر میں ہل چل مچ گئی۔ چچی صاحبہ سہم گئیں کہ اگر کچھ ہو گیا تو —— بہرحال بڑی بڑی مشکلوں سے ذاکر میاں کو رضامند کر لیا گیا کہ اس بار چھوڑ دیں۔ لطف یہ تھا کہ جو ہر وقت شکایتیں کرتے تھے اب رگڑ رگڑ اکر سفارشیں کر رہے تھے۔ خدا خدا کر کے لطیف کو کنوئیں سے باہر کھینچا گیا۔ کنوئیں سے وہ ایسے 'غسلِ اصلاح' کر کے نکلے کہ اس کے بعد پہچانے ہی نہیں جاتے تھے کہ یہ وہی لطیف ہیں۔ پھر تو ہر ہر قدم پر 'جی حضور' اور 'جی ہاں' تھے۔

ذاکر میاں کا زیادہ وقت جامعہ کے دفتر اور اس کے مختلف کاموں میں گھر سے باہر گزرتا۔ مکان پر جو خالی وقت ملتا وہ مکان کے سب سے چھوٹے کمرے میں لیٹ کر گزارتے اور کچھ پڑھتے رہتے۔ میں نے انھیں اکثر غالب اقبال یا کسی فارسی شاعر کے اشعار گنگناتے سُنا۔ انھیں وہی اشعار پسند تھے جو خود ان کی زندگی کے ترجمان تھے۔ اس اعتبار سے اقبال ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ وہ بنیادی طور پر جمالیات، اخلاقیات اور شعر کے آدمی تھے۔ معاشیات سے، جو اُن کی اعلیٰ تعلیم کا مضمون رہا تھا، دور ہو چکے تھے۔ ان کے اردگرد بہت کم کتابیں دیکھنے میں آتیں اور جو تھیں ان کا معاشیات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ قرول باغ کے اِس مکان میں نہ تو گلاب تھے، نہ سبزہ و گل اور نہ گملے نہ تصاویر۔ البتہ خطاطی کے چند دل آویز نمونے ضرور آویزاں رہتے تھے۔

ذاکر میاں کی زندگی میں نظم و ضبط کی بہت کمی تھی۔ اقبال کی طرح وہ بھی حرکت۔ بہانی کی برکت کے قائل نہیں تھے۔ عین وقت پر کام کرتے۔ میرے خیال میں اُن کی نثر میں جو شاعرانہ زیر و بم اور آب و رنگ ملتے ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سخت دباؤ اور تحریک پر قلم اُٹھاتے تھے۔ جب لکھتے تو اپنی کوٹھری میں بند ہو جاتے۔ ملنے ملانے کا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔ کھانا وغیرہ وہیں بھیج دیا جاتا۔ اس کے بعد بھی گھر میں چین نہیں ملتا تو سلیم الزماں صدیقی صاحب، مجیب صاحب یا آپا جان (مس فلپس بورن) کے یہاں خود کو مقید کر لیتے اور اس وقت تک برآمد نہیں ہوتے جب تک کوئی خطبہ، مضمون یا ریڈیو کی تقریر برقلم بند نہیں ہو جاتی۔ ۱۹۴۹ء میں علی گڑھ پہنچ کر اسی طرح کی کیفیت میں اُن پر قلب کا پہلا دورا پڑا تھا۔

ذاکر میاں میں جامعہ ملیہ کی پریشان کن معروفیات کے باوجود ظرافت کا حس قائم رہا۔ میرے خیال میں اس طرح کا حس بنیادی طور پر غیر معمولی ذہانت کی دلیل ہوتا ہے اس لئے کہ بقول کارلائل ظرافت کا جوہر حساسیت ہے۔ جب کسی انسان میں یہ بصیرت پیدا ہو جائے کہ وہ اشیاء کی بوالعجبیوں کو ایک نظر میں بھانپ لے اور ان سے لطف اندوز ہو سکے تو یہ حس کارفرما ہوتی ہے۔ اُن کی یہ حس کبھی فقرے بازی کی شکل میں، کبھی لطیف طنز کے پیرائے میں کبھی ہلکے سے قہقہے کی صورت میں نمودار ہوتی تھی۔ اُن کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی آجاتا اُسے مہمان بنا لیتے اور پھر یہ خواہش ہوتی کہ اس کی زیادہ سے زیادہ خاطر کی جائے۔ چچی صاحبہ اُن کی اس عادت سے پریشان رہتی تھیں، اور کیوں نہ ہوتیں، اس بن بلائے مہمان کی سب سے زیادہ زد اُن پر پڑتی تھی۔ ایک دفعہ ایسا ہی ہوا۔ ذاکر میاں باہر سے لپکتے ہوئے آئے، اور کہا دو آدمی کھانا کھائیں گے۔ چچی صاحبہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ شوربے کی مقدار پانی ڈال کر دوگنی کر دی۔ جب کھانا نکل کر باہر آیا اور دیکھا کہ بس ڈھب ڈھب شوربا ہے جس میں چند بوٹیاں تیرتی پھر رہی ہیں، مہمانوں کے سامنے مسکرا کر بولے: "بھئی مسعود! لانا تو میرا لنگوٹ تاکہ اس میں غوطہ لگاؤں۔ اِس کنارے سے اُس کنارے اور اُس کنارے سے اِس کنارے۔" ہم سب اُن کے اس فقرے سے لطف اندوز ہوئے، سوائے چچی صاحبہ کے جو سُن کر نہایت برافروختہ ہوئیں۔

میرا خیال ہے کہ ذاکر میاں کی حسِ ظرافت نے انھیں زندگی کے تنگنائے سے ہمیشہ

سہل گزارا۔ ظرافت کے ظرف میں وہ ہر قسم کی نامعقولیت کو اپنے لیے گوارا بنا لیتے اسی لیے ان کی گفتگو میں نہ توڈنک ہوتا تھا اور نہ پھکڑ۔ اسے ہم صحیح معنوں میں "مزاح المومنین" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ البتہ جامعہ کی محدود برادری میں انھیں اپنی ذہنی برتری کا احساس ضرور تھا۔ اپنے بعض ساتھیوں سے چڑ کر کہا کرتے تھے "یہ لوگ چڑیا کا سا دماغ رکھتے ہیں" لیکن ان لوگوں کو ساتھ لے کر چلتے تھے۔ جہاں بھی نیکی اور خوبی نظر آتی تھی اس کی قدر کرتے تھے۔ بدی اور برائی کے لیے لوگوں کو معاف کر دیتے تھے۔ ان کی یہ وسیع القلبی کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی تھی، اس لیے کہ پٹھان کی (اور وہ بھی قائم گنج کی) روایت تو بدلے کی رہی ہے۔

زندگی میں نظم وضبط کی کمی کا ازالہ انھوں نے غیر معمولی "ضبطِ نفس" سے کیا تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ انھوں نے مجھے یا اپنی بچیوں کو کبھی بھی کسی بات پر جھڑکا یا ڈانٹا ہو۔ میں نے گھر کے اندر یا باہر انھیں کبھی غیظ کے عالم میں نہیں دیکھا، حالاں کہ ان کے دادا چھمن خاں کا غصہ قائم گنج میں مشہور تھا۔ یوسف میاں نے اپنی خود نوشت "یادوں کی دنیا" میں ذاکر میاں کے "عدم تشدد" کے ماخذ کی تلاش کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے کہ بچپن میں وہ اپنے چھوٹے بھائی زاہد حسین خاں سے پٹ لیا کرتے تھے۔ اس لیے اہلِ خاندان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے وہ "عدم تشدد" کی پالیسی پر عمل پیرا ہوتے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ بہر حال اُن کی آئندہ کی ایثار اور قربانی کی زندگی کے لیے یہ تربیت اچھی تھی، چاہے وہ چھوٹے بھائی سے ملی ہو۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں میں اپنے دوسرے دو چچاؤں ۔ ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر یوسف حسین ۔ کا بھی ذکر کرتا چلوں۔ محمود میاں چھوٹے چچا تھے۔ جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں میں ان کے ساتھ چار سال تک ڈھاکہ میں رہا تھا جہاں سے میں نے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کیا تھا۔ وہ بڑے باغ و بہار آدمی تھے۔ ان کا قہقہہ مشہور تھا۔ وہ چھوٹے بڑے ہر شخص کو اپنی بزم بے تکلف میں شریک کر لیتے ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ اور رفقائے شعبہ میں بہت مقبول تھے۔ وہاں ان کی بے تکلف دوستی عندلیب شادانی صاحب سے تھی۔ جن کی عبارت، اشارت ہر بات نستعلیق ہوتی تھی۔ بدقسمتی سے ان کے صدر شعبہ آسام کے ڈاکٹر لورا تھے جو فارسی میں باہر سے ڈگری لے آئے تھے لیکن جن کی اس زبان میں لیاقت محض واجبی تھی۔ شادانی صاحب، محمود میاں کے ناتے

سے مجھ سے بھی بے تکلفانہ محبت سے پیش آتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے مسعود میاں! تمہیں تو اردو فارسی کا بہت ذوق ہے، حافظ کے اس مصرع کا مطلب تو بتاؤ ع

خامُش مشو کہ کارِ تو از نالہ می رَوَد

میں سوچ ہی رہا تھا کہ بولے پورا صاحب نے تو کلاس میں اس کے معنی یہ بتائے ہیں۔ "(اے حافظ) خاموش مت رہ ہارن بجائے جا اس لئے کہ تیری کار نالے پر سے گزری ہے"۔ وہ ڈھاکئی اردو کے بہت بڑے ناقد تھے اور اس کے سینکڑوں لطیفے انھیں ازبر تھے محمود میاں انھیں بہت عزیز تھے۔ ڈھاکہ کے اجنبی لسانی ماحول میں واقعی ع

عندلیب شادانی! تیرا دم غنیمت ہے

میرے چچاؤں میں سب سے زیادہ غُصیلے محمود میاں ہی تھے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان کا قہقہ کب قہر میں تبدیل ہو جائے گا۔ غالباً پردادا غلام حسین خاں کے غصّے کا بڑا حصّہ انھیں کو وراثت میں ملا تھا۔ لیکن دل کے بہت صاف تھے اس لیے ان کے آس پاس کے لوگ اسے انگیز کر لیتے تھے۔ چھوٹی چچی نہایت نیک بی بی تھیں جب کوئی ان کی نیکی کی تعریف کرتا تھا تو کہتے کہ "اتنی نیک ہونا بھی ٹھیک نہیں کہ بنجا (دھوبی کا نام) کے گدھے گھر میں ہانک لائے"۔ میرے ان کے درمیان کشیدگی امتحانات کے قریب پیدا ہو جاتی تھی۔ میں کمرے میں قلعہ بند ہو جاتا تھا اور اُن کی خواہش ہوتی کہ شام کو باہر آ کر اُن کے ساتھ گپّیں ماروں۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ ان کی یہ خواہش بجا تھی اُس لیے کہ ڈھاکہ میں 'ادھر' کا آدمی ہم نفس وہم زباں کے لیے ترس جاتا تھا۔

محمود میاں سے بڑے میرے چچا ڈاکٹر یوسف حسین خاں تھے۔ طویل مدّت تک ان کے ساتھ رہنے کا مجھے موقع کبھی نہیں ملا۔ لیکن جب تک وہ حیدرآباد میں تھے میں ان کے یہاں جاتا رہتا تھا۔ اس کے بعد پرو وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ آگئے تو تقریباً ہر روز ملنے کے لئے ان کی کوٹھی پر جاتا۔ میرے اُن کے درمیان شکل وصورت کی شباہت کے ساتھ اور بھی کئی قسم کی مشترک ذہنی اقدار تھیں۔ ان کی بیگم (میری خالہ اور چچی دونوں) اب بھی بیٹھے بیٹھے کہہ اٹھتی ہیں "اس وقت مسعود کی شکل مجھے بالکل 'اُن' کی سی لگ رہی ہے"۔ وہ صحیح معنوں میں

اہلِ قلم تھے۔ پیشے کے لحاظ سے مورخ لیکن دلچسپیوں کے لحاظ سے ادیب۔ اُنھوں نے ابتدائے ملازمت ہی میں اقبال پر مبسوط تصنیف 'روحِ اقبال' لکھدی تھی جس کے کئی ایڈیشن ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں اور جو اقبال کے فکر و فن پر تین چار بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ آخری عمر میں اُن کی دلچسپی غالب سے بڑھ گئی تھی تو اس پر تابڑ توڑ کئی تصانیف لکھ ڈالیں۔ "غالب اور آہنگِ غالب' 'غالب اور اقبال کی جمالیات'، یہ محسوس کرتے ہوئے کہ غالب کو ایک عالمی سطح پر روشناس کرایا جائے اس غرض سے اُنھوں نے غالب کے اردو دیوان کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالا جس کی ہندوستان سے زیادہ باہر مانگ ہے۔

وہ ذاکر میاں اور محمود میاں کے علی الرّغم نہایت مرتب زندگی گزارنے کے عادی تھے وقت سے کھانا، وقت سے ٹہلنا اور وقت سے کام کرنا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلری کے پُر آشوب زمانے میں بھی وہ اپنے علمی کاموں کے لیے چند گھنٹے ضرور نکال لیتے تھے۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے 'فرانسیسی ادب کی تاریخ'، 'حسرت موہانی کی شاعری'، 'کاروانِ خیال'، جیسی فکر انگیز تصانیف لکھیں۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد شملہ کے انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز کے فیلو ہو کر تین سال کے لیے وہاں چلے گئے تو وقتِ معینہ پر انسٹی ٹیوٹ کے لیے Indo-Muslim Polity کے نام سے سلاطینِ دہلی کے نظامِ سیاست پر چھوٹی سی کتاب انگریزی میں لکھ ڈالی۔ ورنہ انسٹی ٹیوٹ کے فیلوؤں کی عام روایت یہ تھی کہ شملہ کی پُر فضا آب و ہوا میں دو سال تک صحت بنا کر وعدہ وعید کر کے خالی ہاتھ لوٹ آتے تھے۔ مجھ سے اس کے ڈائرکٹر نہار رنجن رے نے ایک بار بڑے تحسینی انداز میں کہا تھا کہ یہ عمر رسیدہ اچھے اچھے جوانوں سے زیادہ پابندیٔ اوقات سے کام کرتا ہے۔

یوسف میاں میں بھی محمود میاں کی طرح جمال پر جلال حاوی تھا۔ جب جلالی کیفیت میں آجاتے تو نفع و نقصان سے بالاتر ہو کر جو جی میں آتا کہہ جاتے اور کر جاتے۔ ان کا وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی سے اختلاف مزاج کی اسی افتاد کی بناء پر یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ زیدی صاحب نے اُن سے استعفا طلب کر لیا تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی مجلسِ منتظمہ کی اکثریت اُن کے ساتھ تھی۔ اسی لئے آخر میں زیدی صاحب کو سمجھوتہ کرنا پڑا۔ ان کے سب سے بڑے حمایتی

عبدالمجید خواجہ صاحب تھے جنھوں نے نہایت بے تکلفی سے ایک بار مجھ سے کہا تھا۔ "مسعود! تمھارے دونوں چچاؤں میں ذاکر سیاسی آدمی ہیں اور یوسف پٹھان ہیں"۔ علی گڑھ میں بائیں بازو کے اہلِ سیاست سے ان کی کشمکش بھی اسی مزاج کا شاخسانہ تھی۔ یوسف صاحب ایک تو مارکسی فکر کے ناقدین میں تھے۔ دوسرے اشتراکیت کے جو نمونے علی گڑھ میں اُن کے سامنے تھے انکو وہ کردار کے اعتبار سے نہایت گھٹیا سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے لیے مسلم یونیورسٹی جیسے ادارے میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ وہ ان سے اس وجہ سے بھی نالاں تھے کہ ان میں سے بعض صلاحیت رکھنے کے باوجود علمی کام دیانت کے ساتھ نہیں کرتے تھے۔ میں اس میں ان کا ہمخیال تھا۔ زیدی صاحب اس کے برخلاف خالص سیاسی انسان تھے۔ اس لیے مارکسی نظریات کے نہ ہوتے ہوئے بھی اُن کے گھیرے میں آجاتے۔ یوسف میاں کے مزاج کی اس افتاد سے ذاکر میاں تنگ رنجیدہ مگر خاموش رہا کرتے۔ ایک طرف دوست اور دوسری طرف بھائی تھا اور بھائی بھی ایسا جس نے آڑے وقت میں ہمیشہ ان کی نازبرداری کی، لیکن زیدی صاحب کے احسانات کا بوجھ زیادہ تھا۔ خاص طور پر جب علی گڑھ آکر انھیں قلب کا دورہ پڑا تو زیدی صاحب اس وقت ریاست رام پور میں بڑے وزیر تھے انھوں نے نواب رام پور کو اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ علی گڑھ سے ذاکر صاحب کو اپنی اسپیشل ٹرین میں بغرضِ علاج رام پور لے آئیں۔ میں اس وقت علی گڑھ اسٹیشن پر موجود تھا جب ذاکر صاحب کو گاڑی پر چڑھا دیا گیا تو اچانک نواب صاحب اُن کے ڈبے میں نمودار ہوئے اور کہا "ذاکر صاحب! اب آپ میری Juris-diction میں ہیں" (اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ اس وقت ہر والئی ریاست کا حدِ اختیار اس کی "اسپیشل" سے شروع ہوجاتا تھا) ذاکر میاں نے کہا "جی سرکار"۔ مجھے کچھ عجب سا لگا اس کے بعد ذاکر میاں رام پور سے علی گڑھ لوٹ آئے تب بھی نواب صاحب کی جانب سے دو نرسیں کئی مہینے تک ان کی کوٹھی پر دیکھ بھال کے لیے تعینات رہیں۔

یوسف میاں کے جلال کا ایک اور مظاہرہ ان کے ریٹائرڈ ہونے اور دہلی میں بس جانے کے بعد نظر آیا۔ شملے سے واپس آنے کے بعد کچھ عرصے وہ ذاکر میاں کی کوٹھی کے ایک حصے میں مقیم رہے۔ اس وقت ذاکر میاں نائب صدرِ جمہوریہ تھے۔ جب مئی ۱۹۶۷ء میں وہ صدرِ جمہوریہ

ہو کر راشٹرپتی بھون میں منتقل ہو گئے تو یوسف میاں نظام الدین میں کرائے کے فلیٹ میں آ گئے۔ اب انھیں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اگر انھیں دہلی میں ریٹائرڈ زندگی گذارنا ہے تو مختصر سے آشیانے کا ڈول ڈالنا چاہیے۔ حیدرآباد میں بنجارہ ہلز پر اُن کا بڑا کشادہ بنگلہ تھا لیکن اب چونکہ دکن واپس جانے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیئے وہ اسے فروخت کرنے کی فکر میں تھے۔ اِس سے انھیں اس قدر رقم بآسانی مل جانے کی توقع تھی کہ وہ دہلی میں اپنی رہائش کے لیئے ایک آرام دہ فلیٹ بنا سکیں۔ مسئلہ تعمیر کے لیئے زمین کا تھا۔ اس وقت انھیں یاد آیا کہ اوکھلے میں اُنھوں نے جامعہ لینے کے ابتدائی زمانے میں ایک بڑا پلاٹ نہایت سستے داموں میں لے لیا تھا جس میں سے ایک تہائی انھوں نے ذاکر میاں کو اور ایک تہائی محمود میاں (وہ کچھ عرصے کے لیئے ڈھاکہ سے آل انڈیا ریڈیو کی سروس میں دہلی آ گئے تھے) تحفۃً دے دیا تھا۔ باقی ایک تہائی بھی ذاکر میاں کے بڑے داماد خورشید عالم خاں نے ان سے سستے داموں خرید لیا تھا۔ خورشید نے کچھ عرصے پہلے محمود میاں کا مکان (مع زمین) بھی اصل قیمت (تقریباً چودہ ہزار) میں خرید لیا تھا۔ یوسف میاں کی خواہش تھی کہ اب اُن کی ضرورت کے موقع پر اس میں سے اس قدر زمین انھیں دے دی جائے کہ وہ ایک چھوٹا مکان تعمیر کر سکیں۔ کہتے ہیں کہ زمین بیر پکڑ لیتی ہے اور خاندانی جھگڑوں کی جڑ ہوتی ہے۔ اُن کی تجویز کو خورشید صاحب اور ان کی بیگم نے قبول کرنے میں ٹال مٹول کی۔ ذاکر میاں حسبِ معمول خاموش رہے۔ جب حاجت روائی کی کوئی شکل نہیں نکلی تو یوسف صاحب کو آخری بار جلال آیا اور انھوں نے اس بار براہِ راست ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، صدرِ جمہوریۂ ہند کو خط لکھا کہ اگر ان کے اس قدر احسانات کے باوجود انھیں زمین کے ایک قطعہ سے محروم رکھا گیا تو وہ راشٹرپتی بھون کے سامنے دھرنا دیں گے۔ ذاکر میاں نے صورتِ حال کو بھانپ لیا، وہ اپنے چھوٹے بھائی یوسف کے مزاج سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے اپنے داماد اور بیٹی سے کہا کہ یوسف کو سامنے کی ایک تہائی زمین سے ایک قطعہ دے دو۔ اور اگر تم لوگ ایسا نہیں کرو گے تو میں خرید کر دوں گا جس کی قیمت اب ہزاروں ہو گی۔ اس اخلاقی دباؤ کا اثر پڑا۔ یوسف میاں کو جامعہ نگر میں ایک قطعۂ زمین مل گیا جس پر بعد کو انھوں نے اپنا مکان تعمیر کر لیا اور دھرنا دھرا رہ گیا۔

یوسف و برادرِ یوسف کے اِس قضیئے کا ذکر جب کبھی خاندان میں ہوتا تو ہر شخص اپنے اپنے خیال کے مطابق رائے دیتا۔ میری رائے یہ تھی کہ قانونی اعتبار سے یوسف میاں کا اس زمین پر

کوئی حق نہیں ہے اس لیے کہ وہ کچھ عطیہ کے طور پر اور کچھ واجبی قیمت پر ان لوگوں کو دے چکے ہیں۔ ہاں اخلاقی حق ضرور پہنچتا ہے۔

اُس وقت ذاکر میاں کے یہاں میرے علاوہ ایک اور عزیز رحیم الدّین خاں بھی مقیم تھے۔ وہ جامعہ ملیہ میں اسکول کے طالب علم تھے اور چوں کہ ان کا رجحان زیادہ تر کھیل کی جانب تھا اس لیے تعلیم سے خاطر خواہ بہرہ مند نہیں ہو پاتے تھے۔ چچی صاحبہ نے ان کو تعلیم یافتہ بنانے کی ذمہ داری میرے اوپر ڈال دی۔ چنانچہ میں ان کا خود ساختہ آتالیق بن گیا۔ وقت کی پابندی کے ساتھ زبردستی اُن کو پڑھانے کی کوشش کرتا۔ لیکن شاید اُن پر اپنا فوجی مستقبل روشن تھا، اس لیے دماغ میں کوئی چیز نہیں جمتی تھی۔ مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ اسکول کے بچوں کے لیے کس قدر گھٹیا اُستاد ہوں۔ جہاں تحمّل کی سخت ضرورت ہوتی ہے وہاں میں ذرا ذرا سی خطا اور چوک پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ شروع شروع میں سخت کلامی سے کام لیا۔ اس کے بعد سخت گیری پر اُتر آیا۔ حساب کے سوالات کی غلطیوں پر میں ان کی انگلیوں پر پیمانہ مارتا۔ اس سے بھی جی سیر نہ ہوتا تو طمانچے مار کر گال سُرخ کر دیتا۔ وہ بہت گورے رنگ کے تھے۔ اس لیے طمانچوں سے رنگ اور چوکھا ہو جاتا اور چہرہ تمتما اُٹھتا، آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ لیکن شاباش پٹھان بچّے! کہ نہ کبھی اُف کی اور نہ کسی سے شکایت کی۔ ایک دن میرے بڑے بھائی امتیاز حسین خاں نے انھیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے علاحدہ لے جا کر سرزنش کی۔ اس کے بعد اُن کا مجھ سے فیضیاب ہونے کا سلسلہ بند ہو گیا۔ ابھی دو سال پہلے جب میں پاکستان ایک ثقافتی وفد کے رکن کی حیثیت سے گیا تھا تو اسلام آباد پہنچ کر میں نے اپنی چچازاد بہن ثاقبہ کو (جو لفٹیننٹ جنرل رحیم الدین خاں کی بیوی ہیں) ٹیلیفون کیا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے دوسرے روز مجھے شام کے کھانے پر مدعو کیا تو لفٹیننٹ جنرل صاحب سے بھی ایک عرصے کے بعد ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھے اپنے اسکول کی عمر کے دو بچّوں سے متعارف کراتے

ہوئے کہا کہ "مسعود بھائی میرے استاد بھی رہے ہیں۔ مگر سخت گیر استاد رہے ہیں۔ جب میں اپنی نالائقی کا ثبوت دیتا تھا تو میری انگلیوں پر کھٹ سے پیمانہ مارتے تھے"۔ میں نے کہا یہ صرف "نصف سچ" ہے، یہی نہیں یہ ان کے گورے گورے گالوں کو گلنار بھی کر دیا کرتا تھا۔ رحیم الدین خاں اُس وقت پاکستانی فوج کے چیف آف اسٹاف تھے، اور جنرل ضیاء الحق کے سمدھی!

پانچواں باب

علی گڑھ (۱)

(۳۹ تا ۱۹۴۱ء)

۱۹۳۹ء کی جولائی میں اینگلو عربک کالج کی پوری ٹولی داخلے کے لیے علی گڑھ پہنچی۔ انعام الحق نے ایم۔ اے انگریزی میں داخلہ لیا۔ حبیب اللہ خاں نے فارسی کا انتخاب کیا (حالاں کہ میرے نزدیک اُن کی اردو بھی مشتبہ تھی) محمود علی نے ایم۔ اے فلسفے میں اور میں نے ایم۔ اے تاریخ میں۔ میرے داخلے کی کارروائی بہ نفسِ نفیس رشید احمد صدیقی صاحب نے اِس طرح کی بغیر توجہ کیے میرے ہاتھ سے داخلہ کا فارم لے لیا اور "آئیے حضرت" کہہ کر میرے ساتھ اسٹریچی ہال میں جا نکلے جہاں ان دنوں داخلہ کا بازار لگتا تھا۔ کلرکوں سے لے کر پروسٹ اور دیگر اربابِ داخلہ تک بے شمار میزیں لگی ہوئی تھیں۔ یہاں پر اندراج کرائیے یہاں ہال اور ہاسٹل کا انتخاب کیجیے، یہاں فیس داخلہ جمع کر دیجیے۔ ہر میز پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے پیرو کار عام طور پر سینیر طلبہ یا رشید صاحب جیسے بعض اساتذہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ رشید صاحب کا جس میز کی طرف رُخ ہوتا ہے پرے کا پرا ہٹ جاتا ہے۔ کلرک ہو کہ اسسٹنٹ رجسٹرار ایک ہلکی سی اُٹھک بیٹھک لگاتا اور اُن کے فقرے کی تاب نہ لا کر جھٹ ان سے فراغت حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔

اُس دن رشید صاحب کے وار بھرپور پڑ رہے تھے اور شاید ہی کوئی مردہ دل ہو جو اِس سودا اور اِن کے غنچہ سے پہلو تہی کرنے کی ہمت کرتا ہوں۔ لیجیے جو کام گھنٹوں میں ہوتا تھا منٹوں میں ہو گیا۔ اس دوران میں میری طرف سے مسلسل تجاہلِ عارفانہ رہا۔ ایک

دھچکا اور لگا۔ جب آخر میں مجھے داخلہ کا فارم تھماتے ہوئے کہا لیجئے حضرت! باقی کام آپ کا ہے فیس وغیرہ داخل کیجئے اور شعبۂ تاریخ کا رخ کیجئے۔

ابھی میرے قدم شعبۂ تاریخ میں جمنے بھی نہیں پائے تھے کہ ایک مؤرخ ہی کے ورغلانے پر (میری مُراد پروفیسر مجیب سے ہے جو ان دنوں علی گڑھ آنکلے تھے) اُکھڑ گئے، اور ہفتہ عشرہ کے اندر ہی تبدیلیٔ مضمون کی درخواست لیئے سہما سمٹا شعبۂ اردو میں صورتِ سوال کھڑا تھا۔ رشید صاحب سے میں نے جب اپنی اِس نیت کا تذکرہ کیا تو بولے: "خوب! یہ میں نے کب کہا تھا کہ آپ مجھ پر مسلط ہو جائیں" پھر ٹھونک بجا کر پوچھا "کیا بالکل طے کر لیا ہے؟" میں نے کہا: "جی ہاں، ایک مؤرخ ہی کے کہنے پر"۔ کہا "اچھا لائیے درخواست" اور شانِ بے نیازی سے اُس پر دستخط کر دیئے۔

لیجئے اب میں شعبۂ اُردو کا طالب علم بن گیا۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کی وجہ سے مجھے آفتاب ہوسٹل میں جگہ بھی مل گئی جہاں سب کمرے "سنگل سیٹ" کے تھے اور جو "پڑھاؤ" طالب علموں کا سب سے محبوب ہوسٹل تھا۔ شعبۂ اردو میں اس وقت کئی حضرات درس دیتے تھے لیکن ایم۔ اے۔ کو پڑھانے کی ذمہ داری رشید صاحب اور سرور صاحب تک محدود تھی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بھی لیکچرر تھے لیکن ان سے مجھے شرفِ شاگردی کبھی حاصل نہیں رہا۔ یہ اور بات ہے کہ خلوصِ جذبات یا حافظے کی فروگذاشت کی وجہ سے پاکستان میں جہاں بھی متعارف کرانے کا موقع ملتا ہے، وہ مجھے فخریہ اپنا شاگرد بتاتے ہیں!

رشید صاحب کے نام نامی اور ان کی بعض تحریروں سے میں پہلے سے واقف تھا۔ میں اُن خصوصی تعلقات سے بھی واقف تھا جو اُن کے اور ذاکر میاں کے درمیان زمانۂ طالب علمی سے چلے آرہے تھے۔ آل احمد سرور صاحب میرے لیے نئے تھے۔ وہ ابھی دو سال پہلے اردو میں پرائیوٹ ایم۔ اے کرنے کے بعد انگریزی سے منتقل ہو کر شعبۂ اردو میں آئے تھے۔ کہتے تھے اُن کے اِس فیصلے کو رشید صاحب اور ذاکر صاحب دونوں کی تائید حاصل تھی۔ بی۔ اے۔ تک وہ سائنس کے طالب علم رہے۔ یک لخت ایم۔ اے انگریزی کی جانب جھک پڑے اور

فرسٹ کلاس حاصل کیا۔ اس کے بعد اُردو میں بھی درجۂ اوّل میں کامیاب ہوئے۔ غرضکہ اردو ادب کے کامیاب استاد بننے کے لیۓ پوری طرح مسلّح تھے۔ ان کا علم بھی مستحضر تھا۔ انگریزی اور اردو ادب کے تقابلی مطالعے سے اپنے لکچروں کو اور زیادہ پُر مغز بنادیتے تھے۔ حافظ اچھّا پایا تھا اِس لیۓ جب اشعار نقل کرنے پر آجاتے تو دریا بہادیتے۔ پڑھاتے بھی بہت لگن اور تیّاری سے تھے۔ اسی لیۓ پوری کلاس اُن کی ہمہ دانی سے متاثر تھی۔

رشید صاحب کی ڈگر اس سے مختلف تھی۔ وہ انگریزی ادب سے بہت کم واقف تھے۔ البتہ فارسی شعروادب پر اچھی نظر تھی۔ پڑھانے میں ان کا جی بھی نہیں لگتا تھا اس کی تیاری بھی نہیں کرتے تھے۔ بنیادی طور پر وہ انشاپرداز تھے۔ ان کا دائرۂ تدریس بھی محدود تھا یعنی غالبؔ، اقبالؔ، حسرتؔ، جگرؔ، اصغرؔ اور چند مزاح نگار یا انشاپرداز۔

سرور صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ "توازن" کا شکار ہیں، اس لیۓ ادب میں کچھ بھی نہیں تول پاتے۔ ان کی تنقید پر یہ مصرع چسپاں کیا جاتا تھا ؎

جناب شیخ کے نقشِ قدم یوں بھی ہیں اور یوں بھی

کبھی ترقی پسندوں کے ہم سفر رہے اور کبھی جدیدیوں کے رہبر بنے۔ ؏

معشوقِ ما بہ شیوۂ ہر کس برابر ست

رشید صاحب ترقی پسندی کو مسلسل مشتبہ نظروں سے دیکھتے رہے کسی جگہ لکھا ہے "ہر وہ ادبی تحریک جس کا مآخذ اور مصدر کعبہ و کاشی سے ماوراء ہو میں اسے شبہ کی نظر سے دیکھتا ہوں" لیکن صلحِ کُل کے مسلک رکھنے کی وجہ سے اگر ان کا کوئی فقرہ کسی کے لیۓ ڈنک بن جاتا تھا تو فوراً معافی مانگ لیتے تھے۔

طالب علموں میں اکثر دونوں استادوں کا موازنہ کیا جاتا تھا۔ سب لوگ اس بات پر متفق تھے کہ رشید صاحب کی بات اپنی بات ہوتی ہے جب کہ سرور صاحب کی پرائی۔ دوسرے الفاظ میں سرور صاحب کا علم کتابی واکتسابی تھا۔ رشید صاحب اس کے برعکس غالب ہوں کہ اصغر ان پر ذاتی تاثرات بیان کرتے۔ اسی لیۓ ان کا ایک ایک جملہ بصیرت کا نگینہ بن جاتا تھا۔ سرور صاحب کا علم قاموسی تھا۔ رشید صاحب

کا وجدانی۔ ہم لوگوں نے دونوں سے اپنے اپنے طور پر استفادہ کیا ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ دونوں استادوں میں آخر آخر میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ رشید صاحب کا خیال تھا کہ سرور صاحب کی وجہ سے انھیں ملازمت میں توسیع نہیں مل سکی۔ اس پر علی گڑھ کے حلقوں میں بہت دنوں تک چہ میگوئیاں بھی رہیں۔ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ جو اس قدر قریب رہے ہوں وہ اس قدر دور بھی جا سکتے ہیں۔ سرور صاحب نے ایک دو بار رشید صاحب کے دولت خانے پر حاضری دے کر معاملہ کو سلجھانا بھی چاہا لیکن رشید صاحب کے دل کی گرہ نہ کھلی۔

دونوں کے عقیدت مند اور محرمِ راز ہونے کی حیثیت سے میں یہ اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آنے والی نسلوں کے لیے، واقعات جیسے کہ ہیں بیان کر دوں۔ رشید صاحب کی جانب سے لوگوں کی یہ شکایت کہ کرنل بشیر حسین زیدی سے قرب کی وجہ سے سرور صاحب نے رشید صاحب کی مدتِ ملازمت میں توسیع نہیں ہونے دی صحیح نہیں۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ رشید صاحب جب ۱۹۵۸ء میں حسنِ خدمت سے سبکدوش ہوئے تو ان کی اصل عمر ۶۵ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ ملازمت میں توسیع سال دو سال کی ہوتی تھی۔ ذاکر صاحب نے صرف پروفیسر محمد حبیب اور پروفیسر ہادی حسن کو خصوصی توسیع چار سال کی دی تھی۔ ظاہر ہے کوئی وائس چانسلر ۶۵ برس سے اوپر کے کسی استاد کو مزید توسیع نہیں دے سکتا۔ وجہ جواز صرف یہ پیدا کی جا سکتی ہے کہ رشید صاحب ہائی اسکول کے سارٹیفکٹ کے مطابق ۱۹۵۸ء میں صرف ۶۰ سال کے ہوئے تھے لیکن صحت اور کارکردگی کے اعتبار سے وہ اس سے کہیں زیادہ کے لگتے تھے۔ ان کی عدم کارکردگی کا اندازہ ان کے دوست اور مرشد ڈاکٹر ذاکر حسین تک کو تھا جنھوں نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ "جب تک رشید صاحب شعبۂ اردو کے سربراہ ہیں اس کی ترقی و توسیع ناممکن ہے۔"

رشید صاحب کی جانب سے اس معاملے میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ سرور صاحب کو اس معاملے میں خاموشی نہیں اختیار کرنی چاہیے تھی، جیسی کہ اُنھوں نے کی۔ اس لیے کہ وہ عرصے تک رشید صاحب کی توجہ کا مرکز بنے رہے تھے۔ یہ ان کا اخلاقی فرض تھا کہ ان کی حمایت میں لب کُشا ہوتے۔ رشید صاحب جیسے حسّاس انسان نے اسے شدت کے ساتھ محسوس کیا اور پھر کبھی معاف نہیں کیا۔ اُن کی

دل شکستگی بار بار ان کے خطوط میں اُبھر آتی ہے۔

رشید صاحب اور سرور صاحب کی سیرتوں اور مزاجوں میں بھی بعدُ المشرقین تھا۔ رشید صاحب کی شخصیت زیادہ کُڑھی ہوئی تھی۔ صدیقی دونوں تھے لیکن رشید صاحب میں شیوخ کی آن بان تھی۔ ان کی پسند اور ناپسند بھی شدید تھی۔ ان کے کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی فیض رسانی اور کریم النفسی تھی۔ سرور صاحب نسبتاً دلِ تنگ رکھتے ہیں وہ ابتداء میں جس کو بڑھاتے ہیں آخر میں آخر میں اسی سے رشک کرنے لگتے۔ یہ میری نہیں اُن کے ایک اور عزیز شاگرد پروفیسر نورالحسن ہاشمی کی رائے ہے۔ معاشرتی سطح پر بھی طبائع کا تباین بہت زیادہ تھا۔ سرور صاحب کے یہاں تواضع کرنے سے زیادہ تواضع کروانے پر زور ملتا ہے۔ رشید صاحب کا اس اعتبار سے دسترخوان بہت کشادہ تھا۔ ان کے یہاں معقول نامعقول ہر قسم کے مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ خود سدا کے حاجتمند ہوتے ہوئے دوسروں کی حاجت روائی کرتے رہے۔ اس لیۓ انسانی سطح پر ان کے رشتے ان کے دوستوں اور عقیدتمندوں سے زیادہ استوار رہے ہیں۔ وہ اچھا شاعر ہونے کے لیۓ اچھا انسان ہونا لازمی قرار دیتے تھے۔ اسی لیۓ اصغر اور جگر کے مقابلے میں انھوں نے جوش کو ہمیشہ نامعقول سمجھا "کوئی نامعقول، معقول شاعر نہیں ہو سکتا۔" ان کا ایک قولِ محال تھا۔

سرور صاحب کے برعکس وہ بنیادی طور پر خلوت، خواص اور "خانہ پسند" تھے، ان کا گھر ان کا قلعہ تھا جو بقول خواجہ غلام السیدین انھیں کی طرح باہر سے ناہنجار اور اندر سے باغ و بہار تھا۔

سنہ ۱۹۴۱ء میں مَیں نے ایم۔ اے اوّل درجہ میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اس میں میری صلاحیت سے زیادہ محنت کو دخل تھا۔ ورنہ بہتر ادبی ذوق رکھنے والے اور پختہ کار مسعود ذوقی مرحوم جیسے لوگ میرے ہم جماعت تھے۔ مولوی عبدالحق نے اردو زبان کے پرچے میں مجھے سو میں سے ۹۰ نمبر دیئے۔ سب سے کم نمبر سرور صاحب کے پرچے میں پائے یعنی کل ۷۰ نمبر۔ مجھے احساس ہے اس وقت تک میں انشاپردازی کے لحاظ سے کمزور تھا شاید یوں بھی تھا کہ اس کے بعد اُردو زبان، میرا اوڑھنا بچھونا بننے والی تھی اور مولوی عبدالحق کے ہاتھوں اس میں ریکارڈ نمبر حاصل کرنے کے بعد میری خوداعتمادی بڑھ گئی اور میں نے بعد کو اسی کو اپنا موضوعِ تحقیق بنایا۔

علی گڑھ کے قیام میں میں نے صرف اپنے ادبی ذوق اور علمی افق ہی کو فراخ نہیں کیا بلکہ اس دور کی مسلم سیاست اور مسلمان کی امیدوں اور آرزوؤں کا بھی مجھے اندازہ ہوا۔ یہ زمانہ مسلم لیگ کے احیاء کا دور تھا۔ میرے ذہن کی تربیت جامعہ ملیہ کی قوم پرستی کی فضا میں ہوئی تھی۔ مذہب کی جانب میرا رویہ جامعہ ملیہ کے پنج وقتہ کے باوجود غالب کا سا بن چکا تھا ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اس لیے میں نے اِس دور کی مسلم لیگ کی سیاست کو محض ایک تماشابین کی حیثیت سے دیکھا۔ ہر دور میں علی گڑھ میں اشتراکی فکر رکھنے والوں کا ایک مختصر مگر منظم حلقہ رہا ہے۔ ادب میں یہی "ترقی پسند" کہلاتے تھے۔ میں بھی رشید صاحب کی طرح ان کو مشتبہ نظروں سے دیکھتا تھا۔ دراصل مارکسزم میرے ذہن کو کبھی بھی زیر نہیں کر سکی۔ میرے اردگرد جو نام نہاد ترقی پسندوں کے نمونے تھے وہ بھی متاثر کن نہیں تھے۔ شراب کا نشہ، سگریٹ کا دھواں، غیر اخلاقی اقدار یہ سب میری فطرت کے منافی تھیں۔ میں اچھی زندگی کو صحت مند مرتب زندگی سمجھتا تھا۔ مُلّائیت کا نقاد تھا اور اشتراکیت میں مجھے ایک قسم کی مُلّائیت کا ذہن کارفرما نظر آتا۔ وہی ہمہ کہ ہم صراطِ مستقیم پر ہیں۔ "چھوٹے" کی فکر کو میرا ذہن کبھی قبول نہیں کرتا چاہے اس کا ماخذ کہیں سے ہو۔ میں اکثر دوستوں سے کہتا کہ دماغ بند ہی رکھنا ہے تو اسلام کیا بُرا ہے۔ فلسفیانہ سطح پر میں اس کا قائل بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ انسان معاشی حالات کا غلام ہوتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کو فاعل مختار سمجھا اس لیے شعر و ادب میں فرد کی انفرادیت کا قائل رہا۔ بہت بعد کو جب ۱۹۵۶ء میں نے اپنا مجموعۂ کلام "دونیم" کا پہلا اڈیشن شائع کیا (اب ۱۹۸۶ء میں دوسرا شائع ہو چکا ہے) تو تمہیدِ شعر کے طور پر یہ الفاظ لکھے تھے۔

"شاعرانہ شخصیت اپنے معاشرتی ماحول میں بے ہمہ اور باہمہ ہو کر اسی طرح سے مگن رہتی ہے جیسے ہمارا معاشرتی دائرہ کائنات کے طبعی ماحول میں۔ لیکن جس طرح طبیعیات کے اصولوں کا سیدھا سیدھا اطلاق سماج کی گتھیوں

کو نہیں سُلجھاتا اُسی طرح معاشیات کے اصولوں کی ادب و شعر پر تطبیق بہت دور تک دست گیری نہیں کرتی۔ شعری عمل اُس وقت تک بروئے کار نہیں بنتا جب تک اس میں کشاکشِ انفرادیت نہ ہو۔"

میں نے اسی خیال کا اعادہ اپنے اس دور کے ایک مضمون "سماج اور شعر" میں کیا تھا جو پہلی بار فکر و نظر (علی گڑھ) میں شائع ہوا تھا۔ جس پر قاضی عبدالودود سے داد اور کمیونسٹ پارٹی کے سرکاری آرگن کے ایک اداریے سے 'بیداد' ملی تھی۔ اس میں میں نے مارکس کا یہ اقتباس دیا تھا۔

"یہ امر واقعہ ہے 'فنونِ لطیفہ کے اعلیٰ ترین ارتقاء کے بعض ادوار کا نہ تو اس عہد کے سماجی ارتقا سے بلاواسطہ رشتہ ہوتا ہے اور نہ اُس عہد کی مادی بنیاد یا معاشرتی ڈھانچے سے۔"

اس کے بعد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"دراصل معاشی اور فنی اقدار کے اثرات دائرے کی شکل میں مرتب ہوتے ہیں اور یہ مختلف ادوار کی اپنی اپنی توانائی اور بصیرت پر منحصر ہے کہ وہ کس درجہ خود کو حیاتِ معاشی کی بندشوں سے آزاد کر سکتے ہیں۔۔۔۔ مارکس اور اینگلز کی تحریروں میں ادب کو 'آلۂ کار' یا 'حربہ' کے طور پر استعمال کرنے کا تصور بھی نہیں ملتا۔ دراصل دونوں نشاۃ الثانیہ کے 'انسانِ کامل' کے تصور سے اس قدر متاثر تھے کہ انسان کی یک طرفہ معاشی زندگی کو سب کچھ سمجھنا اُن کے لیے ممکن نہیں تھا۔"

میرے لیے یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ میری مذہبی و سیاسی آزادخیالی کی ماخذ کیا تھے۔ صرف قیاس کر سکتا ہوں کہ بچپن کا وہ آزادخیال ماحول جس میں معتقدات کی کمی تھی یا شاید وہ نسلی امتیازات جو مجھے افغانی قبائلی زندگی سے وراثتاً ملے تھے جن میں شدید انفرادیت اور عقلیت شامل ہیں۔ میری بیوی نسوانی ضعیف العقیدگی کی بہت سی فرضی باتیں بیان کرتی رہتی ہیں جس کا ردِعمل میں برسوں سے ان الفاظ میں پیش کرتا رہا ہوں "بھئی! یہ بات دماغ میں نہیں دھنستی"۔ یہ جملہ اب اُن کے لیے چڑ سی بن گیا ہے لیکن حقیقتِ حال یہی ہے،

جس بات کو ذہن قبول نہیں کرتا میرے لیے اس کو یقین کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے توہمات، مہمل روایات اور دیومالائی تصورات کو کبھی قبول نہیں کیا۔ اسی لیے قدیم ہندوستانی تہذیب کی تجدیدات کی جانب طبیعت نہیں جاتی۔ مجھے سنِ شعور سے جہاں مسلمانوں کی بہت سی خرافات سے چڑ رہی ہے، اشتراکیوں کے خود کو ہمیشہ صراطِ مستقیم پر سمجھنے سے بھی اسی قدر بیزار رہا ہوں۔ میں اپنے دوستوں سے اکثر کہتا تھا کہ یہ بھی ایک طرح کے کٹ مُلّا ہیں جو سمجھتے ہیں کہ انھوں نے جدلیاتی منطق سے حقیقت اور صداقت کو پا لیا ہے حالانکہ یہ دعویٰ مارکس نے بھی نہیں کیا ہے۔ پھر اپنے اردگرد ان کے چلتے پھرتے نمونے دیکھ کر اور ذاتی سطح پہ خود کو ان سے بہتر پا کر، اور زیادہ بیزار ہو جاتا۔ مزدوروں کا دم بھر کر آپ بورژوا طبقے کے عیش کے متلاشی رہیں، یہ کہاں کا کردار ہے! اس لیے جس طرح میں ہمیشہ کٹ مُلّاؤں سے بحث و مباحثہ کرنے سے گریز کرتا تھا ان سُرخوں کو بھی دور رکھتا تھا اور بعد کو سلام مچھلی شہری کے اس مصرع سے خوب لطف اندوز ہوتا رہا ع

مجھے بچاؤ! کہ سُرخوں میں گھر گیا ہوں میں

ان لوگوں نے مجھے ہمیشہ صرفِ نظر کیا لیکن میں گھاٹے کے اس سودے پر رضامند رہا۔

علی گڑھ میں میرے دن بیشتر اپنے ساتھ گذرتے۔ صبح اٹھ کر ہلکی سی ورزش۔ اس کے بعد کیوڑے سے دودھ میں گاجریں اور چھوارے ابال کر ان کا ناشتہ۔ ہاسٹل سے جو دو توس آدھی گولی مکھن اور چائے ملتی وہ میں اکثر بیرے کو دے دیتا۔ کالج سے واپس آنے کے بعد ہاسٹل سے جو کچھ ملتا اس پر اصلی گھی کا تڑکا لگا کر نوش کر جاتا۔ ہاسٹل کے سالن کے متعلق مشہور تھا کہ یہ سرسید کے نسخۂ کلاں کے بموجب پکایا جاتا ہے اس لیے اس کا نام چاہے قورمہ ہو یا دوپیازہ۔ مزہ یکساں ہوتا ہے۔ ترکاری کی پلیٹ میں موسم کی سب سے دستیاب اور سستی سبزی کو ترجیح دی جاتی۔ جولائی میں جب یونیورسٹی کھلتی تھی تو بھنڈی کا موسم ہوتا، بس تو پھر بھنڈی کا سلسلہ شروع ہو جاتا جس پر تار بہرحال وہی سُرخ رنگ کا ہوتا جو گوشت کے لیے علاحدہ سے تیار کیا جاتا۔ اور دال تو پتلی مشہور ہی ہے وہ کیوں کر اپنی شہرت پر بٹہ لگنے دیتی۔ گل جائے تو بہت سمجھیے۔ آفتاب ہاسٹل کی زندگی میں رہیں پہلے سال کمرہ نمبر ۶۶ اور دوسرے سال کمرہ نمبر ۵۴ میں مقیم تھا۔ کھانا میرے لیے ہمیشہ مسئلہ بنا رہا۔ داخلہ لینے کے بعد انٹروڈکشن نائٹ کا مسئلہ تو اسی

روز رفع دفع ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ ایک سینیئر کی جانب سے اشارہ مل گیا تھا کہ آج کی رات ہوشیار رہنا۔ انٹروڈکشن نائٹ کی علی گڑھ میں نووارد طلبہ پر جو ہیبت ہوتی ہے وہ وہی لوگ جانتے ہیں جو اس سے گزر چکے ہیں۔ طرح طرح کے بیہودہ مذاق کیے جاتے ہیں۔ گانے کو کہا جاتا ہے، وہ نہیں آتا تو پھر ناچنے پر اصرار کرتے ہیں۔ غرض کہ چند گھنٹوں کے لیے نوواردوں کی عزت و ناموس ایک ہجوم کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو اپنے کو 'سینیئر' کہتے ہیں۔ میں ایک سینیئر ہی کے اشارے پر ان سینیئروں کو ہاتھ دے گیا' یعنی شام کو دہلی کے لیے چمپت ہو گیا۔ چنانچہ رات کے سناٹے میں جب سینیئروں کی برات شور مچاتی نکلی اور کمرے کمرے نوواردوں کی گرفتاری کا عمل شروع ہوا تو انھیں سخت مایوسی ہوئی جب انھوں نے میرے کمرے میں بڑا سا تالا لگا دیکھا۔ آواز بلند ہوئی یہ تو بڑا استاد نکلا۔ اِدھر اُدھر نظر ڈالی تو انھیں میرے کمرے کے سامنے دیوار کے سہارے سے کھڑی ہوئی بانس اور بانڈوں کی نئی کھاٹ نظر آئی، جو میں دو روز قبل، حسب روایت، رسل گنج سے خرید کر یکے پر لاد کر لایا تھا۔ نعرہ لگا اسی کو اٹھا لو۔ دوسرے روز جب میں دہلی سے واپس آیا اور ہاسٹل کے سینیئروں کو میری واپسی کا علم ہوا تو دو طالب علم مجھے بلا کر ایک سینیئر کے کمرے میں لے گئے جہاں پہلے سے کچھ طالب علم موجود تھے۔ کچھ لعن و تعریض ہوئی۔ سزا کے طور پر کچھ گانے کو کہا گیا مگر وہ ہجوم کی سی بات کہاں۔ سستا چھوٹا، چلتے وقت میں نے کہا میری کھاٹ تو واپس کر دیجیے۔ کہا گیا وہ تو بحق سرکار ضبط کی جا چکی ہے۔

اس عرصے میں، مَیں طلبہ کی یونین کی سیاست سے بھی دور رہا۔ صرف ایک بار اپنے ہم وطن اور دوست مختار آزاد کی خاطر یونین کا الیکشن لڑانے میں حصّہ لیا تھا جس میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ رات کو رسم کے مطابق شکست خوردہ امیدوار کا جنازہ نکلا۔ اس کے خاص خاص کام کرنے والوں کی تلاش ہوئی۔ اس رات بھی میں کمرے کے بجائے میکڈانل ہاسٹل کی دیوار کے سائے تلے آرام کر رہا تھا۔ لیکن جن کا نام مختار آزاد تھا وہ بڑی موٹی کھال کے سیاست باز تھے۔ اس کے بعد بھی سکریٹری شپ اور نائب صدارت کے امیدوار بن کر میدان مقابلہ میں اترتے رہے۔ بالآخر 'جوئندہ یابندہ' ایک سال کامیاب ہوئے اور نائب صدر منتخب کر لیے گئے۔ اس کے بعد میری اُن سے ملاقات دہلی میں ہوئی اور میں نے

علی گڑھ کا حال پوچھا تو ایک حقارت آمیز ہنسی کے ساتھ بولے: "کیا پوچھتے ہو، بس اس سے اندازہ کر لو کہ علی گڑھ نے مجھے یونین کا نائب صدر منتخب کر لیا ہے!" میں اس خود شناسی و احتسابی پر ہکا بکا رہ گیا۔ تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان ہجرت کر گئے، وہاں بھی نچلے نہیں بیٹھے۔ کراچی میں مزدور یونین کے سکریٹری بن گئے۔ چوں کہ ان کا خلوص اپنی ذات سے ہوتا تھا اس لیے اس کے لیے کچھ فوائد کارخانہ داروں سے حاصل کر لیے۔ مزدور بگڑ گئے اور پکڑ کر خوب مرمت کی۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

علی گڑھ میں ایم۔ اے (اردو) کے دو سال میری ذہنی ریاضت کا زمانہ تھا، اور ادبی تربیت کا بھی۔ شعبۂ اردو میں عرصۂ دراز سے دو ادبی انجمنیں کام کر رہی تھیں۔ اردوئے معلی اور حدیقۃ الشعر۔ ان کے تحت ادبی نشستیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ علی گڑھ کے ابھرتے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کے لیے یہ پلیٹ فارم کا کام دیتی تھیں ان میں اراکینِ شعبۂ رشید احمد صدیقی آل احمد سرور، معین احسن جذبی، ڈاکٹر محمد عزیز، خورشید الاسلام کے علاوہ مولوی ضیاء احمد بدایونی اور دیگر اہل ذوق شرکت کرتے۔ رشید صاحب اپنے طالب علموں کا حوصلہ بڑھانے میں کمال رکھتے تھے۔ ستائش کے ایسے جملے کہہ جاتے کہ ممدوح تک شرما جاتا۔ ان کا مقولہ تھا کہ میرا اس میں کیا بگڑتا ہے آپ لوگوں کا بھلا ہو جاتا ہے۔ کاش چھوٹوں کا دل بڑھانے کا یہ جمع خرچ ہمارے دوسرے اساتذہ کو بھی آتا۔

ایم۔ اے کے دوسرے سال میں سو نمبر کے ایک پرچے کے بجائے کسی موضوع پہ مختصر سا مقالہ لیا جا سکتا تھا۔ میں نے "پریم چند کی افسانہ نگاری کے دور" اپنے لیے موضوع منتخب کیا اور توقع سے زیادہ اس میں کامیابی حاصل کی۔ اس وقت تک، یعنی ۱۹۴۸ء تک پریم چند کی افسانہ نگاری کے بارے میں بہت زیادہ نہیں لکھا گیا تھا اسی لیے اس مقالے کے بعض ابواب مختلف رسائل اور کتابوں کے لیے نقل کر کے بھیجے جاتے رہے۔ اب پریم چند پر مستند اور غیر مستند خاصا تنقیدی مواد جمع ہو گیا ہے۔

اردو ایم۔اے کی تعلیم ہی کے دوران میری ہندی دانی کی بنیاد پڑی۔ایم۔اے کے پہلے سال میں ایک مشترکہ پرچہ فارسی اور ہندی کا ہوتا تھا۔ہندی پڑھانے کا انتظام یک۔نفری شعبۂ ہندی میں تھا جہاں پنڈت رام سروپ شاستری طلبہ کے انتظار میں اپنے شعبے میں گھنٹوں بیٹھے رہتے۔اس زمانے میں علی گڑھ میں طلبہ عام طور پر ہندی سیکھنے سے گریز کرتے تھے۔میں شامت کا مارا ایک دن پنڈت جی کے شعبے کی جانب جا نکلا جو اس وقت شعبۂ انگریزی کے کونے پر ڈیڑھ کمرے اور نصف چپراسی پر مشتمل تھا۔انھیں جب کوئی طالب علم مل جاتا تو اسے عبادت کے طور پر پڑھاتے۔گھنٹہ بھر کے بجائے دو گھنٹے دیتے۔اس خلوص کے باوجود طالب علم بہت جلد فارغ التحصیل، ہو کر بھاگ جاتے۔چوں کہ میں اپنی درسی ذمہ داری کو نہایت سنجیدگی سے ادا کرنے کا عادی تھا، اس لیے پنڈت جی نے مجھے مکمل طور اپنے چنگل میں لے لیا۔کسی روز اگر غائب ہو جاتا تو چپراسی بھیج کر مجھے آفتاب ہاسٹل سے (جو بالکل سامنے تھا) بلوا لیتے ابتدا میں تو مجھے یہ پکڑ دھکڑ اچھی نہیں معلوم ہوئی لیکن جب رفتہ رفتہ ہندی میں درک ہوتا گیا تو میرے ان کے درمیان 'گرو' اور 'چیلے' کا سا رابطہ قائم ہو گیا۔کہتے تھے کہ "مجھے اب تک صرف دو پُرخلوص طالب علم ملے ہیں۔سنسکرت میں اختر حسین رائے پوری اور ہندی میں مسعود حسین خاں"۔آج یہ سوچتا ہوں کہ ہندی دانی میرے کہاں کہاں اور کس کس رنگ میں کام آ رہی ہے تو پنڈت جی کی یاد میں میرا سر احسان مندی سے جھک جاتا ہے۔میری بعد کی گیت نگاری اور تاریخی لسانیات میں تحقیقی کام اسی ہندی دانی کی بدولت ممکن ہو سکا جو پنڈت جی کی دین ہے۔

مارچ ۱۹۴۱ء میں ایم۔اے۔کے امتحان سے فارغ ہوا تو ایک عجیب خلائے بافراغت کا احساس ہوا۔امتحان کی تیاری اور فرسٹ کلاس پانے کی دُھن میں وقت کے گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔اب فراغت تھی ایک خلاء کے احساس کے ساتھ۔اب آنکھیں منزلِ مقصود سے ہٹ کر اندر کی جانب کھلنے لگیں۔جب میں ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ آیا تھا تو مجموعی طور پر درجۂ اول کا طالب علم تھا لیکن اردو میں میری استعداد بہت اچھی نہیں تھی۔اس کا سبب میں تیسرے باب میں بتا چکا ہوں، میرا چار سال کا قیامِ ڈھاکہ تھا۔اس لیے علی گڑھ کے دو سالہ قیام میں

مجھے نہ صرف اردو ادب کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کا موقع ملا بلکہ رشید احمد صدیقی جیسے منجے ہوئے انشاء پرداز کے "فقروں" سے بھی ہمہ وقت سابقہ پڑا، جن پر علی گڑھ جان دیتا تھا۔ ایک بزرگ تو قبل از وقت موت تک کے لیے تیار تھے بشرطیکہ رشید صاحب انھیں اپنے "گنجہائے گراں مایہ" میں جگہ دے دیں۔ رشید صاحب اس پر آمادہ نہیں ہوئے اس لیے وہ ابھی تک بقیدِ حیات ہیں۔

رشید صاحب اور سرور صاحب کی عبارت اور اشارت ہی پہ کیا، اس عہد کا اردو کا طالب علم علی گڑھ کے در و دیوار سے "اردو تہذیب" کے آثار و اثرات کو جذب کرتا تھا۔ علی گڑھ نے دہلی و لکھنؤ کے ادبی اسکولوں کی حد بندیوں کو توڑ دیا تھا۔ لہجہ کے فرق کے باوجود تحریر و نگارش کی درجہ بندی ہو گئی تھی۔ جو مسلم یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد سے اپنی انگریز اور انگریزی پرستی کی وجہ سے نہ ہو سکا وہ طالب علموں کی یونین، مختلف ہاسٹلوں اور شعبوں کی انجمنوں اور "کافے ڈ پھوس" جیسے ریستوران کی ادبی نشستوں اور مباحثوں نے کمی پوری کر دی۔ ہر طرف شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ ہر نئی کتاب پر رائے آرائیاں ہوتیں، گرما گرم بحثیں جن کا انجام اکثر بخیر نہیں ہوتا تھا۔ اس سے ذہن کو جِلا ملتی۔ میں مقرر سے زیادہ سامع کا رول ادا کرتا لیکن بہر حال "انجذاب" کا عمل جاری رہتا۔ میرا خیال ہے کہ اگر تقسیم ملک کا حادثہ پیش نہیں آتا تو علی گڑھ متحدہ ہندوستان میں اردو کا سب سے بڑا گڑھ بن جاتا۔ ۱۹۴۰ء کے علی گڑھ میں اس کے آثار موجود تھے۔ انگریزی کا طلسم ٹوٹ رہا تھا۔ ہندی کا دور دور نہیں تھا۔ خود شعبۂ انگریزی کے اساتذہ اور طلباء میں اردو میں لکھنے اور کمال حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ خواجہ منظور حسین جیسے محترم اساتذہ اِن کی ہمت افزائی کر رہے تھے۔ سرور صاحب جیسے "دودھاری" شعبۂ انگریزی سے اردو میں منتقل ہو رہے تھے۔ رشید صاحب کا مکان باہر سے آنے والوں کے لیے "ادبی قیام گاہ" بنا ہوا تھا، جہاں سید سلیمان ندوی سے لے کر حسرت موہانی اور جگر مراد آبادی تک کا اجتماعِ ضدین ہوتا اور نونہالانِ علی گڑھ کو آدابِ نشست و برخاست سیکھنے کا موقع ملتا۔

میں اب اردو زبان کے رموز و نکات سے آشنا ہونے لگا تھا۔ الفاظ کے طلسمِ معنی کو سمجھنے اور ان میں احساس کی بکھری ہوئی بجلیوں سے متاثر ہونے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔

زبان کی قواعد کا بھی علم ہوا اور اس کی بے قاعدگیوں کا بھی۔ مجھے پہلی بار ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں زبان کا جو رول ہوتا ہے اس کا احساس ہوا۔ اور جس قدر یہ احساس گہرا ہوتا گیا میری اردو زبان سے محبت فزوں تر ہوتی گئی۔ اسی لیئے میں نے اوپر اردو کو ایک تہذیب کہا ہے۔ اب میں مذہب سے ہٹ کر زبان کی اصطلاحوں میں سوچنے لگا۔ خاص طور پر اس کے انشاپردازانہ اور شاعرانہ استعمال کے بارے میں اور اب مجھے اس قسم کے اشعار 'تعلّی' نہیں 'نکتہ راز' معلوم ہونے لگے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

اس طرح میرا شغف شعر اور مطالعۂ شعر سے بڑھتا گیا۔ یہ سب ایک طرح سے ذہنی تیاری بھی اس 'نزولِ شعر' کے لیئے جس کا آغاز سال بھر بعد ۴۲ء سے شروع ہو جاتا ہے۔

میری علی گڑھ میں تربیتِ شعر نہ ہوتی تو سخنوری تو کجا شاید سخن فہمی کی بھی نوبت نہ آتی۔ میں نے اس کا ایک عبرتناک منظر علی گڑھ ہی میں دیکھا تھا۔ جگر صاحب علی گڑھ تشریف لائے ہوئے تھے۔ حسبِ معمول رشید صاحب کے یہاں ان کا قیام تھا۔ رشید صاحب اپنے مہمان کی آمد پر تو مسرور ہوتے لیکن مہمان کے مہمانوں سے پریشان رہتے۔ خیر ایک سہ پہر جگر صاحب کے اعزاز میں مولوی ضیاء احمد بدایونی نے ایک مختصر سی نشست اپنے دولت کدے پر رکھی۔ میں بھی موجود تھا۔ جگر صاحب اس روز بہت موڈ میں تھے اور لہک لہک اپنا تازہ کلام سناتے رہے۔ چوں کہ مجمع مختصر اور سخن فہموں پر مشتمل تھا، خوب خوب داد مل رہی تھی۔ حاضرین میں فلسفے کی پروفیسر عمر الدین صاحب بھی تھے جنھیں ضیاء احمد صاحب نے بربنائے خلوص مدعو کر لیا تھا۔ چوں کہ سخن فہمی کی جانب سے معذور تھے اس لیے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے خاموشی کے ساتھ ہر شعر کے انجام پر غور کرتے رہے۔ ان کی سمجھ میں مطلق نہیں آرہا تھا کہ اہل مجلس اس قدر پھڑک کیوں جاتے ہیں۔ نشست کے خاتمے پر جب ہم لوگ اپنے اپنے جوتے پہننے میں مصروف تھے تو جگر صاحب نے مجھ سے آہستہ سے اشارہ کر کے پوچھا "مسعود صاحب! یہ کون بزرگ ہیں" میں نے کہا "آپ نہیں جانتے! یہ فلسفے کے پروفیسر ہیں۔ کیوں کوئی خاص

بات ؟" کہنے لگے "نہیں کوئی ایسی خاص بات نہیں البتہ کلام سناتے وقت میں دیکھ رہا تھا کہ میرے شعر مسلسل اُن سے ٹکرا کر واپس آجاتے تھے !"

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس زمانے میں سخن فہمی اور سخنوری کے لیے علی گڑھ سے بہتر کوئی محفل نہیں تھی۔ اختر انصاری، مجاز، سردار جعفری، جذبی، جاں نثار اختر، اختر الایمان، راز مراد آبادی شکیل بدایونی، مسعود علی ذوقی بزم پر چھائے ہوئے تھے۔ ان میں میرا ربط ضبط زیادہ تر اختر انصاری اور جذبی سے رہا۔ دونوں شعبۂ اردو میں میرے رفیق کار رہے۔ ایک 'نرگسیت' کا شکار تھا تو دوسرا 'خود رحمی' کا۔ لیکن دونوں نے اپنی ذہنی پیچیدگیوں کے اظہار کا وسیلہ شعر کو باکمال طریقے پر بنایا ہے۔ اختر الایمان کے بارے میں مجھے کبھی خیال نہیں آیا کہ وہ اس قدر کامیاب نظم نگار بنیں گے۔ جاں نثار اختر کی نزاکت خیال اور نازک احساسات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاتا تھا۔ سردار بہت جلد علی گڑھ سے نکل (بلکہ نکال دیئے گئے) گئے تھے۔ ان سے میری پہلی ملاقات علی گڑھ آنے سے قبل اینگلو عربک کالج میں ہوئی تھی جہاں میں تھرڈ ایر کا اور وہ فورتھ ایر کے طالب علم تھے۔ راز، شکیل، اختر سعید خاں اور ایسے بے شمار شاعر مشاعروں کے مرد میدان تھے اور اپنے ترنم کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے۔ مشاعرے کالج میں بھی ہوتے تھے لیکن علی گڑھ کی نمائش کا مشاعرہ بڑی دھوم دھام سے آتا۔ باہر سے آئے ہوئے اساتذہ کے درمیان علی گڑھ کے تازہ واردانِ بساطِ شعر اپنے بال و پر کھولتے۔ صنفِ نازک سے داد مل جاتی تو پھولے نہ سماتے۔ شاعر ہونے کے لیے 'شاعر' لگنا بھی ضروری تھا۔ بڑے بڑے بال، سفید علی گڑھ کٹ پاجامے پر سیاہ سرج کی شیروانی (عصمت چغتائی کی زبان میں کوڑیالے) جس کے اوپر کے بٹن کھلے ہوئے، ترکی ٹوپی تہ کی ہوئی احتیاط سے جیب میں رکھی ہوئی (تاکہ بوقت ضرورت کام آئے) ایک نگاہِ غلط انداز کے ساتھ گھنٹوں یار دوستوں کے ساتھ، نمائش گاہ میں تیز برقی قمقموں کی روشنی میں چکّر پر چکّر لگاتے۔ اپنی یا کسی دوست کی جیب میں پیسے ہوئے تو کباب پراٹھوں کی دوکانوں کی جانب جا نکلے اور خورجہ کے شلجم کے اچار کے ساتھ، گرما گرم بحث میں لقمۂ گرم نوش کیا۔ یہ معمول تقریباً دس بارہ روز تک رہتا۔ سیاہ برقعوں میں ملبوس (بقول شخصے کالی ناگنیں) جب سَر سراتی نمائش گاہ میں داخل ہوتیں تو دلوں کی دھڑکنیں بڑھ جاتیں۔ لیکن اسلامی سماج کی :

ہائے ری! مجبوریاں، محرومیاں، ناکامیاں

ایک جاں نثار اختر 'دگرس کالج کی لاری' پر ایک رومانی نظم لکھ مارتا اور ایک مجازؔ کو 'نمائش' میں حسن کے یہ پیکر نظر آتے :

وہ کچھ دوشیزگانِ ناز پرور

کھڑی ہیں اِک بساطی کی دُکان پر

وہ رُخساروں پہ ہلکی ہلکی سُرخی

لبوں میں پرفشاں روحِ گُلِ تر

تبسّم اور ہنسی کے نرم طوفاں

فضاؤں میں مسلسل بارشِ زر

اور جب شباب سے انقلاب کی جانب گریز ہوتا تو یہ مشورہ دیا جاتا ع

تو اس آنچل سے اِک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا (مجاز)

تسکین اور ذوقِ نظر دونوں کی کمی اور حجاب و نقاب کی زیادتی سے ایک اختر انصاری کے رومان میں بھی ازمنۂ وسطیٰ کی ایذا پرستی کی لذّت پیدا ہو جاتی :

یہ شاعری نہیں ہے تمنّا کی قبر پر

تعمیر ایک تاج محل کر رہا ہوں میں

اور کبھی ایک جذبیؔ کے یہاں ملال کی یہ جلتی ہوئی کیفیت ملتی ہے

وہ جو خوددار ہیں، خوددار رہیں اے غمِ دل

اُن سے کہدو کہ تمہیں یوں تو نہ چاہے گا کوئی

ڈوبتے چاند کی سوگند نہ جاؤں گا وہاں

میری بے خواب نگاہوں کو نہ سمجھے گا کوئی

میں علی گڑھ کے اس ادبی ماحول کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن مارچ ۱۹۴۱ء میں ایم۔اے کا امتحان دینے کے بعد زندگی کی نئی جولاگاہوں کی تلاش میں نکلنا ضروری ہو گیا تھا۔ دو سال کے بعد رومانوں کے اس شہرِ طرب اور دیوانوں کے اس دشتِ جنوں کو مراجعت مقدر ہو چکی تھی البتہ اس عرصے میں پہلے غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی گزرگاہوں سے گزرنا لازم تھا۔

چھٹا باب

(کچھ غمِ جاناں، کچھ غمِ دوراں)

اردو ایم۔اے کے انہماک میں نہ تو حال کا احساس ہوتا تھا اور نہ مستقبل کی فکر لاحق تھی۔۲۰ مارچ ۱۹۴۱ء کو جب امتحان کا آخری پرچہ کر کے ہاسٹل لوٹا تو ایسا معلوم ہوا جیسے صدیوں کی تھکن سوار ہو گئی ہو۔ بیکار ہو جانے کا احساس الگ تھا۔ علی گڑھ اب کاٹنے لگا اس لیۓ فوراً دہلی کے لیۓ روانہ ہو گیا۔ وہاں بھی جی نہ لگا تو وطنِ مالوف قائم گنج کی راہ لی۔ وہیں مجھے امتحان کے نتیجے سے آگاہی ہوئی۔ فرسٹ کلاس فرسٹ۔ فرسٹ کلاس تو یقینی تھا لیکن رؤف رونی جیسے 'پڑھو' اور مسعود علی ذوقی جیسے صاحبِ ذوق اور پختہ کار سے مقابلہ تھا۔ یہاں بھی وقت نہ کٹتا اگر آموں کی فصل نہ آجاتی! ان سے نپٹنا بھی ہم لوگوں کی زندگی کا ایک اہم مشغلہ تھا۔ نہال بھری پُری اور خوشحال تھی۔ خاندانی باغات تھے۔ ہر باغ سے 'جنس' مقرر ہوتی۔ اس لیۓ جب آموں کا موسم شروع ہوتا تو ان کی بھی آمد ہونے لگتی۔ آجکل کی طرح منافع کی خاطر قبل از وقت اُجاڑ نہیں کیا جاتا تھا اس لیۓ لذتِ کام و دہن کی آزمائش کے لیۓ طویل مدت ملتی۔ ہر وقت قلمی اور دیسی آم لگن میں بھیگے رہتے اور نوجوانانِ خاندان ان پر ہاتھ مارتے رہتے۔ جب یہ شہد بھری صراحیاں ہاتھ آجاتیں تو گندم و گوشت کی کس کو پروا رہتی۔ ایک بار میرے تیسرے ماموں غلام ربانی تاباں نے شرط بد کر ۲۲ دسہری آم ایک نشست میں کھائے تھے۔ چھوٹے ماموں خورشید عالم خاں۔ تو اس زمانے میں کھانا ترک کر دیتے، بس آم ہی آم، یہاں تک کہ معدہ

ساتھ چھوڑ جاتا۔ آموں کے ساتھ دودھ بھی بہ کثرت استعمال میں آتا کہ ان کا بدرقہ کہا جاتا ہے۔ چوں کہ گھر کی بھینسیں تھیں اس لیے دودھ کی ہانڈی صبح سے شام تک چولھے پر چڑھی رہتی جہاں یہ نہایت خفیف درجۂ حرارت پر اُبلتا رہتا۔ چند گھنٹے میں اس پر ملائی (یہاں بالائی بہتر) کی اس قدر موٹی سُرخ تہ جم جاتی کہ دیکھ کر دل پھسل جاتا۔ گھر کی مالکہ یعنی نانی صاحبہ ('بی') کی قدغن تھی کہ خبردار ملائی کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ وہ اس کو بلو کر مکھّن اور گھی نکالتی تھیں۔ اصلی مکھن اور گھی، آج کے برعکس صحت کے لیے گوشت سے کم نہیں سمجھے جاتے تھے۔ قائم گنج میں اُڑد کی دال اور قورمے کے لیے خالص گھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ مجھے بچپن سے ملائی کا چسکا پڑا ہوا تھا۔ میں بھی کرشن بھگتی کا دیہ کا 'ماکھن چور' تھا۔ فرق اتنا تھا کہ میں خود نہیں چراتا تھا بلکہ اس کے لیے دوسروں کی خدمات حاصل کرتا تھا۔ گھر ماموں زاد بہنوں سے بھرا ہوا تھا۔ جن میں اختری اور نجمہ بڑی تھیں۔ عمر میں یوں ہی بارہ تیرہ سال کی ہوں گی۔ نجمہ کو زیادہ بھولا پا کر اُسے یقین دلایا کہ چوری کی ساری ذمہ داری چوری کرانے والے کی ہوتی ہے نہ کہ چوری کرنے والے کی۔ چنانچہ خاص طور پر مغرب کے اندھیرے میں وہ اپنا کام کر جاتی اور پرچ بھری سُرخ تہ دار ملائی میرے کام و دہن کے کام آتی۔ اس قدر احتیاط کی جاتی تھی کہ دودھ کی 'ملیا' (ہانڈی) سے ساری کی ساری ملائی غائب نہ ہو جائے، صرف ایک حصّہ چمچے سے کاٹ کر نکال لیا جائے۔ لیکن اکثر اس پر کہرام مچ جاتا اور مجھے ع

میّا! میں ناہیں کھا یو ماکھن روٹی

کی صفائی پیش کرنا ہوتی۔ نانی صاحبہ بہت چیخ و پکار کرتیں۔ مختلف ملازموں اور ملازماؤں پر شبہ کیا جاتا۔ لیکن کبھی یہ سُراغ مل جاتا کہ اس سے فیض یاب کون ہوا ہے تو مجھے نہایت فراخ دلی سے معاف کر دیتیں؛ یہ کہہ کر کہ وہ تو چھٹیوں بھر کا مہمان ہے۔ البتہ نجمہ کو سخت تنبیہ کر دی جاتی۔

اِس ملائی چوری کے عمل میں اور جو ہوا سو ہوا مجھے نجمہ سے یک لخت دلچسپی کا احساس ہونے لگا۔ وہ مجھے زیادہ اچھی لگنے لگی، چھوٹا سا قد، نورجہانی خط و خال، "گدرایا سا جسم"، ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب وہ بچپن کی سرحدیں پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ لیکن اس بات کا سِرا بعد کو اُٹھایا جائے گا۔

۱۹۴۱ء میں گرما کی تعطیلات گزارتے وقت میرے سامنے وہی مسئلہ تھا جو ہر نوجوان کے سامنے تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ہوتا ہے۔ ملازمت کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ ہر چند اردو ایم۔ اے۔ اس وقت نیا نیا تھا اور اس کے فارغ التحصیل بھی زیادہ نہیں تھے، لیکن ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد لوگوں نے بھانپ لیا تھا کہ اس ڈگری کی زیادہ وقعت نہیں۔ ہر کوئی کہتا انگریزی میں ایم۔ اے کیوں نہیں کیا تاریخ بھی بری نہیں تھی۔ چنانچہ ٹھالی بنیا کیا کرے اِس کوٹھی کے دھان اُس کوٹھی میں، میں نے بھی ڈبل ایم۔ اے کی ٹھان لی۔ اس بار علی گڑھ کے بجائے دہلی کا رخ کیا۔ اور فلسفہ کو اپنا ہدف بنایا۔ زبان و ادب کا طالب علم ہونے کے باوجود فلسفے سے میری دلچسپی پرانی تھی اور بی طور پر اناپ شناپ اس کی کتابیں پڑھنا میرا محبوب مشغلہ رہا تھا۔ چنانچہ اپنے اس پرانے شوق کو پورا کرنے کے لیئے میں نے اردو سے بھی زیادہ بے مصرف مضمون، ایم۔ اے۔ فلسفہ میں دہلی جا کر داخلہ لے لیا۔ اب میں ہندو کالج کا طالب علم بن گیا جو اس وقت کشمیری گیٹ میں واقع تھا۔ کالج میں فلسفے کے تین استاد تھے۔ ڈاکٹر سکسینہ، ڈاکٹر اندرسین اور پریم چند۔ ایم۔ اے کی کلاسوں کے درس کی ذمہ داری اوّل الذکر دو حضرات کے سپرد تھی۔ سکسینہ صاحب رندِ شاہد باز تھے۔ جوش کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ ان کا ذکر جوش نے اپنی خود نوشت یادوں کی برات میں کیا ہے۔ ہر کالستھ کی طرح طلاقتِ لسانی اور لطیفہ گوئی پر قدرت رکھتے تھے۔ اندرسین ان کے برعکس تھے۔ ایک منظّم اور مرتّب شخصیت کے مالک۔ جرمنی سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ لائے تھے۔ علم حاضر تھا۔ بات رک رک کر اور سوچ سوچ کر ایک فلسفی کی طرح کرتے اور ہندو کالج کے ماحول کے تہیں معلوم ہوتے تھے چنانچہ ان کا حشر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ چند ہی سال کے بعد ملازمت چھوڑ کر پانڈیچری کے آشرم چلے گئے۔ ایم۔ اے کی کلاسوں میں صرف چار طالب علم تھے۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔ لڑکیوں میں اس زمانے کے مشہور سرجن ڈاکٹر جوشی کی صاحبزادی بھی تھیں۔ لڑکوں میں دہلی کے کالستھ گھرانے کے نگم تھے۔ وہ میرے ہمدم و ہم راز تھے۔ لیکن کالج سے نکلنے کے بعد زمانے میں ایسے گم ہوئے کہ عرصۂ دراز تک ان کا سراغ نہ مل سکا۔ ایک دن جب میں جامعہ ملیہ کا وائس چانسلر تھا، تو اچانک نمودار ہوئے۔

میں نے پہلی نظر میں انھیں پہچان لیا۔ دیر تک بیٹھے باتیں ہوا کیں۔ وعدہ وعید ہوئے کہ ملتے رہیں گے لیکن پھر پتہ نہ چل سکا وہ کہاں ہیں اور کیسے ہیں۔

اس زمانے میں ایک بار پھر میں اپنے بڑے چچا ذاکر میاں کے یہاں دلنصف مہمان کے طور پر مقیم تھا۔ یعنی جگہ کی قلت کی وجہ سے میں نے مکتبہ جامعہ سے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا تھا۔ البتہ کھانا چچا کے یہاں کھاتا تھا۔ اُن کی بڑی بچی اب سیانی ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی خیال میں آتی بھی، لیکن میں ابھی برسر روزگار نہیں تھا اور تھوڑے ہی عرصے میں گھر والوں کو بھی اندازہ ہو گیا کہ ہم دونوں کی طبائع ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔

یاد نہیں پڑتا کیوں، لیکن ایم۔ اے فلسفہ کے پہلے سال کی کلاسوں میں شرکت کرنے کے بعد میں نے اچانک امتحان نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے سمجھایا بھی لیکن اب مجھے قائم گنج پھر بلا رہا تھا۔

اپریل ۴۲ء، پھر وہی قائم گنج اور میں۔ وہی آم، وہی ملائی، وہی مردانے گھر کی طویل بیٹھکیں۔ صرف فرق یہ تھا کہ شاعری کی دیوی نے گدگدانا شروع کر دیا تھا۔ ہندی کے چھایا وادی گیت نگار اور ٹیگور کی گیتان جلی زیادہ تر زیر مطالعہ رہتے۔ اچانک معلوم ہوا کہ سینے میں دلِ گداختہ پیدا ہو چکا ہے۔ محبت اور پریم ایک لامحدود عمل کا تسلسل معلوم ہونے لگا۔ کس کا پریم، یہ نہیں بتا سکتا، بہرحال تھا وہ یوں پہلا گیت بن کر پھوٹا!

یہ کیا کہتے ہو تم پریتم!
ختم ہوئی وہ بات
پھول کے کان میں جو بھونرے نے
گن گن کر کے گائی
منھ سے کہہ نہ سکی جو تم سے
آنکھوں نے بتلائی

ختم کہاں وہ بات

وہ چلتی دن رات

ہم دونوں کا جیون اِس کے

سامنے اِک پرچھائیں

وقت کی چُپ چُپ بہتی گھڑیاں

اِس کو ناپ نہ پائیں

کھائی مات پہ مات

ختم کہاں وہ بات (۶۴۲)

میری شاعری میری زندگی ہے۔ جو اس 'خود نوشت' میں نہیں ملے گا وہ در پردہ اس میں مل جائے گا، اسی لیئے میں نے اس کا جا بجا سہارا لیا ہے۔ میں اب بھوترے اور بھول کا ذکر کر رہا تھا، آنکھوں کی اُلجھی بولی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، ہم دونوں کا پہلی بار تذکرہ زبان پر آنے لگا تھا، اور اس عزم کا اظہار کہ وقت ہمارے اپار پریم کو ناپ نہ پائے گا۔ شرح دل کے اِس سے زیادہ اشارے اور کیا فراہم کیئے جا سکتے ہیں۔ یقیناً میں نے کہیں مات کھائی تھی۔

شعر کی یہ تنہائیاں صرف آموں کے باغوں یا کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر میسّر ہوتیں۔ میرا زیادہ وقت مردانے گھر کی بیٹھک میں گزرتا جہاں بڑے ماموں "اڈّا میاں" کی مرکزی شخصیت کے ارد گرد لوگوں کا ہجوم رہتا۔ سیاست پر گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ دوسری جنگِ عظیم کی خبروں پر تبصرہ ہوتا کسی شریکِ محفل کو ہدف بنا کر اس کا مذاق اڑایا جاتا۔ اصل مسئلہ وقت کاٹنے کا تھا۔

میرے ماموؤں کے پاس تمام زمینداروں کی طرح وقت کی بہتات تھی اس لیئے ہر قسم کے لوگ اپنی اپنی سہولت کے مطابق آتے اور ان کے اوقات کے کچھ حصّے پر قابض ہو جاتے۔

جب ان نشستوں سے اکتا جاتا تو 'کوٹھی' کا رخ کرتا۔ یہ ہمارے زنانے اور مردانے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر بوڑھے ابّا (حاجی فضل امام خاں) کی بیٹھک تھی۔ یہیں سے وہ کپڑے کا کاروبار کرتے اور یہیں کاشتکاری کے آلات، بیل، بھینس اور گھوڑوں وغیرہ کے رہنے کا انتظام تھا۔ ان کے بعد سے اس کے کمرے اور ہال خالی پڑے رہتے تھے۔ چنانچہ

تعطیلات میں میں اپنا 'پھڑ' وہیں جمالیتا۔ یہیں میں نے ہندی اور سنسکرت کا درس لیا، یہیں میری ورزش کا ساز و سامان مگدر وغیرہ رکھے رہتے اور یہیں میرا گوشۂ تنہائی تھا۔

۲۴ء کا بیشتر حصہ میں نے یہیں گزارا۔ یہیں سے صبح و شام ڈنڈا ہاتھ میں لے کر کھیتوں اور باغوں کی جانب ٹہلنے نکل جاتا۔ تھوڑے فاصلے پر ریل کی پٹری تھی ٹہلنے کے لئے یہ بہت اچھی جگہ تھی۔ میرے ساتھ اکثر منجھلے ماموں (جو بعد کو میرے خسر بنے) بھی ہوتے۔ ایک دن صبح کے وقت ہم لوگ ریل کی پٹری کے راستے پر ٹہلتے دور جا نکلے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا "کیا تھک گئے ہو!" میں نے کہا "آپ تھک گئے ہوں گے، میں تو نہیں تھکا ہوں"۔ بس پھر کیا تھا ہم دونوں کی پٹھانی رگ چڑھ گئی۔ اب نہ وہ لوٹنے کا نام لیتے ہیں اور نہ میں۔ ایک دو تین چار، پانچ میل بس چلتے ہی چلے گئے۔ حتی کہ اگلے اسٹیشن رُودائن تک پہنچ گئے جو چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ اب دونوں کا بُرا حال تھا لیکن پٹھانی ضد ہم ضدا میں لوٹنے کا کوئی بھی نام نہیں لیتا تھا رفتہ رفتہ جسمانی تھکن کے پردے میں عقل آنا شروع ہوئی اور دونوں ایک مقام سے پیچھے کی طرف یک لخت لوٹ پڑے اس طرح کہ ع

نہ اُن کی جیت ہوئی اور نہ میری ہار ہوئی

قائم گنج کے ان دنوں کی یادوں کی سیربین میں آج کئی کردار ابھرتے ہیں۔ ان میں نورعالم خاں (چچانوری) کی شخصیت سب سے دلچسپ تھی۔ وہ ہماری ننھیال کے قرابت داروں میں تھے، لیکن غریب تھے۔ انھیں شکایت تھی کہ حاجی فضل امام خاں نے اپنی ساری جائداد اپنے بھتیجے جان عالم خاں دے دی اور اپنے بھانجے نورعالم خاں کو کچھ نہیں دیا ورنہ ان کی حالت آج یہ نہ ہوتی۔ تاہم خون پانی سے گاڑھا ہوتا ہے۔ اس لیے رشتہ توڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ اپنی ناداری اور احساس کمتری کو وہ ہیکڑی سے چھپاتے تھے۔ حلیہ کے اعتبار سے پنڈاری معلوم ہوتے تھے یعنی داڑھی ٹھوڑی پر دو حصوں میں منقسم رکھتے۔ پڑھے لکھے بہت کم تھے لیکن علم مجلسی رکھتے تھے۔ آمدنی کا ذریعہ بڑھانے کے سلسلے میں انھیں کسی پیشے یا فن سے عار نہیں تھا جوا بھی کھیل لیتے تھے اور ایک بار کا داؤں تو اتنا کامیاب رہا کہ دوسرے

کی لڑکی تک کو جیت لائے۔ ہارنے والا بھی بستی کا پٹھان تھا اور جب اُن سے مسلسل ہارتا گیا تو بات کی تپچ کے لیے آخری داؤں پر اپنی نوجوان بیٹی کو لگا دیا۔ نورعالم خاں یا تو قسمت کے دھنی تھے یا یہ اُن کے ہاتھ کی صفائی تھی یہ داؤں بھی جیت گئے۔ پٹھان کی بھوں پر میل تک نہیں آیا۔ لڑکی کو بُلایا اور اُن کے حوالے کیا۔ یہ جھٹ جا کر یکّہ لائے، پردے کے لیے چادر باندھی اور سواری کو گھر لے آئے۔ فوراً ایک مُلّا کا انتظام کیا گیا اور نکاح پڑھایا گیا۔ یہ سب ان کی پہلی بیوی کے سامنے ہوا جس نے نہایت صبر سے اِس تماشے کو دیکھا۔ ساری رسمیں پوری ہونے کے بعد شام کو انھوں نے میکے جانے کی اجازت لی اور پھر کبھی نہیں لوٹیں۔

نورعالم خاں نہ صرف ہیکڑی باز تھے، پرلے درجے کے مختار بھی تھے۔ جانوروں کی شناخت کا انھیں خاص ملکہ تھا۔ لوگ خوشامد کرکے انھیں میلوں اور ہاٹوں میں لے جاتے اور اُن کے مشورے سے جانور خریدتے۔ شام کو جب وہ ہمارے یہاں آکر بیٹھتے تو کہتے میں نے فلاں کو بھینس خرید وا دی، فلاں کو گائے۔ اِس انداز میں گویا قیمت انھوں نے جیبِ خاص سے ادا کی ہو۔

ان کے بھائی دیدارعالم خاں گوشت کھانے کے بہت شوقین تھے۔ چوں کہ عام طور پر بکری کا گوشت فروخت کرنے والے 'چک' ذات کے ہندو ہوتے، اس لیے انھیں کسی مسلمان کی خدمات کی ضرورت ہوتی کہ ذبیحہ فراہم کرسکیں۔ دیدارعالم خاں کی خدمات اِس کے لیے موجود تھیں۔ صبح ہوئی اور ہاتھ میں لے کر چھری نکلے۔ اس خدمت کے لیے شیکسپیر کے یہودی کی طرح وہ پاؤ بھر گوشت کے حقدار بن جاتے۔ خاں صاحب کو پاؤ بھر گوشت مل جائے تو کیا بات اور وہ بھی مفت۔

سیاسی اعتبار سے یہ بڑی ہل چل کا زمانہ تھا۔ مسلم لیگ کی سیاست شباب پر تھی ؎

مُسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

کا ترانہ ہر ایک کی زبان پر تھا۔ مجروحؔ سلطان پوری قائم گنج آکر مہینوں ہمارے یہاں قیام کرتے اور نہایت خوش الحانی سے اپنی سیاسی غزلیں اہلِ قائم گنج کو سُناتے:

مسلمانو! نہ گھبراؤ خدا کی شان باقی ہے
ابھی اسلام زندہ ہے ابھی قرآن باقی ہے

مسلم لیگ کے مقامی شاعر حفیظ مجیبی صاحب تھے جو فرخ آباد سے ہفتہ وار مجیب نکالتے تھے۔ ان کا بڑے ماموں صاحب سے بڑا ربط ضبط تھا۔ پرانے خلافتی تھے، اب مسلم لیگ میں آ گئے تھے۔ ان کی بعض سیاسی نظمیں اور غزلیں محلوں میں پٹھان بچے گاتے پھرتے تھے۔ مسلم لیگ کا اس قدر دور دورہ تھا کہ اس کا اثر مسلمانوں کے کم پڑھے لکھے طبقات تک پھیل چکا تھا۔ جو لوگ اس منظر کو دیکھ چکے ہیں وہ پنڈت جواہر لال نہرو کے اس خیال سے کبھی متفق نہیں ہو سکتے کہ مسلم لیگ اس وقت صرف مسلم زمینداروں اور اعلیٰ طبقوں کا رچایا ہوا تماشا تھی۔ مسلمانوں میں ہر طرف بے اطمینانی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے برسر اقتدار آنے کے بعد یہ بے اطمینانی اور بڑھ گئی تھی۔ جاہل لوگ بھی ہندو مسلمان کی اصطلاحوں میں سوچنے لگے تھے۔ ہمارے محلّے میں مشرّف حسین خاں ٹیلر ماسٹر تھے جو اردو میں بس "شُد بُد" رکھتے تھے لیکن سیاسی ہنگاموں کی وجہ سے اردو کے ایک روزنامے کا مطالعہ اُن کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ ہجّے کر کے رُک رُک کر پڑھتے تھے، مگر پڑھتے تھے۔ ایک دن اردو کا اخبار ہاتھ میں لیے "کف در دہاں" ہمارے یہاں آئے اور کہنے لگے "اڈّا میاں (سلطان عالم خاں کے لیے) آپ کے ہوتے ہوئے یہ کیا غضب ہے کہ روز "ہندو کو ڈبل" ہے اور مسلمان کو کچھ نہیں۔ دیکھا تو "ہندو کو ڈبل" کی سُرخی تھی جس کا اس زمانے میں بڑا چرچا تھا۔

اس زمانے میں یعنی قائم گنج کے طویل قیام میں مَیں نے دو کام اور کر ڈالے۔ ایک طرف تو صحت بنانے کا پروگرام بنا لیا۔ ڈنڈ اور بیٹھک اور مگدر کا شوق اور دوسری طرف بھینس کی وساطت سے دودھ ملائی، کا کثرت سے استعمال۔ مجھے وزن بڑھانے کا بڑا شوق تھا۔ اس لیے کہ میں کثرتِ غذا کے باوجود مسلسل کم وزن رہتا تھا۔ دبلا اس قدر تھا کہ پسلیاں گنی جا سکتی تھیں۔ نرخرے کی ہڈی اس قدر نمایاں تھی کہ شیروانی کا ہک لگانا مشکل ہو جاتا۔ آج اس کے برعکس ہے یعنی قلّتِ غذا کے باوجود زیادہ وزن رکھتا ہوں۔ کوئی تدبیر

نہ اس وقت کارگر ہوتی تھی اور نہ اب ہوتی ہے۔ ہمارے خاندان میں تیس۳۰ کے پیٹے میں جاکر خود بخود وزن بڑھنے لگتا ہے۔ جوانی بھری ہوئی نہیں ہوتی۔ ایک دوسرا کام یہ کیا کہ مقامی پاٹ شالہ کے ایک بنارسی پنڈت کو ہندی اور سنسکرت پڑھنے کے لیے بہت قلیل مشاہرے پر مقرر کر لیا۔ وہ اس کے لیے روز تین میل مسافت طے کر کے آتے اور اگر میں گھنٹہ بھر درس کا شغل رکھنا چاہتا تھا تو وہ جوشِ مُعلّمی میں دو گھنٹے پڑھاتے۔ ساتھ ساتھ ہر بیماری کے لیے ویدک کے نسخے بھی بتاتے جاتے۔ تلسی کا پودا اُن کے نزدیک ہر مرض کی دوا تھا۔ میں نے اسے نزلہ کھانسی کے لیے آزمایا، اور اس کے بعد یہ گھر کے آنگن کی ہمیشہ زینت رہا۔

۱۹۴۲ء کا قیام قائم گنج جہاں میرے لیے اکتسابِ ہندی کے لیے یادگار رہا۔ اس سے زیادہ یادگار اس لیے بھی رہا کہ دودھ اور ملائی کے توسط سے میری رسائی رفتہ رفتہ اس شخصیت تک ہونے لگی جس کے مقدّر میں میری رفیقۂ حیات بننا لکھا تھا۔ نجمہ میرے دوسرے ماموں، قدوس عالم خاں کی بڑی لڑکی تھی۔ اُن کی شادی، روایات کے برخلاف، آفریدی پٹھانوں سے باہر علی گڑھ کے شیروانی پٹھانوں میں ہوئی تھی۔ نجمہ کی والدہ رئیس دتاولی نواب یوسف خاں شیروانی کی صاحبزادی اور نواب فراہیم خاں صاحب (رئیسِ بڈھانسی) کی چھوٹی بہن تھیں۔ ان کی شادی میں قائم گنج کے پٹھانوں نے بڑے بڑے لطیفے کیے تھے۔ ایک صاحب فیرنی کی بیس۲۰ پچیس طشتریاں کھا گئے۔ دوسرے صاحب ہاتھ ٹیک ٹیک کر گوشت کی قابیں دوسرے مہمانوں کے سامنے سے اٹھا لیتے تھے۔ شادی کے بعد شیروانیوں میں ان ناکندہ تراشوں کی بوالعجبیوں کا کافی دن تک چرچا رہا۔ بچاری دلہن نے جب قائم گنج کا ماحول دیکھا تو پہلے دن سے انھیں احساس ہو گیا کہ نبھانا پڑے گا۔ وہ ہم سب بچوں کو مسعود میاں، خورشید میاں کہہ کر مخاطب کرتیں جب کہ گھر والے مسعودا، خورشیدا، کے نام سے یاد کرتے دلہن تو میں نام الف زائدہ کے ساتھ لیا جاتا ہے، کھانے پینے کے طریقے، آداب، مذہب کی جانب رویّہ غرض کہ ہر چیز اُس ماحول سے مختلف تھی، جس میں اُن کی پرورش ہوئی تھی۔ لیکن شاباش ہے اس شیروانی بیٹی کو جس نے سب کچھ جھیلا اور اُف تک نہ کی اور اپنے شوہر اور بچوں کی جی جان

سے خدمت کرتی رہی۔ دوسری ممانیاں جب ساس (نانی صاحبہ) سے ٹکراتیں تو کم وبیش دل کی بھڑاس نکال لیتیں۔ یہ بے چاری خاموشی کے ساتھ اوپر چھت پر چلی جاتیں جہاں انھوں نے اپنے لیے ایک کوٹھری اور سامنے کا برآمدہ مخصوص کرلیا تھا۔ نانی صاحبہ نے اسی لیے انھیں "چھینکے کی ہنڈیا" کا لقب دیا تھا۔ مجھے وہ دلھناپے سے پسند تھیں۔ اکثر ان کے گھونگھٹ میں اپنا منہ ڈال دیتا اور اُن کا مسعود میاں، مسعود میاں کہتے منہ سوکھتا تھا۔ جوں جوں ان کی بڑی بیٹی نجمہ سیانی ہوتی گئی اُن کا دھیان میری طرف ہوتا گیا۔ میرے خیال میں ہماری شادی کا منصوبہ ان کے ذہن میں خود ہمارے فیصلوں سے بہت پہلے بن چکا تھا۔ یہ شاید جلد معرضِ وجود میں آجاتا کہ اچانک وہ دق کے موذی مرض شکار ہوگئیں جس کا سلسلہ ۷ سال تک چلتا رہا۔

پہلے تذکرہ کرچکا ہوں کہ ۱۹۴۱ء کی تعطیلات گرما میں مجھے پہلی بار نجمہ سے قربت کا احساس ہوا کچھ تو اس کا الھڑپن اور کچھ اس کی لڑکوں جیسی شرارتیں، جس پر اس کی والدہ خوب دُھنتیں تھیں، بھانے لگیں۔ وہ اس وقت ۱۱، ۱۲ برس کی ہوگی۔ معلوم نہیں کیوں اُسے میری خدمت کرنے میں لطف آتا تھا۔ کھانا کھلانا، دودھ مہیا کرنا اور خاص طور پر چھپا کر میرے لیے ملائی نکال لانا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے پیچھے کچھ جنسی جذبے کی کارفرمائی تھی۔ وہ اب تک اس کا اقرار نہیں کرتیں۔ میں اس سے عمر میں بہت بڑا تھا، یعنی ایم۔اے کرچکا تھا۔ میرے خیال میں میری اس کی قربت صرف مشترکہ خاندان کی یکجا رہائش کا نتیجہ تھی۔ میں اِس وقت اسے کسی جنسی نقطۂ نظر سے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا، بس 'اچھی لگنا' سے تعبیر کرسکتا ہوں۔ دوسری بہنوں کو بھی (بڑے ماموں کی لڑکی اختری اس سے بڑی تھی)، یہ احساس ہونے لگا کہ میں اسے پسند کرتا ہوں اور اسے میری خدمت میں لطف آتا ہے۔

ستمبر ۱۹۴۲ء کی ایک شام بہرحال جو مبہم تھا وہ واضح ہوگیا، جو سویا ہوا تھا وہ بیدار ہوگیا، جب نئے گھر کی چھت کے سائبان میں، میں لیٹا ہوا تھا اور وہ میرے سرہانے سلمٰی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ سلمٰی کے جانے کے بعد اچانک میں نے پوچھا "میرے ساتھ دہلی

چلوگی؟" اور اس نے نہایت معصومیت سے جواب دیا "ہاں چلوگی"۔ میں نے اچانک اس کا سر جھکایا اور ایک بوسہ لے لیا۔ نجمہ آج تک اس بات پر مصر ہے کہ اس کے جواب کی تہ میں کوئی ایسا خیال نہیں تھا، اور میں بھی یہی سمجھتا ہوں، لیکن اپنی اِس حرکت پر میرے بدن میں کرنٹ سا دوڑ گیا اور مجھے صحیح معنوں میں پہلی بار احساس ہوا کہ میں نجمہ کے بہت قریب آگیا ہوں۔

اس کے کچھ عرصے کے بعد مجھے آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے انٹرویو کارڈ ملا، جہاں میں نے پروگرام اسسٹنٹ کی جگہ کے لیے کئی مہینے پہلے درخواست دے رکھی تھی۔ انٹرویو کمیٹی کے صدر ڈائریکٹر جنرل پطرس بخاری تھے اور اس کے ایک رکن ڈاکٹر ذاکر حسین بھی تھے، جس کا علم مجھے پہلے سے نہیں تھا۔ اس بار میں نے اپنے دوست حبیب اللہ خاں کے یہاں قیام کیا، کچھ اس مصلحت سے کہ میں اب تک اچکن دھاری تھا اور چاہتا تھا انٹرویو میں سوٹ پہن کر جاؤں۔ حبیب اللہ نے مجھے ایک اچھا سوٹ مستعار دیا اور جب پہن کر چلا تو کہنے لگے اس سوٹ میں تمہارا کون انتخاب نہیں کرے گا۔ انٹرویو آل انڈیا ریڈیو، دہلی کے دفتر میں تھا جو اس وقت علی پور روڈ پر تھا۔ جب میں انٹرویو کے لیے کمرے میں داخل ہوا تو ذاکر میاں مجھے سوٹ میں ملبوس دیکھ کر مسکرائے۔ (انھوں نے مجھے اس حلیے میں کبھی نہیں دیکھا تھا) اور بخاری صاحب سے کہا "یہ میرے عزیز ہیں لیکن میں انھیں اس لباس میں نہیں پہچانتا!" اس کے بعد بیشتر سوالات بخاری صاحب ہی نے کیے۔ انھیں یہ جان کر تعجب ہوا کہ علی گڑھ کا تعلیم یافتہ اور بہت اچھی ہندی جانتا ہے۔ اس کے بعد تیسرے صاحب سے کہا کہ ذرا ان کی ہندی کی خبر لیجیے۔ انھوں نے چند باتیں پوچھیں اور مطمئن ہو گئے۔ میں نے ہندی پنڈت رام سروپ شاستری اور بنارس کے ایک پنڈت سے پڑھی تھی، اس لیے وہ میرے 'شدھ' تلفظ سے زیادہ متاثر ہوئے۔

دوسرے ہی روز، ذاکر میاں سے ملے بغیر میں قائم گنج واپس چلا گیا۔ مہینہ بھر کے اندر اطلاع ملی کہ میرا انتخاب بحیثیت پروگرام اسسٹنٹ ہو گیا ہے اور میری ملازمت کا آغاز دہلی اسٹیشن سے ہوگا۔ میری خواہش بھی یہی تھی، تیار بیٹھا تھا، فوراً دہلی کے لیے روانہ ہو گیا اور وہاں کے اسٹیشن ڈائریکٹر اڈوانی صاحب کو اپنی آمد کی رپورٹ دی۔ مجھے ہندوستانی ٹاکس

سیکشن میں لگایا گیا جس کے پروگرام ایگزیکٹو ن۔م۔راشد تھے۔ ان کی ماورا ایک سال قبل شائع ہو چکی تھی اور ادبی حلقوں میں اس کا خاصا چرچا تھا۔ میں نے راشد کے 'ماورا' کا مطالعہ بالاستیعاب کیا تھا اور اس سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ جنسیت کے حاوی رجحان کے باوجود یہ اپنی ہیئت، اسلوب اور اظہار کے لحاظ سے مجھے کرشن چندر کے الفاظ میں "ایک نئے تجرباتی دور کی تمہید" معلوم ہوئی۔ چنانچہ میں راشد کا نام سن کر بڑی عقیدت کے ساتھ اپنے پروگرام ایگزیکٹو کے کمرے میں داخل ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں اقبال کو روبرو دیکھ کر پہلا دھچکا لگا تھا۔ راشد کے غیر شاعرانہ حلیہ پر نظر پڑی تو دوسرا دھچکا لگا۔ میں یقین تک نہیں کر سکا کہ 'ماورا' کا خالق اس افسرانہ شان کا مالک ہو سکتا ہے۔ بات چیت کا انداز بھی غیر شاعرانہ تھا۔ چنانچہ میں راشد شاعر کو بالکل بھول گیا اور اب افسر راشد کے ساتھ دن کٹنے لگے۔

مجھے پہلی بار اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ یوپی اور دہلی کا آدمی اپنے پنجابی واقف کاروں سے کیوں تال میل نہیں رکھتا۔ اور وہ ہم لوگوں کو کیوں لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔ راوی اور گنگا کا سنگم کیوں ناممکن ہے میرے قیام کا انتظام اینگلو عربک کالج کے ہاسٹل کے ایک کمرے میں مرزا محمود بیگ صاحب کی عنایت سے ہو گیا۔ میرے قیام کا انتظام اینگلو عربک کالج کے ہاسٹل کے ایک کمرے میں مرزا محمود بیگ صاحب کی عنایت سے ہو گیا۔ کمرہ کیا تھا غازی الدین حیدر کے مدرسے کا ایک حجرہ تھا۔ پاس کے حجرے میں میرے علی گڑھ کے دوست ڈاکٹر خورشید فاروق، استاد عربی رہتے تھے۔ قائم گنج سے میں گھر کی ملازمہ آشرا کی ماں کے چھوٹے بیٹے سید (صفدر علی) کو ساتھ لے گیا۔ بڑا کاریگر آدمی تھا مگر کھانا حسب منشاء پکاتا تھا۔ البتہ کھلانے سے زیادہ خود کھانے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

چوں کہ علی پور کا ریڈیو اسٹیشن اجمیری دروازے سے خاصے فاصلے پر تھا، اس لیے میں قرب و جوار میں کسی مناسب جگہ کی تلاش میں رہا۔ دہلی یونیورسٹی کے کوارٹرز میں اینگلو عربک کالج کے انگریزی کے ایک استاد عباسی صاحب تنہا رہتے تھے۔ انھوں نے جب میری حاجت کا تذکرہ سنا، فوراً حاجت روا بن کر اپنے ساتھ رہنے کی پیش کش کی۔ عام طور پر کوئی پیشکش بہت آسانی سے مل جائے تو میں اسے مشتبہ سمجھتا ہوں، لیکن اس وقت نہ سمجھ سکا کہ یہ بھی ان کے لکھنوی تکلفات کا ایک انداز تھا اور سادہ لوحی میں سید کے ساتھ اپنا مختصر سا

اسباب باندھ کر ایک اتوار کو اُن کے یہاں پہنچ گیا۔ اس وقت وہ اپنے اصلی رنگ میں نظر آئے۔ دروغ گورا بہانہ بسیار، کسی بھی طرح مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر تیار آمادہ نظر نہیں آئے، لیکن اتنا کیا کہ پڑوس کے ایک کوارٹر جس پر ایک سردار جی نے قبضہ کر رکھا تھا اور وہ بھی تنہا تھے، مجھے ان کے سر تھوپ دیا۔ سردار جی دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ کے طالب علم تھے۔ دن بھر غائب رہتے اور رات کو نمودار ہو جاتے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ ہم کوارٹر کے صحن میں سوتے تھے۔ مجھے یہ بعد کو معلوم ہوا کہ سردار جی از روئے احتیاط رات کو تالا لگا دیتے تھے۔ میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی اس لیے کہ اپنے کمرے کے سامنے میری چارپائی ہوتی تھی۔ باہر کے برآمدے میں میرا ملازم سوتا تھا۔ دو تین راتیں خیریت سے گزریں۔ ایک صبح جب اٹھا تو دیکھا کمرے کا دروازہ کھلا پڑا ہے اندر گیا تو "صفاً صفا" یعنی میری تمام املاکِ منقولہ، سوٹ کیس، کپڑے۔ گھڑی جوتے کوئی شب زندہ دار اٹھا کر لے گیا ہے۔ صرف سائیکل رہ گئی تھی، اسی پر سوار ریڈیو اسٹیشن کے دفتر بھاگا۔ ساتھیوں کی ہمدردی سے اور خفّت ہوتی تھی، اس لیے کہ زبانی خرچ تھا۔ البتہ ن۔م۔ راشد نے مجھے مالی امداد کی پیش کش کی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اس آفیسر ٹائپ شاعر کے سینے میں دل بھی ہے۔ لیکن میں نے ان کی یہ پیش کش قبول نہیں کی اس لیے کہ میرے ملازم کے پاس اس قدر روپے تھے کہ میں قائم گنج پہنچ سکوں۔ صرف چند روز کی چھٹی کی درخواست کی، جو فوراً مل گئی۔ سیدھا قائم گنج پہنچا اور ارجنٹ آرڈر پر کپڑے سلوائے۔ چند روز جو وہاں گذرے وہ خفّت درخفّت گذرے۔ میری ذہانت کی ساکھ اس وقت بالکل ختم ہو گئی جب بچّہ نے بھی میری ہنسی اڑائی ؎

لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لُٹاتا نہ گھر کو میں

وہاں سے واپس آکر میں نے پھر اینگلو عربک کالج کی جانب مراجعت کی جہاں میرا حجرہ ابھی تک خالی تھا۔

اسی زمانے میں ہم لوگوں کو حکم ملا کہ ریڈیو اسٹیشن علی پور روڈ سے نئی عمارت پارلیمنٹ اسٹریٹ (موجودہ سنسد روڈ) میں منتقل کیا جائے گا۔ اس طرح کہ براڈ کاسٹ میں

کوئی خلل نہیں پڑے۔ اس میں کئی روز لگ گئے۔ بالآخر نئی عمارت میں آ کر میں نے ہندوستانی ٹاکس انچارج کی حیثیت سے کام شروع کیا، یعنی اُردو، ہندی دونوں زبانوں کی ٹاکس کا پروگرام بنانا اور پھر اُن کے لیے مناسب ٹاکرز کو بُک کرنا میری ذمہ داری ہو گئی۔ اسی زمانے میں میں نے نگیندر رنگاچاری کو جو کامرس کالج میں ہندی کے لکچرر تھے ریڈیو سے متعارف کرایا۔ اُردو میں مرزا محمود بیگ نے تو اپنی پہلی تقریر میرے ہی کہنے پر نشر کی۔ بعد کو وہ دہلی اسٹیشن کے بہترین اردو میں نشر کرنے والے قرار پائے۔ سُنا ہے ان کی منتخب ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ حال میں شائع ہونے والا ہے۔ ان کے علاوہ علی گڑھ سے بہت سے حضرات کو کھینچ کر ریڈیو کی دُنیا میں لایا۔ اِس زمانے میں بخاری صاحب اس بات کے لیے کوشاں رہتے کہ پروگرام اسسٹنٹ کو میز ہی تک اپنی کارروائی محدود نہیں رکھنی چاہیے بلکہ 'میدان' میں جا کر نئے نئے خیالات اور نئے نئے براڈکاسٹ کرنے والوں کو تلاش کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس سلسلے میں میرا اکثر علی گڑھ اور آگرے جانا ہوتا تھا۔ میرے بعد اعجاز حسین بٹالوی چارہ اور چارہ گر کی تلاش میں اکثر علی گڑھ آتے اور میرے ساتھ امین ہاسٹل میں قیام کرتے۔ وہ بڑی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ خالص لاہور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے اس لیے علی گڑھ کے نستعلیق اور "بہ ریک بولی" بولنے والے حضرات ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ اس کے بعد ان سے سابقہ لندن میں پڑا جس کی تفصیل "دیارِ فرنگ" والے باب میں آئے گی۔

ریڈیو اسٹیشن ہی پر میں نے پہلی بار میراجی کو دیکھا۔ وہ اُس وقت ریڈیو آرٹسٹ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ میلی سی پتلون کے اوپر شیروانی پہنے اور کتابوں یا مسودات کے بنڈل ہاتھ میں لیے پاس والے کمرے میں آ کر بیٹھ جاتے۔ ان سے شیروانی کے اشتراک باوجود دونوں ایک دوسرے سے فاصلے پر رہتے۔ البتہ ایک صاحب نے مجھے اُن کی اس پیشن گوئی سے آگاہ ضرور کیا کہ "مسعود، بے چارہ شریف آدمی ہے، ریڈیو اسٹیشن کی گوں کا نہیں"۔ لیکن اسسٹنٹ ڈائرکٹر فریدی میرے کام سے بہت مطمئن تھے۔ شام کو ہفتے میں دو بار پروگرام اسٹیشنوں کی ٹرانسمیشن پر بھی ڈیوٹی لگتی۔ ایسے میں اگر کسی مقتدر شخصیت کا براڈکاسٹ ہوتا تو پطرس بخاری بہ نفسِ نفیس اچانک نمودار ہو جاتے۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ انھوں نے بھی ایک جگہ میری

تعریف کرنے کے بعد یہ الفاظ کہے تھے کہ میں "ریڈیو ٹائپ" نہیں لگتا۔ ان کا یہ کہنا صحیح تھا، اس لیئے کہ علی گڑھ کا تعلیم یافتہ پاجامہ اور شیروانی پہنے لاہور کے کالجوں کے سوٹ بوٹ پہننے والے سجیلے نوجوانوں سے بالکل مختلف ہوتا تھا، اور بخاری انھیں سجیلوں کو پسند کرتے تھے۔

ابھی میری ریڈیو کی ملازمت کو چھ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ دوسروں کی طرح مجھے بھی محسوس ہونے لگا کہ غلط جگہ آ پھنسا ہوں۔ کچھ روز غلطاں و پیچاں رہا، نکلوں تو کہاں نکلوں۔ ایک روز اچانک استعفا لے کر اسٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں پہنچ گیا۔ مزید انگشت بدنداں تھے۔ ڈرامہ سیکشن کے انچارج ناصری (دہلوی) میرا جی کی پیشین گوئی کا ذکر کرتے ہوئے پائے گئے۔ گرجا کمار ماتھر، جو اس وقت محض ریڈیو آرٹسٹ تھے یہ سن کر میرے پاس آئے اور سمجھانے لگے کہ ایسی اچھی سرکاری ملازمتیں کہاں ملتی ہیں۔ وہ خود اس زمانے میں اس کے لیئے کوشاں تھے۔ شام کو اپنے گھر لے گئے، بیوی سے ملایا اور کہا دیکھو دنیا میں ان جیسے مہاتما لوگ بھی موجود ہیں۔

لیکن میں اپنی کشتیاں جلا کر سوئے منزل رواں تھا۔

ساتواں باب

علی گڑھ (۲)

(۴۳ تا ۵۰ء)

ریڈیو کی ملازمت ترک کر کے سیدھا علی گڑھ پہنچا اور درِ پیرِ مغاں کو پھر کھٹکھٹایا۔ رشید صاحب کو میری اس ملازمت کو چھوڑنے پر سخت تعجب ہوا۔ کہنے لگے یہ آپ کو کیا سوجھی کہ اچھی بھلی سرکاری ملازمت یک لخت چھوڑ دی۔ یہاں علی گڑھ میں کیا رکھا ہے۔ ہو سکا تو بس یہی پچاس ساٹھ روپے کا ریسرچ کا وظیفہ۔ میں نے کہا رشید صاحب! بس اب تو یہی ٹھانی ہے۔ کہنے لگے اچھا تو آئیے یوں بھی زندگانی کر لیجئے۔ غالبؔ کا شعر مکمل ہونے کے بعد میں پھر علی گڑھ آن دھمکا۔ اس بار آفتاب ہاسٹل کے بجائے عثمانیہ میں داخلہ لیا تاکہ شعبۂ اردو اور لٹن لائبریری سے زیادہ قریب رہ سکوں۔ تحقیق کا عمومی میدان "اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا" رہا۔ سرور صاحب میرے کام کے نگراں مقرر ہوئے۔ لیکن چوں کہ خود ان کے مطالعہ کا میدان یہ نہیں رہا تھا، اس لیے کام کو سرانجام دینے کی تمام تر ذمہ داری خود میرے سر آن پڑی۔

اسی سال یہ خوش آیند بات ہوئی کہ نومبر ۱۹۴۳ء میں جونیر لیکچرر کے طور پر میری عارضی تقرری شعبۂ اردو میں ہو گئی اور ساتھ ہی رشید صاحب کی سفارش پر مجھے نو ساختہ "امین ہاسٹل" کا ریزیڈنٹ وارڈن بنا دیا گیا۔ اس طرح میری رہائش کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس ہاسٹل کو کلکتے کے ایک تاجر امین صاحب کے عطیے سے دورانِ جنگ

وار ٹیکنیشین ہاسٹل کے طور پر ڈاکٹر سر ضیاء الدین نے بہ عجلت تمام بنوایا تھا۔ اس وقت یہ یونیورسٹی کا سب سے گھٹیا ہاسٹل سمجھا جاتا تھا، جہاں کم مالی استطاعت رکھنے والے طلبا یا دیگر اقامت گاہوں کے "سزا یافتہ" رہتے تھے۔ اس کے دروازے کچّی شیشم کے تختوں سے بنائے گئے تھے جن میں سرکنڈوں کے بجائے لوہے کی موٹی موٹی کنڈیاں لگی ہوئی تھیں یہ دروازے کچّی لکڑی کے ہونے کی وجہ سے برسات کے موسم میں اکثر جلتے اس طرح کہ ان کی کنڈیاں لگانا دشوار ہو جاتا۔ ہر دوسرے تیسرے روز میرے پاس شکایت آتی کہ آج فلاں کمرے کا دروازہ 'اکڑ' گیا، فوری کمک کی ضرورت ہے! چوں کہ جنگ کا زمانہ تھا، اس لیے اشیائے خوردنی اور کپڑا تک راشن سے ملتا تھا۔ اوپر سے حکم تھا کہ طلبہ کو $\frac{2}{3}$ گیہوں میں $\frac{1}{3}$ جو کا آٹا ملا کر روٹی دی جائے۔ اہلِ مطبخ کے تصرّف سے دونوں کا تناسب بدل جاتا اور چپاتیاں کچّی اور کالی آتیں۔ طلبہ میں اس صورتِ حال پر بے چینی پیدا ہو گئی۔ جب معاملہ قابو سے باہر ہونے لگا تو میں نے اوپر اطلاع بھیجی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کے سکریٹری کا پیغام ملا کہ وائس چانسلر بہ نفسِ نفیس آئیں گے اور طلبہ سے خطاب کریں گے۔ سب لوگ ڈائننگ ہال میں جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔ دورانِ گفتگو وہ مجھے مسلسل وار ٹیکنیشین وارڈن کہتے رہے۔ طالب علم مسکرا رہے تھے اور میں انگشت بدنداں تھا۔ میری حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی جب انھوں نے طلبہ سے کہا کہ میں نے آپ لوگوں کو تو گیہوں کی روٹی دینے کا حکم دیا تھا، پھر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ طلبہ نے انھیں عقیدت اور مجھے غیض کی نظروں سے دیکھا۔ تالیاں بجیں اور میری نگاہیں جھک گئیں۔ خیر جیسے تیسے جلسہ ختم ہوا۔ میں وائس چانسلر صاحب کو ان کی موٹر تک چھوڑنے گیا۔ جب انھوں نے موٹر میں قدم رکھا تو میں نے ہمت کر کے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ نے لڑکوں سے جو گیہوں کی روٹی کا وعدہ کیا ہے تو پھر اس کا انتظام بھی کیجیے"۔ کہنے لگے "میں نے طلبہ ہی سے تو کہا ہے آپ سے تو کچھ نہیں کہا" آپ حالات کے پیشِ نظر جو کر رہے ہیں کیے جائیے"۔ واہ! واہ!! ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد زندہ باد۔ ع

مشکل کہیں جسے اُسے آساں بنا دیا

امین ہاسٹل کے دائیں بازو کے کونے والے تین کمروں میں اپنی 'بھڑ' جمائے

کے بعد مجھے اپنی ریسرچ کی جانب متوجہ ہونے کا موقع ملا۔ میرا ذاتی ملازم سبدا کوئلے کی انگیٹھی پر بہت اچھا کھانا پکا دیتا۔ رہائش اور خدمات کی دیگر تمام سہولتیں ہاسٹل کے وارڈن کی حیثیت سے حاصل تھیں۔ تکلیف تھی تو صرف بجلی کے نہ ہونے کی جس کا احساس گرمی کے موسم میں زیادہ شدید ہو جاتا۔ اس ہاسٹل میں دیگر اقامت گاہوں کی طرح اُلجھنیں بہت کم تھیں۔ چوں کہ پسماندہ قسم کے طلبہ سے سابقہ تھا وہ "وارڈن صاحب" کے سامنے آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسری قسم کے طلبہ وہ تھے جنھیں ہاسٹلوں سے کسی نہ کسی جرم کی پاداش میں 'لازمی منتقلی' کے ذریعہ یہاں بھیجا گیا تھا۔ ان میں 'کالے پانی' کے قیدیوں کی طرح سنجیدگی اور قرار آجاتا تھا۔ خوب جانتے تھے کہ یہاں کے بعد کہیں اور جانے کا ٹھکانا نہیں۔ البتہ ایک واقعہ میں کبھی نہیں بھول سکتا جو پروفیسر شبیر احمد خاں (سابق صدر شعبۂ معاشیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس وقت وہ بی۔ اے۔ کے طالب علم تھے۔ ایک روز برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک گول مٹول قسم کے طالب علم نے علی گڑھ کی روایت کے مطابق زور سے السّلام علیکم کہہ کر میرے ہاتھ میں پرووسٹ کے دفتر سے نکلا ہوا حکم نامہ لاکر دیا۔ معلوم ہوا کہ موصوف کو ماریسن کورٹ سے اپنے روم فیلو سے مارپیٹ کرنے کی پاداش میں امین ہوسٹل کو دربدر کیا گیا ہے۔ میں نے پرچہ پڑھا اور زہر خند کے ساتھ کہا "شبیر خاں صاحب! اگر آپ سے یہاں بھی اس قسم کی حرکت سرزد ہوئی تو پھر کہاں جایئے گا۔" کہنے لگے "وارڈن صاحب! میں یقین دلاتا ہوں اب اس قسم کی حرکت پھر کبھی نہیں کروں گا، وہ تو غصّے میں کر بیٹھا تھا۔" میں نے انھیں ایک شاہ جہاں پور کے عجیب الطرفین پٹھان (شبیر خاں دیسی پٹھان تھے) کے ساتھ رکھ دیا۔ کچھ دن تو اچھے گذرے۔ اس کے بعد خبر ملی کہ یہاں بھی ان کا اپنے ہم کمرہ کے ساتھ اختلافِ رائے ہو گیا۔ بلائے گئے۔ ان کے لبوں پر شکایت تھی لیکن شرمندہ تھے۔ دراصل شبیر خاں صاحب فرسٹ کلاس طالب علم تھے، مودّب بھی۔ لیکن مغلوب الغضب تھے۔ اس لیے غصّے میں بھوت بن جاتے۔ میرے سامنے پھر قول و قرار ہوا۔ اس کے بعد وہ ڈیڑھ دو سال امین ہاسٹل میں رہے لیکن مجھے کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔

یہ دور میری شدید ذہنی کاوش کا زمانہ تھا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے۔ میں نے اپنی

ریسرچ کے لیے "اردو زبان کی ابتدا اور ارتقاء" کا موضوع منتخب کیا تھا۔ میرے سامنے سُنیتی کمار چیٹرجی کی "بنگالی زبان کی ابتدا اور ارتقا" پروفیسر ژول بلاک کی "مراٹھی زبان" بابو رام سکسینہ کی "اودھی کی ابتدا اور ارتقاء" اور دھریندر ورما کی "ہندی بھاشا کا اُدگم اور وکاس" جیسے کئی نمونے موجود تھے۔ ایک طرح سے میرا میدان تاریخی لسانیات کا تھا۔ توضیحی لسانیات کا ہندوستان میں چلن بہت بعد کو ۱۹۵۵ء کے قریب ہوا ہے۔ یہاں میری ہندی دانی اور سنسکرت کی "شُدبُد" کام آئی۔ گریرسن کی لنگوئسٹک سروے آف انڈیا مُسلسل زیرِ مطالعہ رہتی۔ اردو کے سلسلے میں مجھے سب سے زیادہ مخالفین کی یہ بات کھلتی تھی کہ وہ اُسے بدیسی زبان سمجھتے تھے۔ جس زمانے میں اس کی ابتدا اور ارتقاء پر تحقیق کر رہا تھا یعنی سنہ ۴۳، ۴۴ء میں، اس وقت مسلم لیگ کی تحریک شباب پر تھی۔ اور اسی کے ساتھ مسلمانوں اور اردو سے نفرت بھی۔ ایسے میں مَیں نے اُردو کی جڑوں کو دُور ہند آریائی میں مضبوط کیا۔ مسلمانوں کے داخلۂ دہلی سے قبل اس کی تاریخ کے سلسلے میں اس تمام مواد کو سمیٹا جو ہندی اور اس کا مشترک تھا۔ اس طرح اس کی جڑیں ویدک زمانے تک چلی گئیں۔ یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دوسری ہند آریائی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ہے اس لیے کہ اس نے اپنا سروکار صرف "پراکرت" سے رکھا ہے اور اسی نسبت سے سنسکرت سے اجتناب کیا ہے جس کی اہمیت ۱۷۷۶ء میں ولیم جونز کی دریافت کے بعد تاریخی لسانی حلقوں میں بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ میری تحقیقی تصنیف "مقدّمۂ تاریخ زبانِ اردو" کی پہلی اشاعتوں میں اس پہلو پر اس قدر زور دیا ہے کہ خود زبانِ اردو کے ارتقاء کے لیے بہت کم صفحات دیئے جا سکے۔ اس کا ازالہ میں نے ۱۹۸۷ء کے ایڈیشن میں کیا ہے جس میں ہند آریائی کا حصّہ کم کر کے اردو کی تاریخ کے حصّے میں معتد بہ اضافہ کیا گیا ہے۔

میں دو برس تک اپنے مقالے کے سلسلے میں غلطاں و پیچاں اور سرگرداں رہا۔ تو دی کوزہ و کوزہ گر۔ دن رات پڑھتا تھا، ضرورت سے زیادہ نوٹس لے لیتا تھا۔ نہ ریسرچ کے طریقۂ کار سے واقف تھا اور نہ مقالہ نویسی کے آداب سے۔ ان باتوں کی اس زمانے میں السنہ کے شعبوں میں کوئی تربیت نہیں دی جاتی تھی۔ میرے نگراں، آل احمد سرور صاحب، جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں اس میدان کے واقف کار نہیں تھے۔ البتہ انھوں نے یہ میری مدد ضرور کی کہ

جب جامعہ یونیورسٹی اور ناگری پرچارنی سبھا کے دفاتر سے استفادہ کرنے کے لیے میں نے بنارس کا سفر کیا تو انھوں نے اپنے خسر صاحب کو تعارفی خط لکھ دیا۔ وہ اس زمانے میں وہاں سٹی مجسٹریٹ تھے انھوں نے مجھے بڑی محبت کے ساتھ اپنے یہاں قیام کی دعوت دی اور مذکورہ بالا دونوں اداروں تک پہنچنے میں میری مدد کی۔

شب و روز کی محنت سے میں نے دو سال کی مدتِ مقررہ میں اپنا مقالہ تیار کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے ۱۹۴۵ء میں داخل کر دیا۔ اسی سال مجھے ڈگری بھی مل گئی۔ یہ مسلم یونیورسٹی کے ریکارڈ پر ہے کہ آج تک کسی طالب علم نے اس قدر مختصر مدت میں اپنے پی ایچ ڈی کے کام سے فراغت حاصل نہیں کی ہے۔ میرے مقالے کے ممتحن سید سلیمان ندوی صاحب اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور تھے۔ دونوں نے مقالے پر اس قدر اچھی رپورٹیں دیں کہ مسلم یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل نے مبارک باد کا ایک خصوصی ریزولیوشن پاس کیا۔ یہ شرف بھی غالباً میرے سوا آج تک کسی اور کو حاصل نہیں ہوا ہے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس 'کارے کردم' کے بعد بھی 'شادم' نہیں تھا۔ میری بے اطمینانی کی وجہ اس میں اردو کے ارتقاء کے سلسلے میں ناواجب اختصار تھا۔ ہر نئے ایڈیشن کے وقت میں اس کمی کو پورا کرنے کا ارادہ کرتا تھا اور اس کے بعد رہ جاتا تھا۔ یہ توفیق جا کر مجھے ۱۹۸۷ء میں ۴۰ سال کے بعد ہوئی۔ اس قدر طویل وقفہ ایک طرح سے اس کے لیے اچھا ہی رہا۔ اس لیے کہ اپنے حیدرآباد کے دورانِ قیام (۶۲ تا ۶۸ء) مجھے دکنی اردو کے ذخائر کو بالاستیعاب دیکھنے کا موقع ملا اور قدیم اردو کی وسعت اور عہد بعہد ارتقا کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ مجھے علمی شہرت زیادہ تر اسی تصنیف سے ملی ہے۔ یہ اب برصغیر ہند و پاکستان میں ایم اے کے نصاب اور حوالے کی ایک مستند کتاب بن چکی ہے۔ حال میں ایک کم سواد نے اس کی تنقیص کو اپنی شہرت کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی ہے لہٰذا:

آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہلِ مرکب ابدالدّھر بماند

آپ سوچتے ہوں گے کہ اس علمی ریاضت کی شدت اور رفتار کو قابو میں رکھنے کے لیے میں نے کیا ذرائع اختیار کیے ہوں گے۔ لیجیے سنیے۔ میز پر کام کرنے کی کسل مندی

کو میں شام کی طویل ٹہل سے دور کیا کرتا تھا اور ذہنی تھکن کو شعر و شاعری کے مشغلے سے۔ میری شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز اسی زمانے میں ہوا اور چوں کہ ہندی میں کتب بینی کافی کرنی پڑتی تھی، اس لیے ہلکے پھلکے مطالعے کیلئے میں نے ٹیگور کی گیتا جلی کا پہلے ترجمے اور بعد کو اصل بنگالی میں مطالعہ کیا۔ ہندی کی چھایاوادی کویوں جے شنکر پرشاد، سُمترانندن پنت، نرالا، مہادیوی ورما کے انتخابات بھی پیشِ نظر رہتے۔ اچانک ایک دن مجھے احساس ہوا کہ میں شاعر بن گیا ہوں۔ شعر پہلے پہل گیت بن کر پھوٹے۔ شعر کے لیے جذباتی سوتے میرے یہاں پہلے سے موجود تھے، یعنی ۲۵، ۲۶ برس کی عُمر اور تنہائی۔ علی گڑھ کی بہتر فضا میں نہ تسکین کا سامان اور نہ ذوقِ نظر کا۔ عصمت چغتائی نے اِس مجبوری کو اپنی ناول 'ٹیڑھی لکیر' میں علی گڑھ کے طالب علموں کو یونیفارم — سیاہ شیروانی اور سفید پاجامہ — کے حوالے سے 'کوڑیالا' کہا ہے۔ یہاں کے طالب علموں کا لحاظ رکھیے کہ انھوں نے سیاہ برقعوں میں ملبوس طالبات کو کبھی بھی 'کالی ناگن' نہ سمجھا، نہ نام دیا بلکہ اسے اپنے رومان کے لئے ہمیشہ 'ایک حجاب اکبر' کہا۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ اسی زمانے میں میں نے ایک سیاہ برقعہ والی کی پرچھائیں بن کر اس کا فاصلے سے کئی برس تعاقب کیا ہے۔ مجھے اس کی شکل کی رتی تک نہیں دکھائی، ایک متشرّع خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بشتر ہاتھ بھی زیرِ نقاب رہتے، اور مورنی کے حسن کا اندازہ اس کے پاؤں سے کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

وہ فلسفے کی طالب علم تھی، جس کی چوٹی پر چڑھنے میں ناکام رہا تھا۔ اس لیئے اور پُراسرار معلوم ہوتی تھی۔ اس کی ذہانت اور فلسفہ دانی کا شعبۂ فلسفہ میں شہرہ تھا جو اس زمانہ میں شعبۂ اردو سے ملحق تھا۔ تابِ گویائی نہ پا کر میں نے نہایت 'باادب ہوشیار' قسم کے اسے چند رقعے لکھے۔ اس نے وہ پرنسپل ویمنس کالج کو بڑھا دیئے وہاں سے پراکٹوریل ڈپارٹمنٹ بھیج دیئے گئے۔ وہ تو خدا بھلا کرے میرے ریزیڈنٹ وارڈن مرحوم مختار صاحب کا، جو اسسٹنٹ پراکٹر بھی تھے۔ انھوں نے نہایت نیک نیتی سے یہ دعویٰ کر کے رقعے مسعودؔ جیسا شریف لڑکا لکھ ہی نہیں سکتا، کاش انھیں محبت میں شرافت کی مجبوریوں کا علم ہوتا، تحقیق کی غرض سے اپنی تحویل میں لے لیئے اور چوں کہ میرے ہی کمرے کے پاس میرے ہمراز آغا افتخار حسین کا کمرہ تھا جو فلسفے کے طالب علم تھے اور 'اس برقع پوش' کے کلاس فیلو، سمجھے ہو نہ ہو یہ آغا کی شرارت ہے۔ آغا کو

طلب کیا گیا، مختار مرحوم اپنے ڈیل ڈول سے تھانے دار معلوم ہوتے تھے۔ ایک ڈپٹ جو انھوں نے لگائی آغا اقبالی مجرم بن گئے۔ ان کو تنبیہ کر دی گئی۔ مجھے ہمیشہ تعجب رہا کہ آغا نے میری تحریر کو اپنی تحریر کیوں کر مان لیا! مختار مرحوم ریٹائرڈ ہونے کے بعد جب بھی ملتے آغا کا ذکر کر کے انھیں برا بھلا کہتے اس طرح میری شرافت کا بھرم ان کے مرتے وقت تک قائم رہا۔ کاش آج وہ زندہ ہوتے اور میرا اقبالِ جرم کی یہ تحریر پڑھ سکتے۔

جب دال نہ گلی تو میں نے قدم روک لیے اور پھر گھر کے نہال کا خیال کرنے لگا۔ اور تحقیق کی رفتار تیز تر کر دی۔

دن مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے۔ فروری ۱۹۴۸ء میں میری شادی بنت عم، نجمہ سے ہو گئی۔ میں انجینئرنگ کالج کوارٹر نمبر ۴ میں مقیم تھا کہ ایک روز ایک صوفی صورت خرقہ پوش نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں باہر نکلا وانھوں نے اپنا نام بتایا۔ نام سے فوراً پہچان گیا کہ اسی برقعہ پوش کے والد بزرگوار ہیں۔ ان کی صوفیانہ طرز زندگی کے قصے سن چکا تھا۔ بہت شفقت سے ملے۔ اندر سے میرے بچّے کے رونے کی آواز آئی۔ کان کھڑے کیے اور پوچھا ماشاءاللہ آپ بال بچّوں والے ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں پچھلے سال میری شادی ہو گئی ہے۔ کہنے لگے میری لڑکی جو کرامت حسین گرلز کالج میں لیکچرر ہے اس کو آپ کے نام کی رٹ ہو گئی ہے۔ کچھ بیماری رہنے لگی ہے اور جب دورہ پڑتا ہے تو چیختی ہے مسعود! مسعود! میں جواب دیتا ہوں مردود! مردود! لیکن اب کوئی چارۂ کار نہیں۔ میں نے ان کا جملہ دہرایا "جی ہاں اب کوئی چارۂ کار نہیں"۔ اشارہ کیا کہ شرع میں ایک سے زائد جائز ہیں۔ میں نے مؤدبانہ کہا میری شرع میں نہیں۔ معاملہ یہیں پر ختم ہو گیا اس لیے کہ کچھ عرصے کے بعد پورا خاندان پاکستان ہجرت کر گیا۔

۱۹۷۷ء میں پاکستان سے اچانک ایک خط ملا۔ یہ برقعہ پوش کی چھوٹی بہن کا تھا جنھوں نے مجھ سے اپنے بھائی کا جامعہ بلیہ کے کیمپس میں جو مکان رہ گیا تھا اور جس پر اب اغیار کا قبضہ تھا، واگذاشت کرانے کے سلسلے میں مدد چاہی تھی۔ آخر میں لکھا تھا، والد کا انتقال ہو چکا ہے اور بڑی بہن کا بھی جو حیدرآباد میں لیکچرر کی حیثیت سے کام کر رہی تھیں میں کرسی پر

تھوڑی دیر کے لیے ساکت و صامت رہ گیا۔ خیال پنیتیس سال قبل کی علی گڑھ کی فضاؤں میں پرواز کرنے لگا۔ گھر لوٹا تو میں نے نجمہ کو سینے سے لگا لیا اور سارے راز سربستہ بتا دیئے ان کا مجھ پر اعتماد اور بڑھ گیا۔ شاید اسی لیے میں اپنی مرحوم خیالی محبت کو، کچھ عرصے بعد یہ خراجِ عقیدت پیش کر سکا۔

پرچھائیں کی موت

وہ پرچھائیں تھی
سیاہ برقع میں ملبوس ایک پرچھائیں
میرا روشن وجود جس کا برسوں تعاقب کرتا رہا
میری دزدیدہ نظریں جس کی سیہ نقاب سے
برسوں کشاکش میں مبتلا رہیں
— تاکہ اس کے رخِ روشن کو بے نقاب کر سکیں
— تاکہ اس کے خط و خال کو رنگوں کا غسل دے سکیں
لیکن سماج کو یہ منظور نہ تھا
میں جلتا رہا اور وہ کوئلہ بنتی رہی
اپنے انگاروں کو دباتی رہی
بغیر یہ خیال کیے کہ اس کی نزار ہڈیاں
ایک دن جل کر مشتِ خاک بن جائیں گی
وقت فاصلے میں تبدیل ہوتا گیا
بالآخر ایک دن وہ بھڑک اٹھی
اور اس کی زبان پر پہلی بار خدا کے بجائے میرا نام آ گیا!
مسعود — گونج آئی — مردود!!
وہ میری یادوں کے طاق کا گلدستہ بنتی گئی

لیکن میں اس کے روشن وجود میں سایہ بن کر داخل ہوتا گیا
دونوں بے خبر۔ لیکن دور ہو کر قریب
یکایک خبر کی بجلی ٹوٹی کہ چند سال پہلے وطن سے دور
وہ قبر کی تاریکیوں میں اتر گئی
"غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا"
میری زبان پر پہلی بار خدا کا نام آگیا! (۱۹۷۶)

بات کی رَو میں مَیں جس زمانے کا ذکر کر رہا تھا اس سے بہت آگے نکل گیا۔ ذکر تھا اس دور کی تحقیق اور تخلیق کا جن کی دوہری ڈگر پر ان دنوں رواں دواں تھا۔ تحقیق سے گریز تخلیق میں کرتا اور پھر اسی کی جانب لوٹتا میرے لیے یہ خیال، اور استدلال کے ہم دگر ہونے کا زمانہ تھا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ تحقیق و تخلیق ذہن کی متضاد صلاحیتوں کی پیداوار ہوتی ہیں۔ لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ ہر وہ شخص جو تعقّل کی سطح پر کام کرتا ہے کسی نہ کسی قسم کے تخلیقی کام سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی کبھی اس عمل میں شرکت بھی کرتا ہے۔ میں دن میں اردو کی داستان لکھتا اور شام کے سایوں یا رات کی تاریکی میں گیت یا غزل کے ستارے تراشتا۔ چوں کہ میری شاعری اور میری زندگی میں گہرا ربط رہا ہے۔ اسی لیے اپنے مجموعۂ کلام کے پیش لفظ کا آغاز ان جملوں سے کیا۔

"شعر میرے لیے ذریعۂ نجات رہا ہے۔ اس نے کبھی بھی مشغلے یا مشق کی صورت اختیار نہیں کی۔ یہ ہمارا فن بھی نہیں ٹھہرا!"

اس قدر ضرور ہے لسانیات میں میری تربیت ہی سبب ہے کہ شعر میرے لیے ہمہ وقت کا مشغلہ نہ بن سکا۔ شاعری کی دیوی کا چلایا مشہور ہے۔ اس کا ہو کر آدمی پھر کسی کام کا نہیں رہتا۔ اور میں یہ قیمت دینے کو تیار نہیں تھا۔

یہ زمانہ میرے لیے تحقیق کے ساتھ آمد آمد شعر کا دور بھی تھا۔ میں عام طور پر حرکت

یا گنگناہٹ کے سہارے شعر کہتا تھا۔ کبھی کبھی بستر پہ لیٹے ہوئے خاموشی میں بھی شعر ہو جاتے۔ بعض گیت اور غزلیں ایک دار میں ہو گئی ہیں۔ بعض تخلیقی نقش، نا تمام رہ گئے ہیں جن کی جانب بار بار مراجعت کرنا پڑی ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ آمد اور آورد میں خطِ فاصل کھینچنا دشوار ہے۔ شعر کا محرک کوئی جذبہ اور خیال بھی ہو سکتا ہے جو عرصے سے ذہن میں بالیدہ ہو رہا ہو۔ کبھی کبھی ایک مصرع یا ترکیب ذہن میں آتے ہی تخلیق کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ نرا آورد کا شعر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہنے والا جذبہ کی آنچ سے خالی ہو۔ اگر محسوسات کا دباؤ اپنی پوری شدّت کے ساتھ موجود ہے تو زبان کا سانچہ اور ہیولا خود بخود تیار ہونے لگتا ہے۔ نئی رک میں روح کا بے تابانہ رقص تیز رفتاری اور شدت کے ساتھ عمل پیرا ہوتا ہے اسی لیے اس کو دیر تک انگیز کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ طویل نظمو‘ جسے ایڈگر ایلن پو نے "چند اچھی چھوٹی اور چند کمزور بڑی نظموں کا مجموعہ کہا ہے" اگر مناسب حصص یا ڈرامائی کرداروں میں تقسیم نہ ہوں تو سپاٹ ہو جاتی ہیں۔ میں نے ’خوابِ سنگ‘ یا ’روپ بنگال‘ کے علاوہ کوئی طویل نظم نہیں کہی۔ ایک کو ہیئت اور دوسری کو ڈرامائی تاثر نے سنبھال لیا ہے۔ میں نے اپنے شعری تجربے کو ایک جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"شعر کیسے بنایا اُترتا ہے؛ خارجی احول اس وقت پیشِ نظر نہیں، اُس کے اثرات مُسلّم، لیکن تخلیقی عمل کے اسرے کو وہاں سے لینا ہوگا جہاں سے شاعر ذہنی تیاری میں مبتلا نظر آتا ہے۔ کوئی ایک خیال، ذرا سی واردات، کوئی ایک لفظ یا مصرع اور ذہنی تیاری کا عمل شروع ہو گیا۔ نفسیاتی اصطلاح میں یہ سمجھئے کہ روح میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ آئی۔ اے۔ رچرڈز کے الفاظ مستعار لیجئے تو یہ کہ نازک ترین دماغی اعصاب میں اہتزاز پیدا ہو گیا۔ جب یہ جاگ، یہ ارتعاش، یہ اہتزاز کسی لفظ کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے تو تنقیدی تجزیہ کافی دور تک دستگیری کرتا ہے لیکن جب یہ کیفیت جامۂ حرف میں نہیں بلکہ مجرد تصوّرات میں جذبات زدہ تخیل سے زینہ بہ زینہ قدم نیچے اتارتی ہے تو تشبیہات و استعارات کی ایک مبہم سی کائنات پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے، جسے الفاظ کی چہار دیواری رفتہ رفتہ سمیٹتی چلی جاتی ہے۔ یہ چہار دیواری بار بار بنتی اور بگڑتی ہے۔ خیال اس طرح پھوٹتا ہے جیسے شگوفے سے شگوفہ تیز سے تیز ادراک

بھی ان لمحات کا تجزیہ کرنے سے معذور ہے۔ ایک گوئٹے کو معلوم ہوتا ہے کہ جام انسانی میں شرابِ روحانی ازلی جاری ہے۔ ایک نیشے کو ہم کسی آسمانی طاقت کا آلۂ کار نظر آتے ہیں۔ میر کو "وہ" اور غالب کو "ایک شخص" پس پردہ نظر آتا ہے۔ غرض کہ شعور اور لاشعور کا کوئی امتیاز اس وقت ممکن نہیں۔ فنکارانہ عمل جذبہ و تخیل کی غیر معینہ کیفیات سے شروع ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ مبہم واضح ہوتا ہے اور بے نام نام پاتا ہے۔ مختصر یہ کہ زبان اور ہیئت کے سانچے ابھرنے لگتے ہیں۔"

میرے سلسلے میں دقت یہ تھی کہ میرا ذہن بہ یک وقت شعر کی گرمی اور لسانیات کی سردی کو محسوس کرتا تھا۔ اگر چند گھنٹے میں زبان کے تجزیے پر صرف کرتا تو چند لمحے شعر کے بے تابانہ رقص کے ساتھ بسر کرتا تھا۔ ذہن کے دونوں رویوں میں تصادم اس وجہ سے نہیں ہوتا تھا کہ تخلیقی عمل کے وقت تنقیدی شعور تہ نشین ہو جاتا تھا۔ میں اکثر غلط الفاظ اور غلط محاورات باندھ جاتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اس وقت تک میرا کلاسیکی شاعری کا مطالعہ محدود تھا لہٰذا میں زبان کی نوک پلک سے کما حقہٗ واقف نہیں تھا۔ میں نے خاص طور پر لکھنوی شعرا کے مطالعے کی جانب سے اغماز کیا تھا، حالاں کہ زبانِ شعر کی منجائی جس طرح انھوں نے کی ہے اس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔

اس زمانے میں آمدِ شعر خوب تھی۔ 'وہ بات' (۴۲ء) میں لکھا، 'بچھوڑے'، 'میں کیسے آنکھ اٹھاؤں'، 'موج کا گیت'، 'آج تو شاید وہ آجائے'، 'آج بھی انکار'، یہ سب گیت ۴۳ء کے دوران لکھے۔ باقی گیت زیادہ تر ۴۴ء اور ۴۵ء کی یادگار ہیں۔ غزلوں کا دور ۴۵ء سے شروع ہو جاتا ہے اور نظموں کا ۴۶ء سے (تفصیل کے لیے دیکھیے 'دو نیم'، دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۶ء، علی گڑھ)۔ اس شعری تجربے کے وقت میری عمر ۲۵، ۲۶ سال کی تھی۔ میں عمر کے خالص رومانی دور سے نکل کر مردانہ بلوغت کے دور میں قدم رکھ چکا تھا۔ جنس کا دریائے بے تابی جسم میں زوروں سے موج زن تھا۔ علی گڑھ کے برقعہ پوش ماحول میں ہر برقع نشین معشوق نظر آتا تھا۔ (ایک خیالی معشوق کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں)۔ چوں کہ میں نظرباز نہیں تھا اس لیے 'دید' کے مواقع صرف کلاس روم یا شعبے کے آس پاس سے آگے نہیں بڑھتے، لیکن بہر حال دل

کسی چیز کا متلاشی ضرور تھا۔ بے نام کی جستجو رہی۔ جب اظہار کا حسی موقع نہیں ملتا تو پرواز تخیل کے ذریعے شعر کی دنیا میں غرق ہو جاتا۔

۱۹۴۴ء میں میری باقاعدہ نسبت نجمہ کے ساتھ ہو گئی۔ کہہ چکا ہوں کہ بھابی جان (منجھلی ممانی) نے نجمہ کے لیے میرا انتخاب تو بہت پہلے کر لیا تھا لیکن اب دق کے موذی مرض میں گرفتار ہونے کے بعد ان کی خواہش اصرار میں تبدیل ہو گئی کہ جلد نسبت ہو جائے۔ میرے بڑے بھائی بہن دونوں حیدر آباد میں تھے۔ خط لکھے گئے اور پھر دونوں کی تحریک پر ۱۹۴۴ء میں میری نسبت باقاعدہ طور پر کر دی گئی۔ میری نسبت اور بعد کو شادی دونوں میں گڈے گڑیا کے بیاہ کا انداز رہا۔ بھائی اور بہن دونوں حیدر آباد میں تھے۔ تحریک وہی کر سکتے تھے۔ لیکن انھیں کون لکھے۔ ننھیال کا پورا خاندان لڑکی کا طرف دار تھا۔ جب بھابی جان (منجھلی ممانی صاحبہ) نے یہ صورت دیکھی تو گھر کے سب سے معتبر ملازم اچّو (آرزو حسن) کی خدمات حاصل کی گئیں۔

ایک دن، حسب معمول میں کوٹھی (پرانا مردانہ مکان) میں لیٹا ہوا تھا کہ اچّو آیا اور مجھ سے کہنے لگا، "میاں آپ اپنے بھائی بہن کو خط کیوں نہیں لکھتے تاکہ نسبت پکّی ہو جائے"۔ میں ذہنی طور پر تو اس کے لیے تیار تھا لیکن قدیم خاندان کے لڑکوں میں شرم و لحاظ کا مادّہ ہوتا ہے، وہ ہمیشہ مانع رہا۔ سوچتا رہا کہ کیسے لکھوں اور پھر کس کو لکھوں، بڑے بھائی یا بڑی بہن کو۔ بالآخر۔ بہن کے نام قرعۂ فال نکلا۔ میں نے لفافہ منگوایا اور دو سطروں میں اُن سے خواہش کی کہ وہ نانا جان کو (وہ وہی خاندان کے بزرگ تھے) اس نسبت کے بارے میں لکھیں۔ خط ملا تو انھوں نے بڑے بھائی امتیاز حسین خاں سے مشورہ کیا اور پھر ننّے میاں کو نسبت کے لیے خط لکھا۔ ادھر میں حیدر آباد کے خط کا روزانہ انتظار کرتا۔ بالآخر ایک سہ پہر کو نانا جان اپنے ہاتھ میں کھلا خط لیے زنانے گھر میں آئے اور بی، (نانی صاحبہ) سے بولے لو نجمہ کی نسبت کا یہ خط آ گیا ہے۔ پھر کہا بھئی لڑکی کے ماں باپ کی مرضی بھی پوچھ لو۔ انھوں نے کہا بس طے ہے ان کی مرضی کیا پوچھنا۔ لیجیے، قائم گنج کی زبان میں "لڑکی دِل گئی" گڈے گڑیا کی نسبت کا یہ سارا تماشا میرے سامنے ہوا۔ اب جو تعطیلات میں قائم گنج جاتا تو اجنبی احساس کے ساتھ جاتا۔ ہر ایک کی نظر میرے زنانے میں آمد و رفت پر رہتی۔ نجمہ میں بھی ایک قسم کی جھجک سی پیدا ہو گئی تھی۔ میرا

سب سے بڑا زیاں دودھ ملائی کا تھا جس کے لیے مجھے کسی دوسری بنتِ عم کا سہارا لینا پڑتا۔ مگر وہ بات کہاں۔۔۔۔

اسی زمانے میں مَیں نے علی گڑھ کے صحرا میں بیٹھ کر بجمہ کی یاد کے دیئے روشن کیے اور 'جمال' کے عنوان سے اسے یہ خراجِ محبت پیش کیا:

جمال

کہاں سے آ گئیں رنگینیاں تمنّا میں
کہ پھر خیال نے لالے کھلائے صحرا میں

تری نگاہ سے مری نظر میں مستی ہے
ترے جمال سے موجیں ہیں دل کے دریا میں

یہ ہو رہا ہے گماں تیرے جسمِ خوبی پر
بھٹک کے حور چلی آئی ہو نہ دنیا میں

نظر میں کھلے ہوئے موتیوں کی جھکاریں
لبوں پہ رنگ جو ملتا ہے جام و مینا میں

وہ مسکرانے سے آنکھوں میں بے شمار کنول
وہ کسمساتی ادائیں تمام اعضا میں

نپا تُلا سا تبسّم، بچی ہوئی سی نظر
ستی ستی سی وہ پلکیں غبارِ سُرما میں

وہ نرم نیمے سے کُندن بدن کی رنگ ترنگ
بنی ہوئی سی وہ کرنیں لباسِ زیبا میں

جو گوشے گوشے میں پنہاں ہے اس کے راہ گزر
خیال گم ہوا جاتا ہے قدِ رعنا میں

قدم قدم پہ وہی تمکنت کا ایک سوال

ہے کوئی دوسرا ہم سا سوادِ گنگا میں؟

بتاؤں تجھ سے کہوں کیا بجز وہ شوق کی بات

کہ ڈال رکھا ہے جس کو جوازِ معنیٰ میں

جمالِ یار لطیف، آرزو ہے اُس سے لطیف

یہ آئی ہے، نہ وہ آئے گا، حرفِ سادہ میں (۱۹۴۶)

اس نسبت کے بعد ایسا لگا کہ ع عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا۔ زندگی میں ایک معنویت اور مرکزیت آگئی اور شاعری میں وسعت، یعنی اب موضوعاتِ سخن 'ذات' کے علاوہ 'کائنات' سے متعلق بھی ہونے لگے۔

۱۹۴۵ء کے ستمبر میں، ٹھیک دو سال کے بعد میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے اپنا مقالہ داخل کر دیا۔ اِدھر یونیورسٹی کی ملازمت میں بھی میرے قدم جم گئے تھے۔

۱۹۴۵ء میں سرور صاحب کے رضا انٹر کالج کی پرنسپل شپ پر چلے جانے کے بعد میرا تقرر بحیثیت لکچرر مستقل طور پر شعبۂ اردو میں ہو گیا۔ چند مہینے میں میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری سے سرفراز کر دیا گیا۔ زبانی امتحان لینے کے لیے سید سلیمان ندوی کو بلایا گیا جو میرے مقالے کے دو ممتحنوں میں سے ایک تھے۔ سید صاحب ان دنوں دوسرے عالم میں تھے، یعنی تصوف کا غلبہ تھا۔ حسبِ معمول رشید صاحب کے یہاں ان کا قیام تھا۔ زبانی امتحان سے فارغ ہونے کے بعد تعظیماً ان سے ملاقات کرنے گیا۔ مجھے تعجب ہوا جب انھوں نے مجھ سے بلاواسطہ سوال کیا کہ میں تحقیقی کام کے لیے یہ سب تگ و دو کیوں کر رہا ہوں۔ میں نے مختصر الفاظ میں جواب دیا۔ "نشاطِ کار کے لیے"۔ بولے "ہوس ہے!"

اب ہم ۱۹۴۷ء کے قریب آتے جا رہے ہیں۔ ملک کی فضا پر 'وصل، نہیں 'فصل' کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ میں اکثر غالب کے اس شعر میں پناہ لیتا تھا ؎

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال

کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو

علی گڑھ مسلم لیگ کا گڑھ بن چکا تھا۔ قائدِ اعظم جناح اِس دانش کدے میں بار بار آتے اور اسے اپنے 'اسلحہ خانے' سے تعبیر کرتے۔ میرا قوم پرستی کا ذہن جامعہ ملیہ کے ماحول میں بن چکا تھا۔ ذاتی طور پر میں ہندی اور ہندؤوں کے بہت قریب رہ چکا تھا۔ ڈھاکہ کے چار سالہ قیام میں مجھے ہندو کلچر کے سب سے تربیت یافتہ نمونوں کو بنگالی زندگی میں دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ہندی زبان اور شاعری کے مطالعے نے ہندو ثقافت سے وہ اجنبیت بھی دور کر دی تھی جو علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہن میں بالعموم ہوتی تھی۔ میں عملی سیاست سے بہت دور رہتا لیکن بہر حال سیاسی حالات کا میری فکر و تصورات پر اثر انداز ہونا لازمی تھا۔ ہندو کلچر، تاریخ اور ادبیات کے بہت قریب رہنے کے باوجود میں ان کی معاشرتی زندگی اور دیو مالائی تصورات کا ہمیشہ نقّاد رہا ہوں۔ میں اس ثقافت میں بہت سی ڈھائی ہزار سال پہلے کی خرافات دیکھتا ہوں۔ یہ نہیں کہ اسلامی تہذیب خرافات سے یکسر عاری ہے۔ لیکن چوں کہ اسلام نسبتاً جدید زمانے کی پیداوار ہے اِس لیے دیو مالائی جہلات سے خالی ضرور ہے۔ یوں میں عملی مسلمان کبھی نہیں رہا، سوائے جامعہ ملیہ کے اسکول کے زمانے کے، لیکن اسلام اور اسلامی اقدار کو عزیز رکھتا ہوں۔ اس پس منظر کی وجہ سے اس زمانے میں مسلم لیگ کی سیاست سے متاثر ہو گیا۔ میرا ارد گرد بھی ماحول تھا۔ علی گڑھ ہو کہ قائم گنج۔ لیکن میرے خواب و خیال میں بھی یہ نہیں آیا تھا کہ ملک 'دو نیم' ہو سکتا ہے۔ مجھے اکثر یوپی کے مسلمانوں کی لیگ پرستی پر ہنسی آتی تھی جس کے لیے 'جائے رفتن' نہ ہو اسے تو 'جائے ماندن' کا بندوبست رکھنا ضروری ہے۔

لیکن جو ہونا تھا سو ہوا۔ میں نے ۱۹۴۷ء کا پورا منظر اپنے ہاسٹل سے دیکھا۔ روز افواہیں گرم ہوتیں کہ مسلم یونیورسٹی پر چڑھائی ہونے والی ہے۔ چوں کہ یہ ہاسٹل اس وقت یونیورسٹی کیمپس کے بالکل کنارے پر تھا، اس لیے ہمارے لیے شب و روز خطرہ رہتا۔ دن سو کر اور راتیں جاگ کر گزرتی تھیں۔ آزادی آئی مگر خون میں نہائی ہوئی۔

کوئی بھی رونقِ محفل کو دیکھ سکتا ہے
تمہیں بتاؤ جب آنکھوں میں اس قدر نم ہو

دیارِ ہند سے جاتے ہوئے بتانِ فرنگ
وہ داغ دیئے گئے جس کا نہ کوئی مرہم ہو
کنارِ گنگ و جمن آپ چھوڑ کر مسعوؔد
کہیں نہ جائیں نظر اُن کی لاکھ برہم ہو

عملی سیاست سے دُور ایک حسّاس دل انسان اپنے طور پر کوائفِ وطن کو اس طرح محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اس قسم کے جذبات سے مملو شاعری کی داد دینے والے بہت کم رہ گئے تھے۔ مجھے ۱۹۴۷ء کے آس پاس کی ایک صحبت یاد رہ گئی ہے۔ عبدالمجید خواجہ صاحب نے اپنے یہاں کچھ حضرات کو کھانے پر مدعو کیا تھا جس میں علی گڑھ کے ضلع مجسٹریٹ بھی تھے۔ کھانے کے بعد حسبِ روایت، سخنوروں سے کلام سُنانے کی فرمائش کی گئی۔ جب میں نے اپنی غزل کے مذکورہ بالا اشعار ترنّم کے ساتھ پڑھے تو عبدالمجید خواجہ صاحب کے سینے کا قوم پرست بلبلا اٹھا۔ وہ بار بار ضلع مجسٹریٹ کو مخاطب کر کے ان اشعار کو اٹھاتے تھے اس طرح کہ وہ بے چارا خود کو مدعا علیہ کے کٹہرے میں کھڑا محسوس کرنے لگا۔

جب ۱۹۴۷ء کی موجِ خوں سر سے گذر چکی اور منجھلی ممانی صاحبہ کی صحت روز بروز گرنے لگی تو اصرار ہوا کہ اب میری شادی ہو جانی چاہیے۔ لیکن کون کرے۔ میرے بڑے بھائی بہن تو حیدرآباد میں تھے، جہاں کے سیاسی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے، اور چاروں جانب سے خاموشی تھی۔ تمام عزیزوں کا یکجا ہونا مشکل ہوتا تھا۔ اس لیئے طے پایا کہ رسم نہایت سادگی سے ادا کر دی جائے۔ دولھا بھی اس وقت ننہال کا تھا اور دلہن بھی ننہال کی۔ جیسے ایک۔ گھروندے میں گڈے گڑیا کا بیاہ ہو رہا ہو۔ چنانچہ میں مُمانی صاحبہ کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے علی گڑھ سے ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو قائم گنج کے لیۓ روانہ ہو گیا۔ وہاں گاڑی ساڑھے چار بجے کے قریب پہنچی تھی۔ تقریباً چھ گھنٹے کا سفر تصوّرات کے عالم میں گزرا۔ قائم گنج جب پہنچا تو اسٹیشن پر اڑتی ہوئی خبر سُنی کہ گاندھی جی کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ گھر پہنچا تو ایک سراسیمگی کا عالم پایا۔ سب کو یہ فکر تھی کہ کس نے قتل کیا ہے۔

اگر کسی مسلمان نے یہ حرکت کی ہے تو قیامت گزر جائے گی۔ لیکن تھوڑے ہی دیر میں ریڈیو نے قاتل کا نشان پتہ بتا دیا۔ شادی ۳۱ر جنوری کو مقرر تھی۔ لیکن گاندھی جی کے سوئم تک ملتوی کرنا پڑی۔

بچپن سے میری عادت رہی ہے کہ موت پر بھی میرے آنسو نہیں نکلتے۔ لیکن ۳۰ر جنوری کی رات کو میں دیر تک سسکیوں سے روتا رہا!

نکاح کی رسم اب ۳ر فروری کی سہ پہر کو مقرر ہوئی۔ نجمہ ۳۰ر جنوری سے پہلے مائیوں بٹھا دی گئی تھیں، ہاتھوں میں مہندی لگ چکی تھی۔ اُن کے ساتھ سلمیٰ بھی۔ بھابی جان کی خواہش کے مطابق طے پایا تھا کہ ان کے بیٹے بدر عالم خاں کی بھی شادی اسی روز ہو جائے۔ چنانچہ ۳ر فروری کی سہ پہر کو ملّا چھمّن نے (دلہن کے بارے میں مشہور تھا کہ شوق کرتے ہیں) ہم دونوں کا نکاح چند چھواروں پر مقامی عزیزوں کے سامنے مردانے مکان کے چبوترے پر پڑھا دیا۔ نہ سہرا تھا نہ دھوم دھام۔ میرے خیال میں اس قدر سادہ شادی اسلام کے ابتدائی عہد میں ہوئی ہو تو ہوئی ہو، اور کہیں دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی بس دو گڈوں اور دو گڑیوں کا بیاہ تھا جو کر دیا گیا۔ میرے بڑے بھائی کے خسر منظور عالم خاں نے شکایت کی کہ امتیاز تو کچھ اور ہی سوچ رہے تھے، یہاں کسی کو خبر کیے بغیر یہ سب کچھ کر دیا گیا۔ لیکن مرض الموت میں گرفتار ایک مریضہ کی خواہش کا احترام بھی ضروری تھا۔ میں بھی انتظار سے عاجز آ چکا تھا۔

شادی کے دو روز بعد میں علی گڑھ چلا آیا۔ یہاں میں نے پہلے سے یونیورسٹی کا ایک کوارٹر اپنے نام الاٹ کرا لیا تھا۔ چھ ہفتے بعد جا کر نجمہ کو بھی لے آیا۔ امین ہاسٹل کی سکونت ترک ہوئی اور انجینئرنگ کوارٹر نمبر ۴ میں متاہلانہ زندگی کی آسودگی کا آغاز ہوا۔

---

۴۸ تا ۶۲ء درمیان میں ۲½ سال کے وقفے کے علاوہ جب میں بغرض تعلیم یورپ گیا ہوا تھا، میری نشست و برخاست کا محور پروفیسر عمرالدین کی قیام گاہ تھی، جہاں مجھ جیسے چند اور صاحبان روز جمع ہو جاتے تھے۔ عمرالدین صاحب فلسفہ کے استاد تھے۔ جوانی میں انھوں نے امام غزالی کی فکر پہ کام کیا تھا۔ اس کے بعد وہ دمہ کے مریض ہو گئے جس نے ان کا ساتھ مرتے دم تک نہ چھوڑا

پہلی شادی پنجاب کے کسی قصبے میں کی تھی۔ مسلم یونیورسٹی میں برسرِ روزگار ہونے کے بعد انھوں نے دوسری شادی خلیل مراد صاحب کی صاحبزادی سے کی جو فزکس میں لکچرر تھے اور میرس روڈ پر خلیل منزل کے مالک۔ ان کی دوسری بیگم علی گڑھ کی تعلیم یافتہ تھیں۔ ان سے دو بچے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوئے، مگر دمہ کے عارضے کے بعد ان سے علیحدگی ہو گئی۔ وہ پہلے ایم۔ ایم ہاسٹل کے وارڈن کی حیثیت سے اور پھر یونیورسٹی کے مکان میں یکّا و تنہا رہتے تھے۔ انھیں دُسرائت کی ضرورت تھی اور محلّے کے نوجوان اساتذہ کو ایک بیٹھک کی۔ چنانچہ ان کا مکان ایک مستقل نشست گاہ بن گیا تھا۔ جہاں سہ پہر تا نصف شب لوگ آتے جاتے رہتے۔ اس نشست کے خاص رکن میرے علاوہ احسان رشید صاحب، ابرار مصطفےٰ صاحب، عمر علی صاحب، وحید قریشی اور ظفر احمد صدیقی صاحبان تھے۔ باقی موقتی تھے، یعنی آتے جاتے رہتے تھے۔ خاص نشست مغرب کے بعد شروع ہوتی۔ اس وقت دربارِ عام والے اٹھ جاتے یا اٹھا دیئے جاتے۔ عمرالدین صاحب کا معمول تھا کہ اگر کوئی شخص خانقاہ کے آداب سے ناواقفیت کی بنا پر اپنی نشست کو مغرب کے بعد طول دینا چاہتا تو اسے یاد دلا دیا جاتا کہ اُسے اور بھی بہت سے کام ہوں گے جنھیں جا کر کرے۔

یہ مجلس خالص غیر سیاسی تھی۔ موضوعات فلسفے سے لے کر واقعات یونیورسٹی پر مبنی مسلمانوں کے بارے میں تردادات سے ہوتی ہوئی وحید قریشی کی بذلہ سنجی پر ختم ہوتی۔ بیچ بیچ میں عمرالدین صاحب کھانسی کی شدّت کو ختم کرنے کے لیے بھپارے سے کر نسوار اور شربت نزلہ تک استعمال کرتے جاتے۔ گرم گرم چائے کا مسلسل دور چلتا رہتا۔ جوں جوں رات بھیگتی ان کے دمہ کی شکایت بڑھتی جاتی اور اسی نسبت سے ان کی یہ خواہش کہ حاضرین ان کا شب کی تنہائی میں ساتھ دیں۔

وہ صحیح معنوں میں مردِ قلندر تھے جو زہرِ ہلاہل کو کبھی کہنے نہ سکا قند پر عمل کرتے تھے۔ دل کے کھرے اور لہجے کے اکھڑ تھے۔ زبان ان کی لونڈی تھی جو فرماد یا وہی مستند ہو گیا۔ مثلاً کہتے تھے کہ "ہم نے علی گڑھ کے لیے بڑی بڑی 'سیکری فائی یاں' Sacrifices کر رکھی ہیں لیکن کوئی رِکگ نائی Recognize نہیں کرتا"۔ پلیزر Pleasure کو 'پلیبزر' اور میژر Measure کو میٹر کہتے اپنی جوانی اور استادوں کے قصے مزے لے لے کر سناتے۔ وہ فلسفے کے مشہور اُستاد ڈاکٹر ظفر الحسن کے

شاگرد تھے۔ ڈاکٹر ظفرالحسن اُستاد ہی نہیں طالب علموں کے لیئے پیر و مرشد بھی تھے۔ آخری عمر میں لہراتی داڑھی کے ساتھ چوغے میں ملبوس رہتے تھے۔ طالب علم ان کی علمیت سے مرعوب اور شخصیت سے خائف رہتے تھے۔ ادھیڑ عمر میں جب انھوں نے شادی کی تو اطباء نے حلوۂ مغز گنجشک (گوریا) تجویز کیا جس کی فراہمی کے لیئے عمرالدین صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔ چنانچہ وہ

بنا کر چڑی مار نے ایک جال
لیا جال کو اپنے کاندھے پہ ڈال

کی شکل میں صبح سے شام تک مارے مارے پھرتے اور کہیں سے درجن ڈیڑھ درجن گوریا پکڑ کر لاتے، جن کو ذبح کر کے ان کا مغز نکالا جاتا پھر دیگر مقوی اجزاء کے ساتھ اُن کا حلوہ اصلی گھی میں تیار کیا جاتا۔

ذاکر باغ میں رشید صاحب اور ان کا دروازہ آمنے سامنے تھا لیکن دونوں ایک دوسرے سے فاصلے پر رہتے تھے۔ دراصل دونوں دو مختلف کلچروں کے نمائندے تھے۔ یہ گنگا اور راوی کے پانی کا فرق تھا لیکن ۱۴ اگست ۶۲ء کو رشید صاحب نے عمرالدین صاحب کی وفات پر جو خط مجھے حیدرآباد لکھا تھا، اس سے اُن کی قربت کا علم ہوتا ہے۔

"عمرالدین صاحب کی وفات کچھ دنوں سے غیر متوقع نہیں رہی تھی۔ کئی مہینے سے مری ہمت ان کو دیکھنے جانے کی نہ ہوئی باوجود اس کے کہ وہ طرح طرح سے بار بار یاد کرتے رہے اور احسان کا بھی اصرار رہا۔ جس کو زندہ، ہنستا، بولتا محبت کرتا ہوا دیکھتا چلا آیا، اس کو موت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔

عمرالدین صاحب سے ان کی طالب علمی کے زمانے سے آشنا رہا۔ رفیق باصفا تھے۔ آپ اور احسان کو تو شاید وہ سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ظاہر کتنا کھردرا اور ناقابلِ التفات، باطن بہر وفا سے کیسا مزّین و مُعطّر!"

کسی محترم یا عزیز کی موت پر بھی میرے آنسو نہیں نکلے اُن کی تلافی میں شعر سے کرتا ہوں:

بیادِ دوست

اندھیری رات میں یوں گل ہوا چراغِ دوست
حیات اب نہ کبھی پائے گی سراغِ دوست
بس ایک یاد! کہ روشن ہیں جس سے دیدۂ و دل
مژہ پہ ہے یہ ستارہ تو دل میں داغِ دوست

کہیں تو کس سے کہیں جا کے داستانِ دوست
یہ سانحہ ہے عجب، مرگِ ناگہانِ دوست
وہ جس کو ڈھونڈھتی پھرتی ہیں نظریں یوں شب و روز
کہ جب ملا کوئی انساں، ہوا گمانِ دوست

یہ کھویا کھویا سا کیوں آج ہے دیارِ دوست
یہ کیوں ہے خاک بسر آج رہ گزارِ دوست
مگر یہ دل کہ گزرگاہِ ماہ و سال نہیں
رہے گا تا بہ ابد محوِ انتظارِ دوست

نہ کہیے کچھ کہ یہی ہے بس اب رضائے دوست
نہ کیجیے اُف کہ یہی ہے یہاں وفائے دوست
یہ پردہ داری و دوری، یہ فصل و مجبوری
برائے دوست ہوئی یہ بھی اک ادائے دوست

حیدرآباد میں جب میں شخصی مرثیہ لکھ رہا تھا تو مجھے اک لمحہ کے لیے محسوس

کہیں اپنے شہر اور اپنے لوگوں سے دور ہوں۔ میری یادوں کے پردے پر ماضی کی تصویریں اُبھرنے لگیں۔ عمرالدین صاحب کا دَم دَمے کے ہاتھ میں ہونا لیکن پھر بھی جینے کی آرزو کا زندہ رکھنا۔ ہر ہفتے کسی نہ کسی سے فرمائش ہوتی کہ آج پنچایتی کھانا ہوگا۔ میرے یہاں کی ڈش مقرر تھی، قیمے بھرے کریلے۔ ہم سب کو محسوس ہوتا کہ ہم سب انکے اہل خانہ ہیں۔ انھیں کی تحریک پر علی گڑھ سے رخصت ہوتے وقت احباب نے میری جتنی دعوتیں کیں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہوں۔ وہ میری علی گڑھ واپسی کے رشید صاحب ہی کی طرح منتظر تھے، لیکن میں وہاں چار سال کی تاخیر سے پہنچا۔

آٹھواں باب

دیارِ فرنگ

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں (اقبال)

(۵۰ تا ۱۹۵۳ء)

یونیورسٹی کے انجینئرنگ کوارٹرز نمبر ۴ میں نجمہ کے ساتھ ڈھائی سال تک مقیم رہا۔ اس زمانے کا سب سے اہم واقعہ میرے پہلے بچے جاوید حسین کی (جو اب انجینئرنگ کالج میں فزکس کا پروفیسر ہے) ۲ر جنوری ۱۹۵۰ء کو ولادت ہوئی تھی۔ میرے اور نجمہ دونوں کے لیئے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ ہمارے آگے پیچھے خاندان کا کوئی بڑا نہ تھا جو اس سلسلے میں ہماری رہبری کرتا۔ عرصے کے بعد میرے اندر کا شاعر جاگ اٹھا، اس موقع پر "ننھا شاہکار" کے عنوان سے ایک نظم کہی جس کے چند اشعار یہ ہیں:

میرا ننھا سا شاہکار ہے تو
ماں کی آنکھوں میں نو بہار ہے تو
پھول کی پنکھڑی سے نازک تر
حرفِ نازک سے شرمسار ہے تو
شعر ہے، خون کا مجسّم شعر
گنگناتا ہوا سا پیار ہے تو

ہیں جم زندگی کے اندر و خم
بار ہے اور حسین بار ہے تو
رقص کی اُس کے ایک جولانگہ
زندگی کو نیا دیار ہے تو
جو محبت کو پہلی بار آیا
بے قراری میں وہ قرار ہے تو (۱۹۵۰)

ادھر میں اپنے بچے کی ولادت پر مسرت کی تمثیلات تراش رہا تھا کہ خبر ملی میرے ایک عزیز شاعر شاگرد اشعر ملیح آبادی کی موت نہایت کس مپرسی کے عالم میں واقع ہوئی۔ ولادت اور موت کے دوراہے پر کھڑے ہو کر میں نے جانے والے کا ماتم ان الفاظ میں کیا:

اشعر کی موت

اشعر کی موت ایک گلِ تر کی موت ہے
چشمِ صدف میں یا کسی گوہر کی موت ہے
روحِ ادب سے کہہ دو جواں میر شاعرو!
قطرے کی موت ہے، تو سمندر کی موت ہے
کس سے کہوں کہ دامنِ حسرت کے سائے میں
شاعر کی موت ہے، کہ گداگر کی موت ہے
میں گاتا ایک گیت یہ ملتی کسی طرح
لیکن یہ سنگ دل ہے، یہ پتھر کی موت ہے (۱۹۵۵)

دونوں نظموں کو ساتھ ساتھ رکھ کر پڑھا جائے تو نشاطیہ اور المیہ کا فرق محسوس ہوگا۔ ایک میں تخیل کی کشیدہ کاری ہے تو دوسرے میں الم کی سوزن کاری۔ مجھے ابھی یہ دونوں نظمیں پسند ہیں۔

اِدھر کچھ عرصے سے میں سفرِ یورپ کا پروگرام بنا رہا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں میں نے مسلم یونیورسٹی سے دو سال کی رُخصتِ تعلیمی لی اور ۷ ستمبر ۱۹۵۰ء کو بمبئی سے پانی کے جہاز سے روانہ ہو کر ۲۴ ستمبر کو لندن کی بندرگاہ تل بری پہنچ گیا۔ راستے میں جہاز عدن اور پورٹ سعید پر رُکا۔ معلوم ہوا ابھی ہم مشرق ہی میں ہیں۔ وہی افلاس، چخ چخ، چیخ پکار اور گندگی۔ ہندی ہو کہ یمنی یا مصری، زبانوں کے فرق کے ساتھ ہم ایک ہیں۔ البتہ جب کچھ روز کے بعد جہاز نے جنوبی فرانس کی بندرگاہ مارسیلز پر لنگر کیا اور چند گھنٹے کے لیئے ہم لوگ ساحل پر اُترے تو معلوم ہوا دنیا ہی بدلی ہوئی ہے۔ جابجا میزوں پر فرانسیسی مئے ارغوانی کی بوتلیں چنی ہوئی تھیں اور ساقیانِ مہ وش ساقی گری میں مصروف تھے۔ ہمارے جہاز کے بہت سے ساتھی بلا امتیاز مذہب و ملّت ان میزوں پر پروانہ وار گرے اور نوشا نوش کا کاروبار شروع کر دیا۔ بھیڑ کا ایک باعث وہ نوخیز کم سن فرانسیسی لڑکیاں بھی تھیں جو ہنس ہنس کر جام پیش کر رہی تھیں، بشرطیکہ دام آپ کی جیب میں ہوں۔ میں اِس منظر کا ایک حصّہ بنا کچھ فاصلے پر کھڑا سوچ رہا تھا ؎

میرا یہی خیال ہے گو میں نے پی نہیں
کوئی حسیں پلائے تو یہ شئے بُری نہیں (ریاض)

انگریزی حُسن کے جو نمونے اب تک ہندوستان میں دیکھے تھے وہ بے نمک، بے رنگ اور سپاٹ تھے بحرۂ روم کے سواحل کے، لاطینی خون سے سرشار حُسن کے نظارے پہلی بار دیکھنے کو ملے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ ان کے بارے میں جو تاثرات میرے چچا ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے پچیس برس قبل تھے (دیکھیے یادوں کی دنیا) بالکل وہی میرے تھے۔ ہمارے ذہن میں مکمل نسوانی حُسن کا جو تصوّر تھا اسے ان لڑکیوں میں متشکل پایا۔ وہ بہت تیز فرانسیسی بولتی تھیں، بس کچھ ایسا احساس ہوتا تھا ؎

کیا باتیں ہیں کترتی ہیں گُلِ نغمہ صدا
کیا دہن ہیں کہ نکل آتی ہے بھر بات میں بات
کیا نگاہیں ہیں کہ شبنم میں شعاعیں پیوست
کیا ادائیں ہیں کہ شاہوں نے یہاں کھائی مات

مارسیلز سے جہاز جبل الطارق ہوتا ہوا لندن کی بندرگاہ تل بری پہنچا۔ وہاں مجھے لینے کے لیے انور انصاری اور ان کی بیگم غزالہ انصاری موجود تھیں جو سال بھر پہلے لندن آچکے تھے۔ ان کی موجودگی کی وجہ سے مجھے وہ دقتیں نہیں اٹھانا پڑیں جو عام طور پر تازہ واردانِ انگلستان کو پیش آتی ہیں۔ میرے قیام کے لیے پہلے سے اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز کی پشت پر Tavistock Square کے ایک پرائیویٹ ہاسٹل میں انتظام تھا۔ میں اس بات سے خوش تھا کہ جہاں میرا داخلہ ہوا ہے یہ اس سے بہت قریب تھا لیکن چند روز رہنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اس کی نوعیت تو سرائے کی سی ہے۔ ایک ایک کمرے میں کئی کئی پلنگ تھے وہ بھی اوپر نیچے ڈبل' یعنی ایک پلنگ پر میں اوپر کی منزل میں تھا اور ایک اور لڑکا نیچے کی منزل میں۔ ہر وقت آمد و رفت اور پلنگ کی چوں چوں سے تنگ آکر میں نے قیام گاہ کی تلاش شروع کردی۔ بالآخر Swiss Cottage کے علاقے میں ایک سوئس لینڈ لیڈی کے یہاں کمرہ مل گیا۔ وہ عرصے سے لندن میں بود و باش اختیار کیے ہوئے تھیں اور فی الحال پاس پاس کے دو مکانوں کی مالکہ تھیں۔ ان میں زیادہ تر وہ غیر یورپی طلباء کو قیام و طعام کے معاوضے پر رکھتیں۔ یعنی کمرے کا کرایہ لیتیں اور ناشتہ اور شام کا کھانا دیتیں۔ سارا کام خود کرتی تھیں۔ میرے لیے یہ علاقہ اس لیے بھی دلچسپی کا باعث تھا کہ پاس ہی کی سڑک Belsize Avenue پر دس بارہ سال قبل میرے بڑے بھائی امتیاز حسین خاں مقیم رہ چکے تھے۔ زیرِ زمیں ریل Tube کا اسٹیشن سامنے تھا جہاں سے دس منٹ کے اندر یوسٹن پر ریل بدلنے کے بعد آدمی لندن یونیورسٹی کے علاقے میں پہنچ جاتا تھا، جہاں اسکول واقع تھا۔

سوئس کاٹیج میں چند ماہ سے زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکا۔ کچھ عرصے کے بعد مکھن کے معاملہ پر سوئس لینڈ لیڈی سے میرا اختلاف ہو گیا۔ جنگِ عظیم دوم کو ختم ہوئے پانچ سال کا عرصہ ہو چکا تھا لیکن انگلستان میں مکھن اور انڈے جیسی روزانہ کی اشیائے ضرورت راشن سے ملتی تھیں۔ لینڈ لیڈی ہمارے راشن کارڈ پر سارا راشن لے لیتی اور ہمیں اس قدر بھی نہیں دیتی کہ کسی وقت ہم اپنی پسند کی کوئی چیز پکا سکیں۔ اس کے کرایہ داروں میں میرے علاوہ پاکستان کے بھی تین نوجوان تھے۔ انھوں نے تحریک اٹھائی اور مجھے اگوا

بنا دیا۔ میں نے کمرہ چھوڑ دینے کی دھمکی دی۔ میری دھمکی ہی کام آگیا اور وہ اپنے مقام پر رہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک صاحب کی (جن کا اصل تعلق لکھنؤ سے تھا) میرے کمرے پر پر نظر تھی۔

وہاں سے میں نکلا تو Nottingham Place پہنچا۔ یہ مقام مادام ٹساد کے موموں کے مجموں کے میوزیم کے قریب تھا۔ لندن کا یہ میوزیم بھی عجیب وغریب جگہ ہے۔ ہر ملک وقوم کے مشاہیر کے موم میں ڈھلے ہوئے مجسمے یہاں نصب ہیں۔ ان میں بعض تو اس قدر حقیقی معلوم ہوتے ہیں کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ ناٹنگم پلیس کی قیام گاہ لندن یونیورسٹی سے زیادہ قریب تھی لیکن یہاں میرا قیام بہت مختصر رہا۔ گرما کی تعطیلات میں پیرس چلا گیا۔ وہاں سے واپس آکر وہاں دوبارہ جانے کے انتظامات میں لگا رہا۔ یہاں میرے ساتھ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ بنگالی کے استاد عبدالحیٔ بھی کچھ عرصہ مقیم رہے۔ وہ بھی السنۂ مشرقیہ کے اسکول میں شعبۂ لسانیات کے طالب علم تھے۔ علم اور حسن کے درمیان اپنے وقت کو تقسیم کرنے کا ہنر انھیں خوب آتا تھا۔ اسکول سے لسانیات میں ایم۔ اے بھی کیا اور ہائڈ پارک کے حسن رہ گزر سے لطف اندوز بھی ہوئے۔ ڈھاکہ واپس جاکر چالیس برس کی عمر میں اپنی ایک نوجوان طالبہ سے عشق کیا اور جب کامیابی نہیں ہوئی تو ریل سے کٹ کر جان دے دی۔ مجھے ان کی موت کا قلق مہینوں رہا۔

میں نے اسکول آف اورنٹیل اسٹیڈیز کے شعبۂ لسانیات میں داخلہ لیا۔ خیال تھا کہ توضیحی لسانیات کی تربیت حاصل کرنے کے بعد اردو کے کسی پہلو پر تحقیق کروں گا۔ لسانیات کے شعبہ کے سربراہ پروفیسر جان روپرٹ فرتھ تھے، جو عرصۂ دراز تک ہندوستان میں رہ چکے تھے۔ دراصل سارا اسکول ایسے اساتذہ سے بھرا ہوا تھا جو ہندوستان کے راندۂ درگاہ تھے اور جن کے ذہن میں ہندوستان کی یادیں تازہ تھیں۔ ۱۹۵۰ء کا انگریز پروفیسر اور آزاد ہندوستان کا طالب علم دونوں بہت سے تحفظاتِ ذہنی رکھتے تھے۔ پروفیسر فرتھ کی اپنے علم میں شہرت تھی۔ اُن کے عام لسانیات کے لکچروں میں بعض اساتذہ تک شرکت کرتے تھے۔ ہندوستان میں طویل عرصہ تک قیام کرنے کے باوجود انھوں نے یہاں کی کسی زبان میں مہارت حاصل نہیں کی تھی، البتہ ہندوستانی اور پنجابی سے بعض اوقات مثالیں دے لیتے تھے۔

ان کا جونیئر اسٹاف اس اعتبار سے اور گیا گزرا تھا۔ انھیں میں ۲۵ سالہ مس Evans تھیں (جو بہت بعد کو شادی کرکے Mrs. Whitley بن گئیں) وہ اردو/ہندی سے بالکل ناواقف تھیں۔ لیکن ہندوستانی طلبہ کی ٹیوٹر انچارج تھیں وہ پروفیسر فرتھ کے Prosodic Features کے نظریے کا اردو/ہندی پر بے دریغ اطلاق کرتی تھیں اور ان زبانوں کے اپنے تلفظ کو معیاری تلفظ سمجھ کر اس کی ڈرل کراتی تھیں۔ خاص طور پر اردو کی معکوسی (ٹ۔ ڈ۔ ڑ۔ وغیرہ) یا نفسی آوازوں (بھ۔ پھ۔ تھ۔ وغیرہ) کا جب وہ تلفظ کرتیں تو میرے لبوں پر مسکراہٹ کھیل جاتی۔ میں ڈرل میں ان کے تلفظ کو قبول کرنے سے انکار کرتا اور خاموش بیٹھا رہتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری یہ حالت ہو کہ ع

زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

اس کے برعکس دیگر ہندوستانی طالب علم طوطے کی طرح جو وہ کہلواتیں کہتے رہتے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے عبدالحئی اس میں اپنی بنگالی کا گول مول یا 'شِشکاری' تلفظ ملا دیتے تھے جسے سن کر میرے منہ سے کبھی کبھی 'کھی کھی' کی آواز پیدا ہو جاتی۔ مثلاً وہ کہتیں 'چلیا'، (دراصل 'چلٹا' کہتیں) تو عبدالحئی 'چوتا' کہتے۔ وہ 'سندر' کہتیں تو عبدالحئی 'شُندر' کہتے۔ خود اپنا نام 'ھوبدل ھوئی' بتاتے اور مس ایونز کو 'مِش ایون' کہتے۔ چوں کہ انگریزی کے t/d اور t/d نہ تو اردو کے ات ا ا د ا کے مساوی ہیں اور نہ ٹ ا ا ڈ ا کے بلکہ ایک درمیانی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے مس ایونز مسلسل انگریزی صوتیات کے مطابق ان کا تلفظ کرتیں اور میرے صحیح تلفظ کو غلط بتاتیں۔ یہاں سے اُن کی مجھ سے ناراضگی کا آغاز ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے پروفیسر فرتھ کے کان بھرنا شروع کیے۔ وہ بھی سوچنے لگے کہ تین سال پہلے کا غلام ہندوستانی اور اس قدر باغی! چنانچہ ان کا بھی رویّہ بدلنے لگا۔ یا تو انھیں میری خیریت دریافت کرنے کا اس قدر شوق تھا کہ اگر کبھی پیشاب خانے میں مَیں فراغت کے لیے کھڑا ہوں اور وہ بھی ضرورتاً آگئے ہیں، تو عین عالمِ فراغت میں وہ مجھ سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے۔ انھیں کیا معلوم کہ ہندوستانی معاشرے میں یہ حرکت عجیب وغریب سمجھی جاتی ہے۔ وہ بلا تکلّف ذات و کائنات کی باتیں کرتے رہتے اور میرا پیشاب خطا ہو جاتا۔

لندن کے قیام کی ایک شام مجھے کبھی نہیں بھولے گی۔ ستمبر ۱۹۵۰ء میں جب لندن پہنچا تو معلوم ہوا افقِ ہند کے سارے گم شدہ ستارے وہاں موجود تھے۔ ان ستاروں نے لاہوری روایت کے مطابق خود کو ایک 'حلقہ' (معروف بہ 'دہلکا') کی شکل میں منظّم کر لیا تھا۔ اس حلقہ کا جلسہ ہر مہینہ کے آخری سنیچر کو کسی نہ کسی رکن کی قیام گاہ پر منعقد ہوتا۔ اس حلقے کی زد سے کسی نووارد کا بچ نکلنا مشکل تھا۔ آپ شاعر ہوں یا متشاعر، ترقی پسند ہوں یا غیر ترقی پسند، وسیع لندن کے اس محدود حلقے میں آپ کسی نہ کسی وسیلے سے ضرور جا پہنچیں گے۔ پھریے تو وہاں کئی سلسلے تھے: فرنگی محل کے کمیونسٹ انور انصاری اور ان کی بیگم غزالہ انصاری، علی گڑھ کے پُرانے گنہگار 'حلقہ یاراں کے سردار' جگت چچا، صدیق احمد صدیقی اور پھر حلقے کے میر شکار اعجاز حسین بٹالوی، جن سے میری واقفیت اس وقت سے تھی جب وہ دہلی ریڈیو اسٹیشن پر کام کرتے تھے۔

شاید جنوری ۵۰ء کا آخری سنیچر تھا۔ حلقہ کا جلسہ لندن کے پُر تکلف ویسٹ اینڈ میں افسانہ نگار غلام عباس کے فلیٹ میں منعقد ہوا۔ صاحبِ خانہ خود اس روز ایک مہمان لطیف کی پذیرائی میں مصروف تھے۔ اس لیے ان کا ایک قدم اپنے باورچی خانہ تھا تو دوسرا حلقے کی مجلس میں۔ ایک مسلسل دوڑ ادب اور حسن کے درمیان تھی۔ مجلس کا نقشہ عباس صاحب کی بڑی گول میز کے اردگرد جما ہوا تھا۔ کوئی کرسی پر تو کوئی فرش پر اگر اتنے میں کوئی خاتون آجاتیں تو کسی نہ کسی کو کرسی خالی کرنی پڑتی۔ احتیاط پسند اسی لیے پہلے سے خاک نشین تھے۔

اس دن کے میرِ مجلس حفیظ جاوید تھے۔ اُن کے داہنے ہاتھ پر اعجاز بٹالوی، سکریٹری حلقہ، مسلسل گل افشانیٔ گفتار پر آمادہ نظر آرہے تھے۔ یہ آمادگی خواتین کی تعداد اور نسبت سے بیش آمادہ تر ہوتی جا رہی تھی۔ سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے میں ایک حلقہ گیر جماہی کے ساتھ جناب صدر نے جلسہ شروع کرنے کا اعلان کیا۔ سکریٹری نے پچھلے جلسے کی رپورٹ سنائی اور کہا آج کی خاص چیزیں دو نظمیں ہیں جو منیب الرحمٰن اور مسعود حسین سنائیں گے۔ قرعہ میرے نام پڑا۔ نظم آزاد تھی، عنوان تھا 'انتظار'۔

یہاں پر حلقہ کی بعض روایات کا ذکر دینا بے محل نہیں ہوگا۔ حلقہ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسے 'انجمنِ ستائشِ باہمی' قسم کی چیز نہ بننے دیا جائے۔ اس میں ہر قسم اور دبستاں

کی چیز پڑھنے کا مجاز تھا لیکن تنقید بے لاگ ہو گی۔ کہنے کو بے لاگی۔ فاصلہ، بے تعلقی اس کی تنقید کے محور تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ جس طرح سنگم پر کھڑے ہو کر آپ گنگا اور جمنا کے دھاروں کا رنگ فوراً پہچان لیتے ہیں اسی طرح حلقہ بھی دو دائروں میں تقسیم تھا۔ مارکسی اور غیر مارکسی۔ مارکسی نقادوں کی قیادت انور انصاری اور منیب الرحمٰن کر رہے تھے، ایک عقل سے، دوسرا جذبات سے۔ ان کے ساتھ ایک کارواں تھا اور بھیڑ گردِ کارواں۔ دوسرا پرا اعجاز بٹالوی اور غلام عباس کا تھا جن میں سے ایک غنیم کی کاٹ مسلسل گفتار سے کرتا اور دوسرا ڈھیٹ خاموشی سے۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان ایسے بھی تھے جو اِدھر بھی تھے اور اُدھر بھی۔ چچا صدیق تھے جن کے متعلق مارکسیوں کا اصرار تھا کہ وہ ہمارے ہیں لیکن ان کی شگفتہ مزاجی خندہ ہائے گل کو بھی برداشت نہیں کرتی تھی۔ کچھ رندِ حلقہ تھے کچھ صوفی اور بیشتر نقش و نگار! خود مارکسی ادیبوں کے مختلف گروہ تھے، کچھ کمیونسٹ مُلا، کچھ مجاہد، اور کچھ عارف، اعجاز کی زندہ دلی پر حلقہ کا توازن قائم تھا۔

خیر جلسے کا آغاز میری آزاد نظم 'انتظار' سے ہوا:

تھکی تھکی سی یہ شامیں سوادِ مغرب کی

میں رو رہا ہوں —

کہ ان کی سحر نہیں معلوم!

بجوم لالہ و گل

(داغ ہائے دل کہ نہ پوچھ!)

لبوں پہ چھڑکا ہوا ہر طرف یہ خونِ گلاب

شباب، آتشِ لب، چشمِ نیلگوں کا فسوں

یہ بوسہ ہائے دراز!

وہ حسنِ رفتہ کو سو سو جتن سے رنگِ قیام

یہ بے قرار نگاہیں، یہ جاگتے سائے

وفا بھی شرما جائے

نظم کا پہلا بند ختم ہوا تو میں نے حاضرین پر نگاہ ڈالی۔ منیب الرحمٰن کی نظریں کھوئی ہوئی سی پائیں۔ معلوم نہیں لبوں کی محرابوں کے پار کیا دیکھ رہے تھے۔ انور انصاری سماجی شعور کی قید و بند کی "خونِ گلاب" کی ترکیب سے آسان گزر کر "آتشِ لب" میں کھوئے ہوئے تھے۔ اعجاز بٹالوی، ہجومِ لالہ و گل میں "بوسہائے دراز" کی جانب سے داخل ہونے کی کوشش میں معروف تھے۔ چچا صدیق وجد میں تھے اور غلام عباس کے ہونٹوں پہ وہی خاموش تبسّم۔

نظم آگے بڑھی:

اِنھیں غرض ترے مشرق کی سرزمینوں میں
وہ سر پہ برسوں سے آنچل کو اپنے ڈالے ہوئے
ہے انتظار میں کس کے؟ ــ کوئی نہیں آتا
وہ انتظار، جو مغرب کے فن نے پیدا کیا
کبھی کبھی بُتِ سنگین میں یا لکیروں میں!
وہ انتظار، جو آنکھوں، لبوں نے، باہوں نے
کیا تھا، آئیں گے ــ لیکن کوئی نہیں آتا
وہ انتظار، جو بیگانۂ وفا نہ ہوا

کھلی ہوئی ہیں وہ آنکھیں ــــ
کہ تھک چکی ہے نظر
مگر وہ شام و سَحر مشعلیں جلائے ہوئے
تکا کریں یوں ہی محرابِ روز و شب کے پار
کہ وقت شرما جائے!

نظم کے خاتمے پر میری نظر نے پھر اہلِ حلقہ کا جائزہ لیا۔ آنکھوں میں تنقید کی اجھی بولی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، لیکن حملہ آور ہونا ضروری تھا۔ دفعتًہ انور انصاری نے محسوس کیا ہے کہ شاعر "انحراف" کر گیا ہے۔ اعجاز بٹالوی کا تخیل انتظار اور وفا کے

دائروں میں گھومتا ہوا محرابِ ابرو و لب کے پار جھانکنے لگا۔ وہ داد پر مُصر تھے۔

تنقید کی ابہامی فضا کو صدرِ جلسہ نے ایک جماہی کے ساتھ یہ کہہ کر توڑا "اب مسعود صاحب کی نظم کے بارے میں کوئی صاحب کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کہیں ...... ہر طرف خاموشی دیکھ کر ...

"اچھا تو میں خود تنقید شروع کرتا ہوں"

لیجئے صاحب تنقید شروع ہو گئی۔

میری اور حلقہ دونوں کی شومئی قسمت حفیظ جاوید اس روز برائے لُس میں تھے۔ آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ ایسے میں وہ تنقید کی آڑ میں کیا کچھ نہ کہہ گئے ہوں گے۔ میں کچھ دیر اُلجھا۔ ان کے فنّی اعتراضات کا جواب میر و غالب کے حوالے سے دیا چاہا۔ لیکن جب میر و غالب پر بھی برسنے لگے تو خاموش ہو گیا۔ میں پوچھتا رہا کہ حضرات! میری نظم کا مرکزی خیال کیا ہے؟ جواب ملا اس میں سماجی اقدار معدوم ہیں۔ زبان کے استعمال میں جدیاتی حقیقت پسندی کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے وہ تو معاملہ زلفِ دراز کا سا طول پکڑتا کہ میں نے خواتین کے قیمتی وقت اور ان کی دیگر مشغولیت کا حوالہ دیا تب کہیں جا کر گلو خلاصی ہوئی۔

اس کے بعد افسانے بھی ہوئے اور نظمیں بھی۔ داد بھی ملی اور بیداد بھی ہوئی۔ مگر میں مسلسل سوچتا رہا کہ اہلِ سخن کے بجائے کبھی کبھی سخن فہموں کی بھی آزمائش ہونی چاہیئے جسے دیکھئے نقد و بصر کا کانٹا لیئے پھرتا ہے۔ مانگے تانگے کے کچھ باٹ ہیں، دھرے اور تول دیا۔

انھیں خیالات میں غلطاں و پیچاں بارہ بجے رات کو اپنی قیام گاہ پر واپس لوٹا۔

اگلے مہینے کے آخری سنیچر کی شام کو حلقہ کا پھر جلسہ ہوا۔ وہی غلام عباس کا فلیٹ، کم و بیش وہی حاضرین۔ جلسہ شروع ہونے ہی والا تھا کہ میں نے انور انصاری سے کان میں چپکے سے کہا "آپ کو معلوم ہے آج کل میں برٹش میوزیم میں کام کر رہا ہوں، وہاں غالب کی ایک غیر مطبوعہ نادر غزل ہاتھ لگی ہے اگر صدر صاحب اجازت دیں تو اسے بھی آج کے پروگرام میں شامل کر لیا جائے۔" انور انصاری نے بڑھ کر بات اعجاز بٹالوی کے کانوں تک پہنچائی وہ منکرِ غالب، کیوں کر ہو سکتے تھے، خوشی کا ایک نعرہ لگایا اور میری اس دریافت کا اعلان کیا۔ پھر کیا تھا ہر طرف سے مانگ تھی "غالب کی غزل، بھئی غالب کی غزل پہلے ہونی چاہیئے" منیب الرحمٰن

کے عادتاً مضمحل چہرے پر اس وقت ایسی مسرّت کی لہر تھی گویا نایاب دفینہ مل گیا ہو۔ میں نے جیب سے کاغذ نکالا، ناک پر عینک درست کی اور کہا "حضرات غالب کی اس غیر مطبوعہ غزل کا تعلق میرے خیال میں اُن کے ابتدائی دور کی شاعری سے ہے جب "خامۂ بیدل" اُن کا رہبر تھا۔ آپ سب سخن فہم ہیں لیجئے اسد اللہ خاں کے تیور دیکھئے۔ اس کے بعد ترنّم سے یہ اشعار پڑھے:

یتری افسردہ دلی بادۂ خوش رنگِ خمار
میری افسردہ دلی داغِ سویدائے بہار

جنسِ بازارِ محبت کہ ہے وصلِ زنگار
عرضِ خمیازۂ ایجاز کہ نقشِ دیوار

زندگی گرسنہ دکوہکن دتیشہ بدوش
صحنِ صحرا چمنِ شوق کو احرامِ بہار

جادۂ غم نگہِ کم ہے کہ جز بیش نہیں
قیمتِ شورشِ پیہم بھی نہیں زخمۂ تار

کتنا اندوہ رُبا ہے یہ ربابِ ہستی
کس قدر عربدہ جو ہے نگہِ موجِ غبار

طلبِ ناز کہ ہے مستیٔ بیدار سے دنگ
رنگِ ہستی طلبِ شوق سے کتنا بیزار

کفِ گردوں میں اگر جامِ زمرّد نہ ہوا
حسرتِ دل میں بھی ممکن نہیں عالم کا فشار

ہم محبت کو ترا نقشِ قدم عرضِ نیاز
ہم حقیقت کو تری بندشِ غم زخمۂ تار

دیدۂ و دل غمِ ہستی سے اسدؔ بے معنی
فیضِ معنی سے محبت ہوئی حرفِ اغیار

مطلع پر مکمل سکوت تھا۔ یہ کسی معمولی شاعر کا نہیں غالب کا کلام تھا۔ دوسرے شعر پہ گردنیں ہلیں۔ بھلا غالب بغیر داد کے کیوں کر بچتے۔ سب سے پہلے حسبِ عادت، اعجاز بٹالوی نے لب کشائی کی، سُبحان اللہ! اور جب میں دوسرے شعر پر تھا تو چیخ کر کہا واہ! واہ! "داغِ سویدائے بہار" ان کی آوازِ تحسین ابھی گونج ہی رہی تھی کہ انور انصاری نے بھڑک کر یہ مصرع اٹھایا ع

زندگی گرسنہ وکوہ کن وتیشہ بدوش!

اور پھر یہ نہ سوچا کہ ع

صحنِ صحرا چمنِ شوق کو احرامِ بہار!

صدرِ مجلس حفیظ جاوید بھی جو آج اپنے بس میں تھے، ہر شعر پر پھڑک کر داد دے رہے تھے۔ تنقیدی تخیل بغیر آسمان کے پرواز کر رہا تھا، طلبِ ناز، "مستی بیدار" اور "کفِ گردون" بن اور بگڑ رہے تھے۔ گرسنہ زندگی کی تیشہ بدوشی تنقید کی جدلیاتی راہوں کو کھول رہی تھی۔ تنقید کا بحران اس وقت آیا جب چچا صدیق نے نہایت تول کر تحسینی انداز میں کہا "وہی نقش فریادی والا رنگ ہے"۔ ابھی تنقید داد اور بیداد کی فضا میں سانس ہی لے رہی تھی کہ میں مقطع کی سخن گسترانہ بات تک پہنچا اور بے تحاشا ہنس پڑا۔

چچا صدیق فوراً بھانپ گئے کہنے لگے میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ "نقش فریادی" والا رنگ ہے۔ لیکن ان کا یہ جملہ تحسین کا نہیں اعتراف کا تھا۔ ایک صاحب جو پچھلے ماہ کے جلسے میں موجود نہیں تھے یہ کہتے ہوئے سُنے گئے "مسعود صاحب! آخر ہم لوگوں نے کیا قصور کیا ہے؟" لیکن اعجاز بٹالوی مُصر تھے کہ یہ غزل غالب کی ہو نہ ہو اس کے بعض اشعار میں "گنجینۂ معنی کا طلسم" موجود ہے۔ "واللہ مسعود صاحب! اسے اپنی بیاض میں ضرور رکھیے گا"۔

میں نے کہا: "میں اپنی بیاض میں رکھوں یا نہ رکھوں آپ اسے حلقے کی روداد میں ضرور رکھیے گا۔

۱۹۵۳ء میں یورپ سے واپس آکر میں نے اس واقعہ پر "لندن کی ایک شام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو علی گڑھ میگزین کے طنز و ظرافت نمبر (۱۹۵۳ء) میں شائع ہوا۔

اعجاز بٹالوی نے بھی اِس مہملات کو حلقہ کی رپورٹ میں محفوظ کر لیا اور لندن سے واپسی پر معاصر (لاہور) میں لندن کے حلقۂ اربابِ ذوق کا ذکر کرتے ہوئے اس کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔

مِس ایونِنز کی شکایات آخر کار رنگ لائیں۔ پروفیسر فرتھ نے ایک دن بلا کر مجھ سے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے۔ مِس ایونِنز آپ کے رویّے سے مطمئن نہیں ہیں۔ میں نے کہا میں ان کے طریقۂ تعلیم سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں خود یونیورسٹی میں اردو کا استاد ہوں، تاریخی لسانیات پر تحقیق کر چکا ہوں اس لیے میں بے معنی صوتی مشقوں میں (جو میرے نزدیک مشتبہ بھی ہیں) اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ میں یہاں مزید تحقیق کے لیے آیا ہوں، صوتیاتی ڈرِل کے لیے نہیں۔ فوراً فرتھ کے اندر کا سویا ہوا انگریز جاگ اٹھا۔ نہایت بے رُخی کے ساتھ بولے۔ "آپ ہندوستان میں کچھ بھی ہوں، یہاں داخلہ لیا ہے تو ہمارے طریقِ کار کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ آخر کار عبدالحئی بھی تو ڈھاکہ یونیورسٹی میں بنگالی کے استاد ہیں وہ کیوں نہایت خوش دلی کے ساتھ حصّہ لیتے ہیں۔" میں نے کہا "ان کی مادری زبان بنگالی ہے ممکن ہے ہندوستانی زبان کی ڈرِل سے کچھ فائدہ اٹھالیں، میرے لیے تو یہ تضیعِ اوقات کے سوا اور کچھ نہیں۔"

مجھے اسی روز اندازہ ہوگیا کہ اب یہاں دال نہیں گلے گی۔ لسانیات کے شعبے میں ہندوستان کی زبانوں کے بارے میں صرف فرتھ تحقیق کرا سکتے تھے اور وہ صدرِ شعبہ کی حیثیت سے انتظامی کاموں میں بہت مصروف رہتے۔ اس سے جو وقت بچتا تو اپنے

کے صوتیاتی نظریے کی قطع و برید میں مصروف رہتے جس سے انھیں علمی حلقوں میں شہرت ملی تھی۔ میری خواہش دراصل یہی تھی کہ اس نظریے کا اردو کے بعض صوتیاتی پہلوؤں پر اطلاق کروں اس پر میں نے انھیں طویل مضمون لکھ کر دکھایا تھا جس سے وہ بہت مطمئن تھے۔ کہنے لگے اس سے قبل صرف ڈاکٹر شوبھا تھی پرساد نے بھوجپوری پر میرے کے نظریے کو آزمایا ہے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ لیکن میری ساری ریاضت دھری رہ گئی اور "مِس خام" بازی لے گئیں۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ اب یہاں میرے لیے کوئی جگہ نہیں۔

گرما کی تعطیلات میں چند ساتھیوں کے ساتھ پیرس گھومنے گیا۔ گھومنے کیا ٹٹولنے گیا کہ وہاں لسانیاتی تحقیق کے سلسلے میں کیا سہولتیں مل سکتی ہیں۔ وہاں کالج دُ فرانس میں مشہور مستشرق اور میرے چچا ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے استاد لوئی ماسیوں Louis Massignon درس دیتے تھے۔ پاس میں صوتیات کا ادارہ Institute de Phonetique واقع تھا جس کے ڈائریکٹر پروفیسر پیر فوشے تھے۔ میں نے دونوں حضرات سے رابطہ قائم کیا اور ان کی جانب سے ہمت افزائی پاکر پیرس منتقل ہوجانے کا منصوبہ بنالیا۔ چنانچہ داخلے کے فارم اسی وقت بھر دیئے اور فرانسیسی سیکھنے کے لیے Alliance Francaise میں نام درج کرالیا۔ اس طرح تعطیلات کو بامقصد بنالیا۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں میں باقاعدہ طور پر پیرس منتقل ہوگیا جہاں میری خوش قسمتی سے سیتے یونیورسیتیر Cité Universitaire (شہر جامعہ) کے مرکزی ہوسٹل Maison Internationale (بین الاقوامی دار الاقامہ) میں مجھے سنگل سیٹ کا کمرہ مل گیا۔

پیرس میں میرے سامنے اب دو محاذ تھے ایک تحقیقی اور دوسرا فرانسیسی زبان میں مہارت حاصل کرنے کا۔ دن بھر سوربون، لانگ زو (السنہ مشرقیہ کا اسکول) اور ببلیوتیک ناسیونال (نیشنل لائبریری) میں گذرتا اور شام میں الیانس فرانسیز Alliance Francaise میں جہاں دو شفٹوں میں فرانسیسی زبان کی پڑھائی ہوتی تھی مجھے فرانسیسی کا پڑھنا اور لسانیات پر فرانسیسی میں لکھی ہوئی کتابوں سے استفادہ کرنا بہت جلد آگیا۔ اس لیے کہ انگریزی اور فرانسیسی کی علمی اور اصطلاحی زبان میں حد درجہ یکسانی پائی جاتی ہے لیکن ابھی دوسری سطحات تحریری اور تکلمی پر بہت کام کرنے کی ضرورت تھی۔ لانگ زو میں میری ملاقات دو فرانسیسی طالب علموں سے ہوئی موسیو ارزواں اور مادام لیلیان نذرو۔ ایک ہندی سیکھ رہا تھا اور دوسری اردو۔ دونوں سے باہم دگر تبادلہ کا پروگرام بن گیا۔ اس طرح میری فرانسیسی بولنے کی مہارت تیزی سے بڑھنے لگی۔ فرانسیسی زبان کے املا اور تلفظ میں زمین آسمان کا فرق ہے اس کے لیے قدم قدم پر اہل زبان کی رہبری کی ضرورت بڑی ہے۔ لکھا جاتا ہے 'پیرس' پڑھا جاتا ہے 'پاری'، لکھتے ہیں 'ورسیلز' بولتے ہیں 'ورسائی'۔

میں ان دونوں کا ممنون ہوں کہ ان سے لین دین میں فائدہ میرا زیادہ ہوا۔ مادام لیلیان نذرو جو بہت اچھی انگریزی بھی جانتی تھیں اور ان کے شوہر نذرو، جن کا تعلق ماریشس سے تھا

اور جو مسلمان تھے، صحافی تھے، وہ بھی فرانسیسی اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ ان دونوں کی مدد سے میرے مقالے کی زبان کی نوک پلک درست کرنے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ میں نے انھیں اس کا معاوضہ بھی دیا لیکن اس سلسلے میں ان لوگوں نے جو محنت کی وہ معاوضے سے کہیں زیادہ تھی۔ خود مجھ سے مادام نُدرو نے اردو کے سلسلے میں استفادہ کیا۔ کہ موسیو نُدرو کے انتقال کے بعد وہ ایک وظیفہ پر کراچی یونیورسٹی آئیں اور گارساں دتاسی کی تاریخ ادبیاتِ ہندی و ہندوستانی کا اردو میں ترجمہ کرکے اور اس پر حواشی لکھ کر وہاں سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کام کے لیے ان کے نگراں پروفیسر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر فرمان فتحوری تھے۔ اتفاق سے یہ مقالہ جانچنے کے لیے علی گڑھ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کو بھیجا گیا، جو گارساں دتاسی کے خطبات کے مترجم تھے۔ چوں کہ وہ اس زمانے میں پرووائس چانسلر کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی کے انتظامی امور میں بہت مصروف رہتے، اس لیے انھوں نے مقالے کو میرے سپرد کیا۔ میں نے اس ذمہ داری کو بہ خوشی قبول کیا۔ شاید مادام نُدرو کو (جنھوں نے اب کناڈا کے ایک فرانسیسی سے شادی کر لی ہے) یہ معلوم بھی نہ ہو کہ ان کا پیرس کا علمی قرض میں نے اس طرح ادا کر دیا۔ لیکن اس میں کوئی طرفداری کا پہلو نہیں رہا۔ وہ مقالہ واقعی اِس قابل ہے کہ شائع کیا جائے۔ دو سال قبل جب میں کراچی گیا تھا تو فرمان فتح پوری سے اس کا تذکرہ آیا معلوم ہوا کہ اس وقت مادام نُدرو اپنے فرانسیسی شوہر (؟) کے ساتھ جنوبی کوریا کے شہر سیول میں مقیم ہیں، جہاں ان کے شوہر کناڈا کے سفارت خانے میں کام کر رہے ہیں۔

موسیو اَردواں بھی فرانس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد واردِ ہند ہوئے۔ پہلے کیرالہ میں قیام کیا۔ وہاں انھوں نے ایک ملیالی لڑکی سے شادی کی۔ بعد کو فرانسیسی کے اُستاد کی حیثیت سے اُن کا دہلی یونیورسٹی میں تقرر ہو گیا، جہاں کچھ عرصے پہلے وہ اپنی بیوی اور بچّی کے ساتھ مقیم تھے۔ ایک بار علی گڑھ آکر میرے یہاں چند روز قیام بھی کیا۔ انھوں نے ہندی میں وہ کمال حاصل نہیں کیا جو مادام نُدرو نے اردو میں کیا۔

کئی سال کی محنتِ شاقّہ کے بعد مجھے بالآخر فروری ۱۹۵۲ء کو Doctorat d' Universite سے (جسے عام طور پر اردو میں ڈی لٹ لکھا جاتا ہے) نوازا گیا۔ اور میرا مجموعی نتیجہ

(Très Honorable) (نہایت معزز) رہا۔ پروفیسر لوئی ماسیوں، پروفیسر فوشے اور پروفیسر سوریو نے میرا زبانی امتحان لیا۔ فرانس میں زبانی امتحان کے لیے صلائے عام ہوتی ہے۔ سوریو جمالیات کے پروفیسر تھے اور ان کے ساتھ میں نے ایک ضمنی پرچہ Question Supplemantaire تیار کیا تھا جس کا عنوان تھا "شعر کے تخلیقی عمل میں قوتِ ارادی کا حصہ"۔ یہ جمالیات سے متعلق ہے۔ پیرس یونیورسٹی میں تحقیق کے خاص موضوع کے علاوہ متجانس علوم میں دو مختصر رسالے بھی تیار کرائے جاتے ہیں تاکہ طالبِ علم کی نظر میں وسعت رہے۔ اسے 'ضمیمہ کا سوال' کہا جاتا ہے۔

میرا پیرس کا قیام کئی اعتبار سے سود مند رہا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ فرانس کی روایتی آزاد فضا میں آزاد ہندوستان کے طالبِ علم کو وہ گھٹن محسوس نہیں ہوتی تھی جس کا احساس اس زمانے میں انگلستان کی یونیورسٹیوں میں قدم قدم پر ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ آقا اور غلام کے نئے رشتے استوار ہونے کے لیے کم از کم ایک نسل کی مدت چاہیے اور میں انگلستان آزادی ملنے کے تیسرے سال چلا گیا تھا۔ ممکن ہے اس میں میرے ذہن کی بھی کوتاہی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز کے علاوہ اگر میں آکسفورڈ یا کیمبرج میں ہوتا تو یہ صورت پیش نہیں آتی۔ لیکن اسکول ایسے راندۂ درگاہ انگریزوں سے بھرا پڑا تھا، جو حاکم بن کر ہندوستان میں رہے، کوئی زبان نہیں سیکھی اور انگلستان جا کر السنۂ مشرقیہ کے ماہر بن بیٹھے۔ میرے جذبات کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک بار کسی کام سے میں پاکستانی سفارت خانے گیا۔ وہاں دیکھا کہ لفٹ کو اوپر لے جانے پر ایک سفید چمڑی والا مامور ہے۔ اپنا کام ختم کر کے جب لوٹا تو اس وقت بھی وہ موجود تھا۔ مجھے نیچے لے جا کر اس نے لفٹ کا چارج دوسرے شخص کو دے دیا۔ اب اس کی ڈیوٹی ختم ہو گئی تھی۔ سفارت خانے سے ہم دونوں نکل کر زمین دوز ریل (ٹیوب) کے اسٹیشن کی جانب چلے۔ راستے میں وہ ہم کلام ہوا تو میں نے بھی دریافت کیا، "حضرت آپ یہاں کیسے؟" وہ خاصی روانی کے ساتھ انگریزی لہجے میں اردو بول لیتا تھا۔ کہنے لگا کیا کرے جب سے ہندوستان سے آیا ہے سب مزہ بھول گیا، ہم یہ کرتا ہے اور ہمارا بیوی بڑا لوگ کے فلیٹ کا فرش رگڑتا ہے۔" اس کے بعد اس نے اپنی بیگم کی محنتِ شاقہ

کا ذکر کرتے ہوئے ایک ایسا محاورہ استعمال کیا جو ناگفتنی ہے اور میں یہ کہتا ہوا تُوب میں چڑھ گیا کہ یہ بات تم اپنے لیے کہہ سکتے ہو اپنی میڈم کے لیے مت بولا کرو۔

اسی طرح ایک اور واقعہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب میں ۱۹۵۱ء میں پہلی بار انگلستان سے فرانس گیا تو ریل میں اپنے ساتھ ایک انگریز کو بیٹھا ہوا پایا۔ پہلے تو اُس نے اِس ڈینٹو، کو اِس لائق نہیں سمجھا کہ ہم کلامی کا شرف بخشے۔ لیکن جب سفر اور سکوت کی اکتاہٹ زیادہ بڑھی تو اس نے مختصر سوالوں میں گفتگو شروع کردی۔ مجھے انگریزوں کے دکھڑ سکوت، کو توڑنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ ایک دفعہ جب اُس کو اِس لحاظ سے زچ کرلیتا ہوں تو پھر بے تکلف گفتگو کا سلسلہ شروع کردیتا ہوں۔ چنانچہ یہی اُس وقت ہوا۔ تھوڑی دیر کی بات چیت میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ اس خطۂ ارضی سے بخوبی واقف ہے جہاں سے میرا تعلق ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ ۱۹۴۷ء سے قبل یو-پی کے فلاں گورنر سے اس کی قرابت داری رہی ہے اور اُس کے توسط سے وہ اس صوبے کے بیشتر زمینداروں اور جاگیرداروں کے ساتھ ترائی کے جنگلوں میں شیر کا شکار کھیل چکا ہے۔ اُس نے خاص طور پر نواب صاحب باغپت اور یو پی کے کئی اور بڑے جاگیرداروں کے نام لیے۔

تھوڑی دیر میں پیرس کا ریلوے اسٹیشن آگیا۔ میں قلی کی تلاش میں ڈبّے کے باہر کھڑا ہوا تھا کہ وہ صاحب بہادر، لاٹ صاحب کے عزیز، شیرافگن اپنے دونوں ہاتھوں میں دو بڑے بڑے سوٹ کیس لٹکائے ہانپتے کانپتے لپکتے جارہے تھے!

ع دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

پیرس کی فضا لندن سے بالکل مختلف تھی۔ وہاں حاکم و محکوم کی کوئی یادیں درمیان میں نہیں تھیں۔ یوں بھی فرانسیسی بنیادی طور پر بیروں بیں قوم ہے اور انگریزوں کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ یہ 'جھینپو' ہوتے ہیں اور اپنے بودے پن کو چھپانے کے لیے دبے رہتے ہیں۔ اُن کی کم سخنی اور دیر آشنائی کا یہی راز ہے۔ فرانس میں رنگ ونسل کا امتیاز بھی کم ملا۔ میں نے یہاں بارہا کالوں کے بازوؤں پر حسین فرانسیسی دوشیزاؤں کو لٹکے دیکھا۔ اپنے ہاسٹل میں ایک گورے اور کالے کے درمیان برابر کی مکّا بازی دیکھی۔ رنگ روپ کے اعتبار سے میرا شمار درمیانی زمرے میں تھا لیکن بیشتر فرانسیسی مجھے اطالوی ہسپانوی یا ترک سمجھتے تھے۔ اس لیے رنگ ونسل کے تعصب سے مجھے کبھی دوچار نہیں ہونا پڑا۔ اور

اس لحاظ سے میں فرانسیسی سماج کے ہر طبقے میں اچھی طرح گھُل مل جاتا تھا۔ البتہ زبان کے روزمرے کی نزاکتوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی شرمندگی اٹھانا پڑتی تھی خاص طور پر جب لغزشِ زبان سے فرانسیسی میں "میں سونا چاہتا ہوں" کے بجائے "میں ساتھ سونا چاہتا ہوں" نکل جائے۔ ان کے لاطینی مزاج میں وہی گرم اختلاطی پائی جس کا اقبال نے اسپین میں مشاہدہ کیا تھا اور اپنی نظم مسجدِ قرطبہ میں ذکر کیا ہے۔

پیرس کو جس قدر انسان نے اپنی تخلیقی کاوشوں سے حسین بنایا ہے فطرت نے بھی بُخل سے کام نہیں لیا ہے۔ پیرس میں میرا پہلا سابقہ وہاں کی خزاں سے اکتوبر ۱۹۵۰ء میں پڑا تو کشمیر کی خزاں یاد آگئی:

سونا اُگل دیا ہے فرنگی خزاں نے آج
شرما دیا بہار کو زخمِ نہاں نے آج
بادِ سحر میں بڑھ گئیں کچھ سرد مہریاں
کیا بے رخی دکھائی ہے آبِ رواں نے آج
برگِ خزاں سے پوچھیے بخشا ہے کس نے رنگ
یہ تری حنا نے یا میرے خونِ جواں نے آج
مسعود اعتبارِ بہاراں بڑھا دیا
رنگینیٔ زوال و غمِ جاوداں نے آج

(پیرس ۱۹۵۱ء)

قیامِ یورپ کا اثر ہندوستانیوں پر مختلف انداز میں مرتب ہوتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی خودنوشت "یادوں کی دنیا" میں اس کا ذکر نہایت مثبت انداز میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"مجھے تولون میں جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ بڑے بڑے جنگی جہاز نہ تھے بلکہ نسوانی حُسن تھا۔ میں نے ایسا باغ و بہارِ حسن اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ ... رنگ گورا، آنکھیں اور بال سیاہ، قد بوٹا سا ... چال کا انداز، بقول داغ

ٹھہر گئے وہ جہاں سروِ باغ تھے گویا

اگر چلے تو نسیمِ بہار ہو کے چلے ؎

تو لون کے قہوہ خانے میں بیٹھ کر جب میں فطرت اور انسان کے حسن کا مشاہدہ کر رہا تھا تو معاً مجھے غالب کی گل والی غزل یاد آئی:

تیرے ہی جلوے کا ہے وہ دھوکا کہ آج تک

بے اختیار دوڑے ہے گُل در قفائے گُل ؎ ،،

خود میرے تاثرات بھی کچھ اسی قسم کے تھے، لندن میں نہیں بلکہ فرانس پہنچ کر۔ لندن میں تو میں مغربی تہذیب کا ناقد ہی رہا جیسا کہ میری نظم "انتظار" سے ظاہر ہے جو میں نے نومبر ۵۰ء میں لکھی تھی، جس کا تذکرہ اس سے قبل آچکا ہے۔

پیرس کے ایک سال کے قیام کے اندر وہ "حادثہ" پیش آیا جس نے میرا قبلہ مغرب سے موڑ کر مشرق کی طرف کر دیا۔ "انتظار" کے ٹھیک ایک سال بعد (نومبر ۵۱ء) پیرس میں میں نے نظم "مری زمین ہے بہتر کہ آسماں بہتر"، لکھی جو خود تشریحی حیثیت کی مالک ہے:

چلی گئی وہ امیدوں کے قافلے لے کر

مرے خیال کو دھندلا سا دے کر اک پیکر

یہ آسماں پہ گہر اور زمیں پہ پتھر

یہ سوچتا ہوا شاعر، یہ سوچتا منظر

کوئی بہار سے پوچھے، بہار میں کیا ہے

وہ کہہ گئی تھی کہ آئے گی پھر، نہ آئی مگر

دلوں میں چھوڑ کر انگڑائیاں ادھوری سی

کدھر گئی ہیں وہ بانہیں، وہ لب، وہ زلف کدھر!

ہوا یہ اُس کی محبت میں اجنبی احساس

کسی کی زلف بلا بن کے آئی اپنے سر

پتہ نہ تھا کہ حقیقت یہاں فسانہ ہے

خبر نہ تھی کہ محبت یہاں ہے راہ گذر

ہر آستاں سے پھرا لے اپنا کاسۂ چشم

مرا جنوں مجھے لاتا ہے پھر ترے در پر

قبول کر مجھے دے کر ستارۂ مژگاں

ترے گھر کے سوا سب گھر نجوم سحر

مہ و ستارہ ہیں میری زمیں سے دور بہت

کنارِ خاک میں ملتا نہیں انھیں محور

مہ و نجوم کا عالم مجھے عزیز کہ تو

مری زمین ہے بہتر کہ آسماں بہتر؟

قیام یورپ میں ہندوستانی طالب علموں کے لیے تنہائی کا احساس ایک مشترک تجربہ ہے جو وہاں کے "بتانِ خود آرا" کے ہجوم اور "بادہ ہائے ناب گوارا" کی لذّتوں کے باوجود کم نہیں ہوتا۔ میں اسے کچھ زیادہ ہی شدّت کے ساتھ محسوس کرتا تھا۔ میرے لیے یہ احساس لندن کی گھٹی فضا ہو کہ پیرس کا آزاد ماحول، ہر جگہ یکساں رہا۔ اسی لیے میری اس دور کی نظمیں اور غزلیں میری سب سے اچھی خود نوشت ہیں۔ نظموں کے نمونے دیکھ چلے۔ اب چند غزلوں کے اشعار سنیے۔

لندن ۱۹۵۱ کی ایک غزل:

مری غزل ترا صدقہ، مری نوا ترا غم

یہ موت حرف بنے اور توڑ دوں میں قلم

ترا خیال، تری یاد، میرا فن، مرا شوق

ہنر کا باقی رہے کوئی بھی نہ پیچ و خم

وہ انتظار کہ آنکھوں نے آہٹیں سن لیں

وہ دھڑکنیں ہیں کہ ہوتی نہیں کبھی مدّھم

ترى وفا کے تصور سے کانپ اٹھتا ہوں

مرے جنوں میں یہ انداز ہیں مگر کم کم

گلوں میں غنچوں میں، تاروں میں ڈھونڈتا ہی رہا

مگر وہ آنکھ جو ہر دم کسی کے غم میں نم!

جنوں نے بخیہ گری آج بھی نہیں سیکھی

تری مژہ کا تصور مگر رہا پیہم

ہجومِ لالہ و گل اور یہ بے شمار خطوط

ہزار نقش ملے پر نہ مل سکا آدم

کدھر ہے تو مرے مشرق، اے مرے مشرق!

عزیز جام سفالیں ترا، تری شبنم

انتظار، دوری، تنہائی، وفا اس دور کی شاعری کے کلیدی لفظ ہیں جو اس زمانے کی ذہنی کیفیت کی غمازی کرتے ہیں:

خیالِ دوریٔ جاناں سے آنکھ بھر آئی

خبر نہیں کہ محبت نے کیا قسم کھائی (لندن اکتوبر ۶۵۰)

آپ دامانِ صبا باندھتے ہیں

کس سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

کتنے پرکار ہیں خوبانِ فرنگ

دل کو زلفوں سے سوا باندھتے ہیں (لندن، مارچ ۶۵۱)

مغرب کی فضا میں 'پیمانِ وفا' کی تلاش عبث ہے اس لیے کہ ؎

نہ بام و در نہ فضائیں نہ آسماں ہم راز

مری نوا کو مگر اجنبی دیار ملا

خیالِ دامنِ اُلفت کہاں، کہاں مسعود
وہ نارسا ہی رہا اور شرمسار مِلا (پیرس ۱۹۵۱)

اس نارسائی کے باوجود میں مغربی تمدن کا ان معنوں میں نقاد نہیں رہا جن معنوں میں اقبال تھے۔ اقبال کی نظر اس تہذیب کی مادیت پر رہی ہے اسی لیے کہا ہے:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

لیکن اس قسم کا کوئی ردِّعمل میرے یہاں پیدا نہیں ہوا۔ غالباً اس کی وجہ ہو گی کہ میں فلسفیانہ سطح پر نہیں سوچتا تھا۔ اقبال کی تنقیدِ مغرب تمام تر اسی سطح کی ہے:

فرنگ میں کوئی دن اور بھی ٹھہر جاؤں
مرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ

بُرا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اسے
فرنگ دل کی خرابی، خرد کی معموری

میں جب یورپ گیا ہوں تو میری عمر $\frac{1}{2}$ ۳۱ سال کے قریب تھی۔ اقبال کے مذکورہ بالا اشعار (پہلے شعر کو چھوڑ کر) اُن کے دوسرے سفرِ یورپ کی یادگار ہیں جب ان کی عمر ۵۴ سال کی تھی۔ پہلے سفرِ یورپ کے وقت وہ البتہ ۲۹،۲۸ سال کے تھے۔ اُن کا بے جرم الفت، کی اس دور کی یہ داستان سُنیے:

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبالؔ تو
رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے، تنہا بھی ہے

حسنِ نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لیئے

پھر عجب یہ ہے کہ تیرا عشق بے پروا بھی ہے

ہے حسینوں میں وفا نا آشنا تیرا خطاب

اے تلون کیش تو مشہور بھی رسوا بھی ہے

مغرب کی جانب ہندوستانی ذہن کے ردعمل کی مختلف سطحیں تھیں۔ سیاسی، معاشرتی اور فلسفیانہ۔ سیاسی سطح پر میکرڈل میں انگریزوں کی جانب سے جو تلخی بھری ہوئی تھی وہ پیرس جا کر ختم ہو گئی۔ معاشرتی سطح پر ہیں نے لندن اور پیرس کو ایک سا پایا بجز اس کے کہ انگریز لئے دیئے رہتا۔ فرانسیسی زیادہ کھلے دل سے ملتا۔ فرانسیسی لڑکیوں کے یہاں انگریز لڑکیوں سے زیادہ گل افشانیٔ گفتار اور گرم اختلاطی پائی۔ دونوں جگہ جنسی آزادی اور رواداری، مشرق سے کہیں زیادہ دیکھی سوائے اس کے کہ فرانسیسی اپنا الٹا ہاتھ عورت کے بازو میں ڈال کر چلتا ہے تاکہ بوقت ضرورت کی حفاظت کے لیئے سیدھے ہاتھ سے تلوار کھینچ سکے اور انگریز اپنا دایاں ہاتھ عورت کے بازو میں ڈال کر چلتا ہے تاکہ بہ آسانی اسے نالے میں ڈھکیل سکے۔

یورپ میں ہندوستانی نوجوانوں کو سب سے زیادہ خیرہ کرنے والا وہاں کا حسنِ نسوانی ہے۔ خاص طور پر نسوانی حسن کے وہ ڈھلے ہوئے پیکر جو لاطینی ممالک (فرانس، اٹلی، اسپین وغیرہ) میں ملتے نظر آتے ہیں، ان کے لیئے بے حد جنسی کشش رکھتے ہیں۔ ان کے جسم کے کمبخت دلآویز خطوط، یقیناً مشرقی حسن کے پیکروں سے زیادہ حسین ہوتے ہیں۔ ان کو قیام، بھی زیادہ رہتا ہے "دیسی اور کھیسی" کی مثل ان پر صادق نہیں آتی۔ ان کی جانب منفی اور مثبت دو قسم کے ردعمل ہوتے ہیں لیکن دونوں سے ان کی یکتائی کا اثبات ملتا ہے۔ ایک ردعمل اقبال جیسوں کا ہے ؎

یہ حوریانِ فرنگی دل و نظر کا حجاب

بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پا بہ رکاب

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا

مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب

دوسرا ردعمل اقبال کے ناقد ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے یہاں ملتا ہے (یادوں کی دنیا) جنھوں نے تولون کے حسینوں کو دیکھ کر اقبال کے استاد داغ کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

ٹھہر گئے وہ جہاں سروِ باغ تھے گویا
اگر چلے تو نسیمِ بہار ہو کے چلے

میں نے ڈاکٹر یوسف حسین کی طرح حسن کے ان نمونوں کو تنقیدی سے زیادہ تحسینی انداز میں دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے مجموعی طور پر اقبال یورپی تمدن سے انصاف نہیں کر سکے ہیں۔

مغرب کے ناؤ نوش کے اس ماحول میں بھی میں 'لال پری' سے دور رہا۔ اس میں اس قدر مذہبی قدغن کا خیال نہ تھا جتنا کہ اپنی صحت اور خاندانی روایت کا۔ یہی صورت سگریٹ نوشی کے سلسلے میں رہی جس کا مجھے تا حال کوئی تجربہ نہیں۔ اس کے بارے میں تو میرا خیال ہے کہ اسلامی ممنوعات و مکروہات میں اسے بھی سکھ مُت سے لے کر شامل کر لینا چاہیے۔ اگر امتناعِ شراب اور تحفظِ زن عالمی تہذیب کو اسلامی تحفہ ہے تو امتناعِ تمباکو نوشی سکھ مُت کا۔

پیرس کے دورانِ قیام ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب اور بشیر حسین زیدی صاحب وہاں پہنچے۔ عابد صاحب کے قیام کا انتظام میں نے سِتے یونیورسیتیر کے قریب ایک ہوٹل میں کیا تھا۔ کھانے کے لئے وہ میرے یہاں آجاتے۔ ایک روز زیدی صاحب نے جو یونسکو میں شرکت کرنے ہندوستانی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے، مجھ سے کہا کسی دن ہمیں 'ورسائی' کا محل دکھا لائیے۔ چنانچہ عابد صاحب کے ہمراہ ہم لوگ وہاں پہنچے۔ کئی گھنٹے تک لوئی چہاردہم کے اس بے مثال محل کی سیر کی۔ لنچ نکل کر پاس کے ایک ریستوران میں کیا۔ چونکہ فرانسیسی سکہ 'فرانک' قیمت میں بہت ہلکا ہوتا ہے، اس لیے بل ہزاروں تک پہنچا۔ بیرا جب بل لایا تو میں نے چاہا اس میں شرکت کر لی جائے تاکہ کسی ایک پر سارا بوجھ نہ پڑ جائے۔ لیکن زیدی صاحب نے علی گڑھ کے سینئر کی روایت کے تحت ایسا نہیں ہونے دیا۔ ریستوران سے نکلتے وقت میں نے عابد صاحب سے اپنی قلبی بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "زیدی صاحب کا آج بہت خرچ ہو گیا" قلبِ مطمئنہ کے ساتھ اپنے مخصوص لکنت کے انداز میں بولے "مسعود صاحب! اِن کا تو خرچ ہوتا ہی رہتا ہے"۔
میں چپ تھا!

پیرس کے دورانِ قیام 'اِنسٹی ٹیوٹ دُ فونیٹیک' کی تجربہ گاہ میں میں نے اردو عروض کے سلسلے میں ایک انوکھا تجربہ کیا۔ میرا عرصے سے خیال تھا کہ تمام کلاسیکی عروضوں (عربی، سنسکرت، لاطینی)

کا جب موجودہ زبانوں پر اطلاق کیا جاتا ہے تو اُن کے جسم پر جامۂ حرف، مُسک جاتا ہے۔ اسی کو ہم مختلف زحافات سے پُر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اتفاق سے انسٹی ٹیوٹ میں میرے ایک ساتھی ایرانی اور دوسرے عرب تھے۔ میں نے اپنے نکتہ کو ثابت کرنے کے لیے ان کی خدمات حاصل کیں۔ اس کے بعد حافظ کی مشہور غزل جو بحر مضارع مثمن سالم میں ہے۔ اس کے دو مصرعے کے لیے اور غالب کا ایک اردو مصرعہ :

(۱) الا یا ایھا الساقی ادر کاسا و ناولہا (عربی)

(۲) کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا (فارسی)

(۳) ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے (اردو)

اس کے بعد تینوں نے اپنے اپنے مصرعے بآواز بلند پڑھے جنھیں ٹیپ کر لیا گیا۔ لطف یہ تھا کہ ہم سب ایک ہی بحر کو استعمال کر رہے تھے لیکن ہم میں سے ہر ایک دوسرے کو خارج از وزن قرار دے رہا تھا۔ ایرانی، عربی کے مصرعے کو بھی اپنے انداز میں پڑھ کر کہتا اس کو یوں نہیں یوں پڑھو۔ عرب کہتا تھا کہ تم عربی کا مصرع پڑھ ہی نہیں رہے ہو۔ جہاں تک غالبؔ کے مصرعے کا تعلق تھا دونوں بہ یک زبان اسے خارج از وزن بتاتے تھے۔ اس تجربے کے بعد یہ بات ثابت ہوئی کہ تینوں زبانوں کا عروض ایک ہوتے ہوئے تینوں زبانوں کا سُر لہجہ، (Intonation) مختلف ہے۔ یہ سُر لہجہ ایک ہی بحر پر اس طرح حاوی ہو جاتا ہے کہ اس کی صوتی نوعیت بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح عروض ایک پیمانہ ہے جس سے زبان کا سُر لہجہ بہہ نکلتا ہے۔ اس لیے ہر زبان کو اپنا عروض اُس زبان کے سُر لہجہ کے مطابق مرتب کرنا چاہیے۔

میرے اس تجربے کو انسٹی ٹیوٹ کے اساتذہ اور ریسرچ کے طلبہ نے بہت غور سے سنا اور اس کے بعد یہ تجویز ہوئی کہ اسی طرح لاطینی بنیاد عروض کو انگریزی، جرمن، فرانسیسی زبان کے سُر لہجہ (Intonation) کے حوالے سے دیکھا جائے۔ میرا خیال ہے اس انداز کے مطالعے سے ہم زحافات کے چکروں سے باہر نکل آئیں گے، اور ہر زبان کے سُر لہجہ پر اس کے عروض کی بنیاد قائم کر سکیں گے۔ اس کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ توضیحی لسانیات نے صوتیات کے بارے میں جو گہری بصیرت دی ہے اس سے کام لیا جائے۔ اردو عروض کی

نئی تشکیل کے وقت ہمیں ہندی چھند کے اصولوں کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا لیکن عظمت اللہ خاں کی طرح اس کی نقل کرنا ضروری نہیں بلکہ اس کے جائزے کے لیئے بھی ہمیں علم صوت کے جدید علم کا اطلاق کرنا ضروری ہے۔

پیرس میں میرے کچھ مہینے قدرے تنگ دستی میں گزرے۔ لندن سے وہاں منتقل ہونے میں میرا کافی خرچ ہو گیا تھا لیکن اس کے بعد یونسکو کے ایک ہندوستانی افسر مسٹر ڈھینگرا کی عنایت سے مجھے انگریزی سے اردو میں اخبارات کے لیئے خبروں کا ترجمہ کرنے کا کام ملنے لگا۔ یونسکو میں ترجمہ کا نرخ بالا تھا۔ اس لیئے میرے پاس اس قدر پیسے بچ جاتے تھے کہ میں ضرورت کی کچھ چیزیں خاص طور پر کتابیں خرید سکوں۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ لطیفہ پیش آیا۔ یونسکو میں ترجمے کا کام جب مجھے ملنے لگا تو ظاہر ہے کہ کسی پہلے مترجم کا نقصان ہوا ہوگا۔ انھوں نے پاکستانی سفارت خانے کے ذریعہ یہ اعتراض کرایا کہ جو اردو ترجمے اب اخبارات کیلیئے کیئے جا رہے ہیں انھیں پاکستانی اخبارات کو قبول کرنے میں تامل ہے، اس لیئے کہ ان کی زبان معیاری نہیں ہوتی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کسی ہندوستانی ہندی داں سے کرائے جا رہے ہیں۔ یونیسکو کے ڈپٹی ڈائریکٹر اس معاملے کو ڈھینگرا صاحب کے نوٹس میں لائے جنھوں نے میری سفارش کی تھی۔ ڈھینگرا صاحب نے لکھ بھیجا کہ ان ترجموں کا کرنے والا فلاں آدمی ہے جو مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر ہے۔ اُس کی اُردو پر حرف نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لیئے کہ علی گڑھ اردو کا مکّہ ہے۔

اس کے بعد پاکستانی سفارت خانے سے نہ کوئی جواب آیا اور نہ کوئی اعتراض۔ ڈپٹی ڈائریکٹر یونسکو نے مجھے چلتے وقت بڑا اچھا سارٹیفکٹ دیا اور اس بات کا اندیشہ ظاہر کیا کہ اب پھر ہمارے یہاں ہندوستان اور پاکستان کی اردو کا جھگڑا شروع ہو جائے گا۔

فروری ۵۳ء میں زبانی امتحان سے فارغ ہو کر وطن واپسی کے لیئے رخت سفر باندھا۔ دوستوں نے ہرچند کہا پیرس کی ایک بہار تک اور رک جاؤ۔ لیکن اب آنکھوں میں کوئی اور ہی بہار بسی ہوئی تھی۔ میں نے رودبار انگلستان کو اسٹیمر کے ذریعے پار کیا اور ساؤتھمٹن

ہ پہنچ کر اپنا بحری جہاز پکڑا، جس کا ریزرویشن بہت پہلے کرا چکا تھا۔ پھر وہی راستہ جبل الطارق، پورٹ سعید اور عدن؛ بالآخر دو ہفتے کے بعد بمبئی پہنچا۔ بمبئی سے سیدھا حیدر آباد کا رُخ کیا جہاں یوسف میاں اور خالہ صاحبہ میرے منتظر تھے۔ چند روز کے قیام کے بعد قائم گنج کے لیے روانہ ہو گیا۔ ہندوستان کی بھولی بسری تہذیب کا پہلا مظاہرہ اس وقت ہوا جب گاڑی آگرے سے قائم گنج کی جانب چلی۔ ہاتھرس پر شور سُنا "ہولی ہے ہولی ہے" اور اس کے ساتھ ریل کے ڈبّوں پر تازہ گوبر اور کیچڑ اور پتھّروں کی بارش شروع ہو گئی۔ ڈبے میں ہولی کی وجہ سے صرف چند مسافر تھے۔ جب پتھراؤ بڑھ گیا تو میں نے کھڑکیوں کے ٹوٹتے ہوئے شیشوں سے مامون رہنے کے لیے بیت الخلا میں پناہ لی۔ اسی عالم میں کاسگنج پہنچا، جہاں میرے ماموں زاد بھائی بدر عالم خاں اور ایک محلے دار حکیم سرور عالم خاں مجھے لینے آئے تھے۔ وہ تو میری طرف سے مایوس ہو چکے تھے کہ اچانک میں بیت الخلا سے برآمد ہوا۔ اُنھیں دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ حکیم صاحب نے ڈانٹ کر مجھ سے کہا کیا ہولی کے دن بھی سفر کیا جاتا ہے، میں نے کہا ہرگز نہیں، بھول گیا تھا۔ اس کے بعد سے یہ سبق آج تک یاد ہے، اس لیے کہ اکیسویں صدی کے بابِ داخلہ پر کھڑے ہونے کے باوجود ہماری سبھیتا کا رنگ ڈھنگ ابھی تک نہیں بدلا ہے۔

لیکن کچھ دیر بعد قائم گنج پہنچ کر سفر کی ساری کلفت دور ہو گئی۔ اسٹیشن پر استقبال کے لیے عزیزوں کا جمِ غفیر تھا۔ میرا بچّہ جاوید بھی کسی کی گود میں تھا۔ اب وہ تین سال کا ہو گیا تھا۔ رشتے کے چچا منظور احمد خاں کے ایما پر استقبالیہ کی تقریب ترتیب دی گئی تھی۔ سب سے پہلے اسٹیشن سے مجھے جلوس کی شکل میں ددھیال کے مکان لے جایا گیا، وہاں اُن کی جانب سے چائے پانی کا انتظام تھا۔ یہ بالکل اسی انداز میں کیا گیا تھا جیسا کہ ۲۷ برس پہلے ذاکر میاں کی جرمنی سے واپسی پر ہوا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر ننہال گیا۔ نانی صاحبہ منتظر تھیں؛ کوئی اور بھی انتظار کر رہا تھا۔ سب نے خوش آمدید کہا سوائے میرے بچّے جاوید کے جس نے ایک اجنبی کو اہمیت دیئے جانے پر اپنا ردِّ عمل ایک "فری ہینڈ اِسٹروک" کی شکل میں ظاہر کیا۔ نانی صاحبہ جھپٹ پڑیں۔ وہ تو سب نے ہائیں ہائیں کہا تو بچ گئے، ورنہ صاحب زادے پِٹ جاتے۔

ڈھائی سال کی طویل رخصت کے بعد اب پھر کام پر لوٹنا تھا۔ چنانچہ چند ہی روز

میں اکیلا علی گڑھ چلا گیا۔ اِس مرتبہ بڑی مشکل سے انجینرنگ کالج کوارٹر نمبر ۴ الاٹ ہوا جس میں ایک ٹی۔ بی کی مریضہ رہ چکی تھیں۔ اس لئے کچھ عرصہ اس کی قلعی وغیرہ کرانے میں لگا، اس کے بعد بیوی بچے کو لانے کے لیے پھر قائم گنج چلا گیا۔

ابھی ہم لوگ اپنے نئے گھر میں ٹھیک سے جمنے بھی نہیں پائے تھے کہ قائم گنج سے نانی صاحبہ کے انتقال کی خبر ملی۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ صرف میری ولایت سے واپسی کا انتظار کر رہی تھیں!

نواں باب

علی گڑھ (۳)

(۵۳ تا ۵۹ء)

علی گڑھ واپسی پر شعبۂ اردو میں ۱۹۵۴ء میں ریڈر بنادیا گیا۔ ریڈر بننے کے بعد میری تدریسی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ ایم۔ اے۔ کی کلاسوں کو تاریخ زبانِ اردو، دکنی اردو کا ادب، جدید شاعری اور اقبال کا درس دیتا۔ رفتہ رفتہ طالب علموں کے ذریعے میرے درس کی شہرت پھیلنے لگی۔ طلبہ اس بات کا فخریہ ذکر کرتے کہ ہم مسعود صاحب کے شاگرد رہے ہیں۔ اکثر اوقات میں اپنے شاگردوں کو پہچان بھی نہیں پاتا لیکن وہ اصرار کیے جاتے کہ ہم فلاں سنہ میں فلاں کلاس میں آپ کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ ایسی صورت میں میں نہایت انکسار کے ساتھ اُن کے دعوے کو تسلیم کرلیتا۔ دوسروں سے بھی اپنے شاگردوں کے بارے میں توصیفی کلمات سُن کر خوشی ہوتی۔ مجھے صرف ایک شاگرد نے مایوس کیا ہے جو اب دہلی کی ایک بڑی یونیورسٹی میں اردو کے درس کی خدمات انجام دے رہے ہیں، جب اس یونیورسٹی کے ایک سینئر استاد نے مجھ سے شکایت کی کہ مسعود صاحب! ہرچند فلاں صاحب کو اصرار ہے کہ وہ آپ کے شاگرد رہ چکے ہیں، لیکن ان کی استعداد اور حرکات دیکھ کر یقین نہیں آتا"۔ میں نے کہا وہ مستثنیات میں سے ہیں اور عرصہ ہوا میں اُن سے دست بردار ہوچکا ہوں"۔ کہنے لگے "مگر وہ تو آپ سے دست بردار نہیں ہوتے!"

میں فطرتاً الیکشن باز نہیں ہوں جیسا کہ پانچویں باب میں مذکور ہوچکا ہے، طالب علمی کے زمانے میں صرف مختار آزاد کا الیکشن مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کی سکریٹری شپ کے

لیے لڑا یا تھا جس میں وہ ہار گئے۔ اس کے بعد ۵۴ تا ۸۴ء اپنے لیے چار الیکشن لڑے جن میں سے علی گڑھ کے تینوں الیکشنوں میں کامیاب ہوا۔ چوتھا علی گڑھ سے باہر کا تھا، اس میں ناکام رہا۔ تفاوتِ زمانی کے باوجود تسلسل کی خاطر میں ان سب کا ذکر ایک جگہ کروں گا۔

یورپ سے واپسی پر میں نے پہلا الیکشن مسلم یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل کی انتخابی سیٹ کے لیے ۵۴ء میں لڑا۔ اس میں میرا مقابلہ اپنے معالج ڈاکٹر اسلام الحق انصاری سے تھا جو اس وقت طبیہ کالج میں اُستاد تھے۔ میں نے جب اپنے کھڑے کیے جانے پر اُن سے تاسف کا اظہار کیا تو اُن کا اصرار تھا کہ میں ہرگز اس سے دست بردار نہ ہوں۔ میرے خاص کارکن شعبۂ کیمیا کے ریڈر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی تھے۔ اس میں غیر متوقع طور پر مجھے کافی ووٹوں سے کامیابی حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اِن دنوں وائس چانسلر تھے۔ شام کو حسبِ معمول جب میں ان کی کوٹھی پر گیا تو انھوں نے تعجب کے لہجہ میں پوچھا، "حضرت! آپ کی کامیابی کیوں کر ہوئی"۔ چونکہ ڈاکٹر انصاری، ذاکر صاحب اور رشید صاحب دونوں کے معالج تھے، اس لیے شاید ان لوگوں کی ہمدردی ان کے ساتھ ہو۔ میں نے ذاکر صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "اس لیے کہ لوگوں سے میرے تعلقات Personal تھے اور ڈاکٹر انصاری صاحب کے Professional!" سن کر خاموش ہو گئے۔ لطف یہ کہ ڈاکٹر انصاری صاحب کے ہارنے کا مجھے بھی افسوس رہا!

دوسرا الیکشن ۱۹۷۰ء میں میں نے اسٹاف ایسوسی ایشن کی صدارت کے لیے لڑا۔ اس میں میرے خاص کارکن شعبۂ قانون کے رحمٰن علی خاں صاحب تھے اور مقابلہ شعبۂ جغرافیہ کے پروفیسر محمد شفیع سے تھا۔ رحمٰن علی خاں نے پروفیسر شفیع صاحب کے خاص کارکن پروفیسر قمر الحسن فاروقی (شعبۂ کامرس) سے مفاہمت کے لیے بات چیت کی لیکن انھیں اپنی کامیابی کا یقین تھا اس لیے دونوں طرف سے زوروں پر تیاری ہونے لگی۔ میں کبھی بھی الیکشن میں ووٹ مانگنے نہیں نکلتا ہوں۔ یہی صورت شفیع صاحب کی جانب سے رہی۔ نتیجہ نکلا اور میں سات ووٹوں سے جیت گیا! دوسرے دن ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب سے ملاقات ہوئی، جو اس وقت وائس چانسلر تھے، کہنے لگے شفیع صاحب تو آپ سے سینئر رہے ہوں گے۔ میں نے کہا میں اُن سے عمر میں سات سال بڑا ہوں، اسی لیے مجھے سات ووٹ زیادہ ملے علی گڑھ اپنے سینئر کا احترام کرتا ہے۔

میرے ساتھ سکریٹری کی جگہ کے لیے انجینرنگ کالج کے رشید الظفر صاحب کا انتخاب ہوا۔ یہاں سے ہماری اُس دوستی کا آغاز ہوا جو تا حال جاری ہے۔ وہ بڑی فعّال شخصیت کے مالک ہیں۔ اسی لیے بہت سے مخالف پیدا کر لیتے ہیں۔ خاص طور پر علی گڑھ کے مارکسسٹ حلقوں میں وہ ہمیشہ غیر مقبول رہے، اس لیے کہ وہ ان کا ترکی بہ ترکی جواب تھے۔ میرے دورانِ صدارت سب سے افسوس ناک واقعہ پروفیسر رئیس احمد سے متعلق پیش آیا جن کے کسی بیان پر جس کی زد مسلم یونیورسٹی کے مسلم کردار پر پڑتی تھی، سارا علی گڑھ ان کے خلاف شمشیر بکف ہو گیا۔ اسٹاف ایسوسی ایشن نے بھی ملامت کا ریزولیوشن پاس کیا۔ دائیں اور بائیں بازو کی صف آرائی مکمل تھی۔ اُن کی موافقت اور مخالفت میں دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ میں مسز شکتی رئیس کی مدافعانہ تقریر سے بہت متاثر ہوا۔ چاہا کہ کوئی بیچ کی راہ نکل آئے لیکن نہ ہو سکا۔ علی گڑھ میں آپ دائیں اور بائیں کے درمیان نہیں رہ سکتے۔ صورت یو۔پی کے اس انگریز گورنر کی سی ہوتی ہے جس نے قومی تحریک کے سلسلے میں کہا تھا "جو ہمارے ساتھ نہیں ہیں وہ ہمارے مخالف ہیں"۔

رشید الظفر صاحب کے ہوتے ہوئے تو نہیں لیکن ان کے بعد جب ایک سینیر کیبنٹ ترقی کر کے تھوڑے عرصے کے لیے سکریٹری بن گئے تو انھوں نے بنام سکریٹری صدر کے اختیارات سلب کرنا شروع کر دیئے۔ وہ صدر کو صرف صدارت کے فعلِ عبث کے لیے سمجھنے لگے حالاں کہ اسٹاف ایسوسی ایشن کے دستور سے یہ کہیں ثابت نہیں ہے اور یوں بھی سوائے کمیونسٹ ممالک کے سکریٹری ہمیشہ صدر کے تحت کام کرتا ہے۔ بہر حال میں نے اس تناؤ کو محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ میری دو سالہ مدت صدارت ۱۹۷۲ء میں ختم ہو گئی۔

تیسرا الکشن میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نو تنظیم شدہ کورٹ کے لیے ۱۹۸۳ء میں لڑا۔ کورٹ کے آئین کے مطابق دو رکن اردو کے حلقے سے منتخب ہوتے تھے۔ اس کے لیے میرے اور سرور صاحب کے علاوہ بیرونِ علی گڑھ کے کئی امیدوار تھے۔ علی گڑھ نے اپنے قدیم طالب علموں اور اساتذہ کو یاد رکھا اور ہم دونوں بآسانی منتخب ہو گئے۔ مجھے سب سے زیادہ ووٹ ملے۔ ہم دونوں کی مدتِ رکنیت ۸۵ء میں ختم ہو گئی۔ مجھے افسوس ہے کہ دوبارہ انتخاب کے وقت دھاندلی کی گئی یعنی انتخاب کرانے کے بجائے چانسلر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کے ایما سے ایک کمیٹی بنا دی

گئی جس نے اِس زمرہ اور دوسرے کئی زمروں میں من مانی کر کے جسے چاہا نامزد کرا دیا۔ اردو کے زمرے سے مالک رام صاحب اور خواجہ احمد فاروقی صاحب نامزد ہوئے جن کا علی گڑھ سے تعلق نہ بحیثیت طالب علم کبھی رہا ہے اور نہ بحیثیت استاد۔ میں نے ایک ملاقات میں اپنے پرانے ساتھی اخلاق صاحب کو جب اس کیلئے طعنہ دیا تو کہنے لگے مجھے اس سلسلے میں دھوکا ہوا۔ چونکہ یہ پوری کارروائی غیر قانونی تھی اس لیے چند صاحبان اس کے خلاف "اسٹے آرڈر" لے آئے ہیں۔

ایک انتخاب جو میں نے بڑے اعتماد سے لڑا لیکن ہار گیا ساہتیہ اکادمی کی اردو کنوینر شپ کی جگہ کے لیے تھا۔ اعتماد مجھے اس لیے تھا کہ میری تائید میں اکادمی کے صدر ڈاکٹر سُنیتی کمار چٹرجی اور اس کے سکریٹری شری پربھاکر ماچوے، دونوں تھے، اردو کے چاروں ممبروں نے میرا نام بالاتفاق رائے تجویز کیا یا تائید کی، جس میں قرۃ العین حیدر صاحبہ، مالک رام صاحب اور ڈاکٹر محمد حسن بھی تھے۔ انتخاب سے ایک دن پہلے مالک رام صاحب مجھ سے ضرور ملے تھے، یہ کہنے کے لیے کہ میں ان کے حق میں دست بردار ہو جاؤں لیکن جب میں نے یہ کہہ کر معذرت چاہی کہ میں ماچوے صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں تو انھوں نے بھی میرے نام کی تائید کی۔ میرے مقابلہ میں ڈرامہ نگار حبیب تنویر تھے جب نتیجہ نکلا تو وہ جیت گئے۔ مجھے بعد کو معلوم ہوا کہ دو روز قبل کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی دفتر میں ساہتیہ اکیڈیمی کے کمیونسٹ ممبروں اور ہم سفروں، کا ایک جلسہ ہوا تھا جس میں مختلف زبانوں کے کنوینروں کے نام طے کر کے "وہپ" جاری کر دیا گیا تھا۔ میں کبھی بھی کمیونسٹوں اور ترقی پسندوں کے حلقوں میں اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے پسندیدہ نہیں رہا ہوں۔ مختلف زمانوں میں علی گڑھ میں اور اس کے باہر بھی مجھ پر "کارفرمائی" کا عمل ضرور رہا ہے لیکن کانٹے کے وقت میں میں نے ہمیشہ خود کو تنہا پایا ہے۔ چونکہ ذاتی تعلقات میں میرے اندر مروّت بہت زیادہ ہے اس لیے بعض اوقات یہ لوگ دوست بن کر بالادستی حاصل کر لیتے ہیں لیکن نہ میں انھیں اپنے نقطۂ نظر سے معتبر سمجھتا ہوں اور نہ یہ لوگ اپنے کام کے لیے مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں سے بعض حضرات مثلاً ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو میں ذاتی حیثیت سے پسند کرتا ہوں۔ لیکن ان میں بڑی تعداد موقع پرستوں کی ہے جو ذاتی مفاد کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے ہیں اور جن کے نزدیک شرافت اور مروّت جیسی صفات بورژوا اخلاقی کمزوریاں ہیں۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ان تمام الکشنوں میں مجھے کاسۂ گدائی لے کر نہیں پھرنا پڑا۔ ہر بار چند مخلصین کو خیال آیا کر مجھے کھڑا کیا جائے۔ انھوں نے ہی میرے لیے دوڑ دھوپ کی اور کامیاب کرایا۔ زندگی میں یہی میرا رویہ مختلف عہدوں کی جانب رہا ہے۔ چاہے وہ جامعہ ملیہ کی وائس چانسلری ہو یا جامعہ اردو کی شیخ الجامعی، جس پر میں پچھلے پندرہ سال سے فائز ہوں۔ جب میں نے جامعہ اردو کے شیخ الجامعہ کے عہدے کے تیسرے انتخاب کے وقت یہ کہا کہ میں "کرسی سے چپکے رہنے کا عادی نہیں" تو اس پر امیر جامعہ ڈاکٹر رفیق زکریا نے فرمایا "یہ تو آپ اہلِ سیاست پر طنز کر رہے ہیں"۔ میں نے جواباً صرف یہ مصرعہ پڑھا ؏

اُن کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں

۱۹۵۵ء میں مجھے لسانیات کے ماہرین کی ایک کانفرنس میں پونا مدعو کیا گیا جس کی صدارت کرنے کے لیے انگلستان سے مشہور مستشرق پروفیسر رالف ٹرنر تشریف لائے تھے۔ مسئلہ پیش نظر یہ تھا کہ راک فیلر فاونڈیشن کے وسیع عطیے کو، جو دکن کالج پونا کو توضیحی لسانیات کو عام کرنے کے لیے دیا گیا تھا کس طرح مفید اور منظم طور پر استعمال کیا جائے۔ دعوت نامہ دکن کالج کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ایس۔ ایم کاترے کی جانب سے تھا۔ شرکا میں چوٹی کے ماہرینِ لسانیات۔ پروفیسر سُنیتی کمار چیٹرجی، ڈاکٹر بابو رام سکسینہ، ڈاکٹر دھیریندر ورما، ڈاکٹر سُکمار سین، پروفیسر سری کنٹھیا، پروفیسر سومیاجی اور ڈاکٹر پی۔ بی۔ پنڈت نے شرکت کی۔ اس کانفرنس نے لسانیات کے علم کو عام کرنے کے لیے مختصر مدتی سرما اور طویل مدتی گرما اسکولوں کا منصوبہ بنایا۔ ۱۹۵۵ء کے دسمبر سے ان کا آغاز ہو گیا۔ میں شروع سے اس کے اساتذہ کی فہرست میں رہا اور سال میں دو بار پڑھانے کے لیے پونا جاتا رہا۔ ایسے معروف اہلِ علم کی صحبت میں خود بھی سیکھتا رہا اور میری نظر میں ہندوستانی زبانوں کے بارے میں وسیع الخیالی پیدا ہوتی گئی۔ میرے ذہن میں موجود

ہندوستان میں اردو کا جو منصب اور مقام ہے وہ بھی واضح ہوتا گیا۔ ہر شخص اپنی مادری زبان کے بارے میں جذباتی رنگ میں سوچتا ہے، میں بھی اس سے خالی نہیں تھا خاص طور پر آزادی ملنے کے بعد ہندی ہوا۔ ہندوستانی عیسائیوں کی وہاں خاصی آبادی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں عیسائیت، ہندو مت

کی ریاستوں میں اس کے ساتھ جو دھاندلی ہوئی ہے اس سے دل برداشتہ رہتا تھا۔ میں نے اس مجمع میں اردو کا سب سے بڑا ہمدرد پروفیسر سُنیتی کمار چیٹرجی کو پایا۔ ممکن ہے ان کی یہ ہمدردی بتقاضِ معاویہ میں ہو اسی لیئے کہ اس سے قبل وہ ہندی ساہتیہ سمیلن اور دوسرے کئی ہندی اداروں سے انعام پاچکے تھے۔ ہندوستانی زبانوں کے ارتقا کے لیئے سنسکرت کی جو اہمیت ہے اس پر مسلسل زور دیتے رہتے تھے۔ لیکن بہر حال ایک بنگالی ہونے کے ناتے اردو کے حق میں کلمۂ خیر کہنے سے نہیں چوکتے تھے۔ وہ کئی لحاظ سے مجھے ایک دلچسپ انسان نظر آئے۔ جیّد عالم لیکن طبیعت میں بچوں کی سی سادگی۔ ابوالکلام (لغوی معنوں میں) تھے کہ مسلسل بولنے پر بھی نہیں تھکتے تھے۔ حافظہ بھی غضب کا پایا تھا۔ حاضرین و سامعین کے پیشِ نظر قرآن تک کی چند آیات پڑھ کر سُنا دیتے تھے اور سنسکرت کے اشلوک تو ان کی نوکِ زبان پر رہتے۔ اردو کے بارے میں کہتے تھے کہ بڑی شُستہ و رُفتہ زبان ہے اور اسی کی نسبت سے ہندی کو کھڑی اور کھُردری بتاتے۔ ان کی تجویز تھی کہ اگر اردو ہندی، سے جنس کی دخل اندازی نکال دی جائے تو اس زبان کا سیکھنا بہت آسان ہو جائے، جیسی کہ یہ کلکتے کے بازاروں میں بولی جاتی ہے۔ میں ہنس کر کہتا اس نکاحی شرط کے ساتھ تو اردو مُتعہ کے لیئے بھی نہیں ملے گی۔ اس کی تذکیر و تانیث ہی میں تو اس کا لطف ہے۔ قدیم اردو میں تو یہ اس قدر تھی کہ حروف، صفات اور افعال امدادی تک اس سے متاثر ہوتے تھے؛ اب تو ہم نے اسے خاصا سہل بنالیا ہے لیکن اور سہل بنا کر "وہ مرد گیا' وہ عورت گیا، ہمارا باپ گیا، ہمارا ماں گیا' شوب (سب) گیا" آپ لوگوں کی یہ مزید سہولت کے لیئے نہیں کہا جا سکتا۔ معدہ توی پایا تھا اس لیئے ۸۰ کے پیٹے میں بھی لذتِ کام و دہن کے دلدادہ تھے، اور اس کا ایک گُل ہند ذوق رکھتے تھے۔ وہ ہمارا شرٹ کا 'شری کھنڈ' اسی ذوق سے کھاتے جس لطف سے اپنا 'رَشُ گُلّا'۔ ہرچند ان کا توضیحی لسانیات کا علم مستحضر نہیں تھا لیکن وہ اپنی انسائی کلوپیڈیائی معلومات گراں ڈیل شخصیت کی وجہ سے لسانیات کے اسکولوں پر چھائے رہتے۔ میری درسیات نظری و عملی صوتیات تک محدود تھیں چونکہ یہ کورس ہر طالب علم کے لیئے لازمی تھا۔ اس لیئے مجھے مستقبل کے بیشتر اساتذۂ لسانیات کے استاد ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ پروفیسر اشوک کیلکر، پروفیسر جگدیو سنگھ، پروفیسر گل، ڈاکٹر عبدالغفار شکیل، پروفیسر عبدالعظیم ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ وغیرہ وغیرہ۔ عملی صوتیات کی مشقوں کیلیئے ہم کسی ایسی زبان کو منتخب کرتے

تھے جو ہمارے طالب علموں کے لیے بالکل نئی ہوتی کہ انھیں نئی نئی اصوات کے سننے اور ادا کرنے کی مشق ہو سکے اس زبان کے نمائندے کو دس روپیہ فی گھنٹہ معاوضہ دیا جاتا تھا۔ ایک بار طے پایا کہ کوئی عربی زبان بولنے والا گرفتار کیا جائے اس لیے کہ اس زبان میں ہندوستانی طالب علموں کے لیے وافر نیا صوتیاتی مواد ملتا ہے۔ چنانچہ کسی کے توسط سے پونا کے ایک یہودی کو تلاش کر لیا گیا، جو فلسطین میں عرصے تک مقیم رہنے کی وجہ سے عربی کی اچھی مہارت رکھتا تھا۔ ایسے الفاظ کی ایک فہرست تیار کی گئی جن میں عربی کی مخصوص آوازیں ق، غ، ع، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ اور ہمزہ پائے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کو اس سے ادا کرایا جاتا تھا اور طلبہ انھیں صوتیاتی رسم خط میں لکھتے اور ان کی ادائیگی کی نقل کرتے۔ اس عمل میں بعض اوقات آٹھ آٹھ دس دس بار اس نوگرفتار کو دہرانے کی زحمت دی جاتی۔ کچھ طلبہ تفننِ طبع کی خاطر بھی اس کو تھکانے کے جتن کرنے لگے۔ ایک روز جب اس کا گلا ان آوازوں کو ادا کرتے کرتے بیٹھ سا گیا تو دونوں ہاتھوں کو ہوا میں ہلا کر مجھ سے کہنے لگا "اس قدر محنت صرف دس روپے کے لیے۔ بس اب کل سے نہیں "۔ لاکھ سمجھایا کہ یہ علم کی خدمت ہے تجارت نہیں ہے، لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا اور آنا چھوڑ دیا۔

ہندوستانی ماہرینِ لسانیات کے علاوہ ان اسکولوں میں امریکہ سے بھی کچھ اساتذہ آتے تھے۔ ان میں سے بعض خاصے معروف تھے یا بعد کو ہوئے مثلاً پروفیسر فربنکس، پروفیسر گلیسن (جونیر)، ڈاکٹر جان گمپرز۔ ہندوستان میں جدید لسانیات کا آغاز دراصل انھیں اسکولوں سے ہوا جو پانچ سال تک راک فیلر فاؤنڈیشن کی مالی امداد سے دکن کالج پونا میں منعقد کیے جاتے رہے۔ اس کے بعد لنگوئسٹک سوسائٹی آف انڈیا نے ان کی ذمہ داری لے لی۔ مالی دقتوں کی وجہ سے پہلے سرما کے اسکول بند ہوئے اور رفتہ رفتہ گرما کے اسکولوں کے انعقاد کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ تاہم اگلے پانچ سالوں میں ہندوستان کے دوسرے شہروں، دہرہ دون، حیدرآباد، اناملائی اور ٹریویندرم میں یہ اسکول منعقد ہوئے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ میں نے آخر بار ۱۹۶۴ء میں ٹریویندرم کے اسکول میں شرکت کی تھی۔ میرے دوست پروفیسر وی۔ آئی۔ سبرامنیم اس کے ڈائرکٹر تھے۔ دور دکن کا یہ میرا پہلا سفر تھا۔ اس لیے وہاں کے مناظر (جس میں ناریل کا درخت خاص اہمیت رکھتا ہے) اور تہذیبی مظاہر سے خوب لطف اندوز ہوا۔ ہندوستانی عیسائیوں کی وہاں خاصی آبادی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں عیسائیت ہندو

سے ہم آہنگ ہوگئی ہے اور حضرت عیسیٰ بھی من جملہ دیگر دیوتاؤں کے ایک دیوتا بن گئے ہیں تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب ہندوستان کے کسی بھی دوسرے علاقہ سے زیادہ ہے۔ ملیالم کے رسائل اور اخبارات کثیر تعداد میں شایع ہوتے ہیں اور پڑھے جاتے ہیں۔ عورت زندگی کے کاروبار میں برابر کی حصہ دار ہے اس لیے بھی کہ وراثت کا سلسلہ اس کی جانب سے چلتا ہے۔ کوئی کھانا ناریل، کاجو اور انناس کے بغیر مکمل نہیں خیال کیا جاتا۔

ہمارا سمر اسکول اپنے آخری مراحل میں تھا کہ اچانک پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال کی خبر ملی۔ اس کے ساتھ اسکول برخاست کر دیا گیا اور وہ تمام پروگرام بھی جو اختتامی جلسے اور منسٹر انچیف صاحب کی ضیافت سے متعلق تھے۔ لسانیات کو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں رائج کرنے کا طریقۂ کار یہ تجویز ہوا کہ پہلے زبانوں کے شعبہ جات میں لسانیات کے دو پرچے شامل کئے جائیں اور طالب علم کی سند پر اس تخصیص کا اظہار کیا جائے۔ اس کے بعد یو۔ جی۔ سی۔ کی تائید سے لسانیات کے علاحدہ شعبے قائم کیے جائیں۔ چنانچہ میرے یورپ سے واپس آنے کے بعد مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایسا ہی کیا گیا۔ مجھے توقع تھی کہ چند سالوں میں اس شعبے کے اندر لسانیات کی پروفیسری نکل آئے گی۔ یہ پہلا قدم ہوگا علاحدہ لسانیات کا شعبہ قائم کرنے کی جانب، لیکن بعض لوگوں کی کم توجہی کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ رشید صاحب ۱۹۵۸ء میں شعبۂ اردو کی صدارت سے ریٹائرڈ ہو گئے۔ اب کرنل بشیر حسین زیدی وائس چانسلر تھے اور پروفیسر آل احمد سرور، صدر شعبۂ اردو۔ انھیں ۱۹۵۵ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین لکھنؤ سے غالب پروفیسری پر لائے تھے۔ جو ان کے علی گڑھ کے پرانے ساتھی، عطاء اللہ صاحب کے، جو امریکہ میں مرمروں کے بادشاہ بن گئے تھے، گراں قدر عطیے سے غالب کے اردو کلام کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی غرض سے قائم کی گئی تھی۔

اس زمانے میں میں نے ایک کام اور کر ڈالا۔ یورپ سے ۱۹۵۳ء میں واپس آنے کے بعد ہی میں نے ایم۔ ایم۔ ہال کے سامنے دو بیگہ (پختہ) زمین کا ایک قطعہ اپنے دوست ڈاکٹر خورشید فارق سے خرید لیا۔ اس زمانے میں دودھ پور کی زمینیں گزوں سے نہیں بیگھوں کے حساب سے سستے داموں مل جاتی تھیں۔ پاکستان بن چکا تھا۔ علی گڑھ سے ہجرت کا سلسلہ اب تک جاری تھا

اس لیے صحرائی وسکنی جائیداد کی قیمتیں بہت گر گئی تھیں۔ ۲۳ر اپریل ۵۶ء کو میں نے تھوڑے سے سرمائے کی فراہمی کے بعد خدا کا نام لے کر اس قطعہ پر اپنے مکان کی داغ بیل ڈال دی۔ قائم گنج سے دو معمار اور چند مزدور بلوانے تاکہ تعمیر کے مقام پر شب و روز رہ سکیں تعمیر کے سلسلے میں میرے مشیر کار خلیل مراد صاحب لکچرر شعبۂ فزکس تھے جنھیں تعمیر کا وسیع تجربہ تھا اور جو خدائی خدمت گار کے جذبے سے ہر نئی تعمیر کے قریب از خود پہنچ جاتے تھے۔ وہ پروفیسر عمر الدّین کے خُسر تھے اور مجھ پر بہت مہربان۔ اپنی عمر کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ میرے ساتھ تعمیر کے مقام پر دھوپ میں کھڑے رہتے۔ تعمیر کے سلسلے میں ان کا نظریہ 'کفایت' کا تھا جسے وہ ہر قیمت پر ترجیح دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس سلسلے میں میرے بڑے راج، محمد حسین سے ان کا اختلاف ہونے لگا۔ میں بھی، باوجود سرمایے کی قلت کے، گھٹیا اور سستے کام پر راضی نہیں تھا۔ بالآخر میرے (ان کی دانست میں) بے جا مصرف کو دیکھ کر انھوں نے یک لخت آنا بند کر دیا۔ اور اس طرح اُن کے مفت کے مشورے سے مَیں محروم ہو گیا۔

ایک شام جب ذاکر میاں سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے شکایت کی "سُنا ہے آپ نے مکان بنوانا شروع کر دیا ہے اور ہمیں خبر تک نہیں کی۔ یہ بھی سُنا ہے کہ اس سلسلے میں آپ کے مشیر خلیل مراد صاحب ہیں۔ یہ وہ حضرت ہیں کہ جس نئی تعمیر کے پاس سے گزر جائیں تو اس کا ستیاناس کر دیں۔" میں اُن سے یہ تو نہیں کہہ سکا لیکن دل میں ضرور کہا کہ "آپ سے تعمیر کی بات اس لیے پوشیدہ رکھی کہ آپ جس تعمیر میں دلچسپی لیں تو اسے تاج محل بنا دیں"! اس مکان کی تعمیر میں مجھ جیسے قلمی انسان کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے، یہ ان کی تفصیل کا موقع نہیں۔ سیمنٹ پر کنٹرول تھا اس کا پرمٹ بیک وقت دس دس بیس بیس بوریوں سے زیادہ کا نہیں ملتا تھا، لیکن کھلے چور بازار میں دو روپے زیادہ دے کر آپ جس قدر چاہیں لے سکتے تھے، البتہ جب اشد ضرورت کے وقت اس قسم کی خریداری کر لی جاتی تھی تو دھڑکا لگا رہتا تھا۔ میں نے اس دھندے میں اپنی بیوی کو زیادہ جیالی پایا۔ ان کی دلچسپی اس لیے بھی زیادہ ہو گئی تھی کہ ان کے نام سے میں نے سرکاری کوآپریٹو سے سات ہزار کی رقم قرض لی تھی جس کے لیے زمین کا بیع نامہ ان کے نام کرانا پڑا تھا۔ چنانچہ مکان بن جانے کے بعد وہی اس کی قانونی مالکہ قرار پائیں، خود کو لٹا کر گھر بنانے کی پاداش میں اب تک ان کی یہ دھمکی سنا پڑتی ہے "یہ گھر میرا ہے جس کو جب چاہوں نکال دوں"!

گھر کی تعمیر کے دوران میں، چھ مہینے تک مطلق جاہل ہو گیا تھا۔ گرما کی تعطیلات کے ساتھ میں نے اپنی جمع شدہ چھٹی ملا لی تھی۔ سارا وقت، اینٹوں کے بھٹّوں بالو جیوں کے بازار کے چکر لگانے یا راشن آفس میں انتظار کی گھڑیاں کاٹنے میں گزرتا۔ گرمی کا موسم تھا اس لیے میں ہیٹ کا استعمال کرتا تھا جس سے میرے ماتھے پر ابلقِ ایام، کی سی کالی اور سفید دھاریاں پڑ گئی تھیں۔ ڈاکٹر عبد العلیم نے ایک بار بایں صورت، سائیکل دوڑاتے دیکھا تو مسکرائے اور کہا یہ کیا حال بنا لیا ہے۔ میں نے اس پر انھیں اپنا یہ تازہ شعر سُنا دیا۔

اک مکاں عالمِ امکاں سے وہ لائے ہیں بہ ضد

ہو گئے حضرتِ مسعودؔ بھی تعمیر پسند

بہرحال چھ مہینے کی دوڑ دھوپ کے بعد مکان کا اس قدر حصہ مکمل ہو گیا کہ ہم لوگ ۲ر اکتوبر ۵۶ء کو انجینیرنگ کوارٹر کو خیرباد کہہ کر اس میں منتقل ہو سکیں۔

اس مکان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ منتِ انجینیر یا اور سیر اٹھائے بغیر میری نگرانی میں تعمیر ہوا تھا میں ہی اس کا آرکیٹکٹ تھا، میں ہی انجینیر اور میں ہی اوور سیر۔ میں نے چنڈی گڑھ کے خالق، مشہور فرانسیسی آرکیٹکٹ Le Corbusier کا یہ جملہ کہیں پڑھا تھا کہ "اگر کوئی مکان استعمال کے نقطۂ نظر سے قابلِ اطمینان ہو تو وہ خود اپنا طرزِ تعمیر تخلیق کر لیتا ہے۔" آج میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ مکان میری اور دیگر خاندان والوں کی ضروریات کو بوجہ احسن پورا کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا ایک اپنا طرزِ تعمیر بھی ہے جو نایاب ہے! کیوں نہ ہو ایک اناڑی سے سرزد ہوا ہے۔

اس کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ میں نے اپنی رہائش اور کتب خانے کے لیے دو کمرے اوپر کی منزل میں اس انداز کے بنائے ہیں کہ وہاں پہنچ کر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہوں۔ میرے لائبریری کے کمرے کی دیواروں میں کتابوں کے شیلف بنے ہوئے ہیں۔ درمیان میں بڑی سی کھڑکی کے سامنے میری میز ہے جہاں سے میں دور تک اس میدان کا نظارہ کرتا تھا جو علامہ اقبال ہال بننے سے قبل یونیورسٹی کے قبرستان تک پھیلا ہوا تھا۔ مکان دو بیگھہ زمین کے عین وسط میں ہے اس لیے مداخلتِ ہمسایہ سے محفوظ ہے اور اب کھلی زمین میں یوکلپٹس اور اشوک کے اونچے اونچے درخت ہو گئے ہیں، جن کی وجہ سے ایک کاٹیج کا سا سماں پیدا ہو گیا ہے۔ ہو کا یہ عالم رہتا ہے کہ پڑوس کے ہاسٹل کے طلبہ

میں اس کا نام Haunted House پڑ گیا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی وائس چانسلری (۴۸ء تا ۵۶ء) کا دور علی گڑھ کے لیے نہایت پُرآشوب زمانہ تھا۔ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد نے مردم شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے اس بدنصیب ادارے کو بلاخیز سیاسی تلاطم سے بچانے کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین کا انتخاب کیا تھا۔ علی گڑھ نے انھیں تحفظاتِ ذہنی کے ساتھ قبول کیا۔ اس لیے کہ اس ادارے کو اس کا ماضی ہر لحظہ آئینہ دکھاتا تھا۔ مولانا آزاد کے پیشِ نظر ہندوستانی مسلمانوں کی بازآبادکاری کا اہم مسئلہ تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اُن کی نظر میں ہر لحاظ سے اس کے لیے مستند بھی تھے اور معتبر بھی۔ علی گڑھ زخم خوردہ اور سہما ہوا ضرور تھا لیکن اسے اپنے کیے پر پچھتاوا نہیں تھا۔ نجی ملاقاتوں اور مجلسوں میں سکتہ کا عالم ہوتا یا سکوت کا۔

اس سکتہ اور سکوت کے عالم کو ختم کرنے کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین معمور کیے گئے تھے۔ وہ دل میں بڑے بڑے حوصلے لے کر آئے تھے لیکن آتے ہی ۴۹ء میں ان پر قلب کا دورا پڑا جس نے ماہیئتِ قلب کر دی۔ اب علی گڑھ کو حیاتِ نو بخشنے کے پروگرام کے ساتھ خود کو زندہ رکھنے کا عمل شامل ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ ان کے عزائم کی کمزوری اور شخصیت کی تبدیلی میں اُن کی اس بیماری کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ اب نرسوں، ڈاکٹروں اور شام کے بیٹھنے والے چند مقربین میں گھر کر رہ گئے۔ ان میں رشید احمد صدیقی صاحب، ڈاکٹر حفیظ الرحمن (میڈیکل آفیسر)، سید نوراللہ صاحب (پرو وائس چانسلر) حکیم عبداللطیف صاحب (پرنسپل طبیہ کالج) اور ڈاکٹر عبدالعلیم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بیماری کے باوجود ان کا ظرافت کا حس قائم رہا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کبھی کبھی آتے لیکن بہت طویل نشست کرتے۔ مطلب کی بات اس نشست کے سب سے آخر میں کہتے۔ ان کی اس طویل نشستی کے بارے میں ایک دن کہنے لگے "بھئی یہ بہت بھاری پیندے کے آدمی ہیں"۔ حسِ مزاح کے ساتھ ساتھ ان کا تنقیدی شعور بھی بیدار رہا۔ ایک دن کہنے لگے کہ "توفیقِ الٰہی نہ ہو تو دنیا کی ساری سہولتیں مہیا ہو جانے پر انسان کام نہیں کرتا"۔ یہ اشارہ تھا شعبۂ تاریخ کے صدر کے اس اصرار کی جانب کہ اُن کے شعبہ کی کارکردگی کو بڑھانے کے لیے ان کے لیے Telcom ضروری ہے۔ مجھے تعجب اس وقت ہوا جب انھوں نے گاندھی جی کے بارے میں ایک دفعہ

یہ رائے دی کہ انھیں سیاست سے پہلے علاحدہ ہوجانا چاہیے تھا اور دھچکا اس وقت لگا جب اقبال کے تذکرہ پر اچانک بولے "بھئی! وہ پنجابی تھے"۔ سوچتا رہ گیا کہ یہ مولانا محمد علی کی زبان تو نہیں ہے جو 'اسرارِ خودی' کے اقبال کے پرستار رہے، اور اس کے بعد انھیں (غالباً سیاسی اختلافات کی بناء پر) 'اقبال مرحوم' کہنے لگے تھے۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ مولانا محمد علی ہی کی تحریک پر گاندھی جی نے اقبال کو ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ کی پرنسپلی کی پیش کش کی تھی، جسے انھوں نے ذاتی مجبوریوں کا بہانہ بنا کر قبول کرنے سے معذرت کرلی تھی۔ میں اس سے بھی واقف تھا کہ ۱۹۲۶ء میں پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوجانے کے بعد اقبال نے زمیندار جماعت کی حمایت کی تھی۔ اس تمام معلومات کے باوجود ذاکر صاحب کا اقبال کی 'پنجابیت' کے تذکرہ کا پس منظر میری سمجھ میں نہیں آیا۔

ذاکر صاحب اور رشید صاحب دونوں ایک دوسرے کی دوستی کا دم بھرتے تھے۔ رشید صاحب کے لیے ذاکر صاحب 'مرشد' تھے۔ 'مضامینِ رشید' میں اس نسبت کا اعلان ملتا ہے۔ ذاکر صاحب جب بھی علی گڑھ آتے رشید صاحب کے یہاں قیام کرتے۔ لیکن ذاکر صاحب کو رشید صاحب کی شعبۂ اردو سے متعلق ناکردگی سے شکایت رہی۔ اسی لیے وہ ۱۹۵۵ء میں لکھنؤ سے آل احمد سرور صاحب کو اپنے امریکی دوست عطاء اللہ صاحب کی قائم کردہ غالب چیئر پر لے آئے اور ان سے یہ وعدہ لیا کہ وہ خود کو صرف علمی کاموں میں مصروف رکھیں گے اور یونیورسٹی کی انتظامیہ سے بالکل الگ رہیں گے۔ لیکن ۵۶ء میں کرنل بشیر حسین زیدی کے وائس چانسلر بنتے ہی انھوں نے ایک ہال کی پرووسٹی قبول کرلی۔ یونیورسٹی کی سیاست اور دوسری مصروفیات کی بنا پر وہ تفویض کردہ غالب کے اردو دیوان کا ترجمہ بھی نہیں کرسکے جس کی وجہ سے ذاکر صاحب آخر وقت تک ان سے شاکی رہے اور عطاء اللہ صاحب نے تو نازیبا کلمات استعمال کرتے ہوئے قانونی کارروائی کی دھمکی تک دی۔ دراصل پتّہ مار کام سرور صاحب کے بس کا کبھی نہیں رہا۔ ایک ذہین انسان ہونے کے ناتے وہ طلاقتِ لسانی اور تنقیدی اشارات و متفرقات کے مردِ میدان ہیں۔ چونکہ ان کا مطالعہ وسیع ہے اس لیے وہ ہر موضوع پر تیزی کے ساتھ کچھ نہ کچھ لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اُن کے ذہن میں عرصے سے اقبال پر تصنیف کا ایک خاکہ ہے جس کی تکمیل وہ کشمیر کے دس سالہ قیام میں بھی جب اقبال ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا، نہ کرسکے۔

ذاکر صاحب نے اپنی علالت کے باوجود علی گڑھ کو سیاسی ورطۂ بلا سے بچانے میں نمایاں کام کیا۔ اُن کی براہِ راست رسائی پنڈت نہرو اور مولانا آزاد تک تھی۔ اِسی لیے اُتر پردیش کے کسی عامل یا وزیر کو علی گڑھ پر ہاتھ ڈالنے کی جُراُت نہیں ہوتی تھی۔ ان کی شخصیت کا اسلامی پہلو نمایاں تھا۔ وہ علی گڑھ کے ممتاز اولڈ بوائے رہ چکے تھے، اِس لیے علی گڑھ کا وہ حلقہ جو "اسلامسٹ" کہلاتا تھا، ان کے خلاف کوئی فتویٰ نہیں دے سکا۔ انھیں کے ایما پر ڈاکٹر عبدالعلیم اور ڈاکٹر نورالحسن لکھنؤ سے علی گڑھ آئے۔ علی گڑھ کے جانے پہچانے کمیونسٹ محمود حسین صاحب کو فعال جان کر رجسٹراری کے عہدے پر فائز کیا۔ یہ لوگ بھی ذاکر صاحب کے ممنونِ احسان رہتے۔ لیکن یہ توازنِ طاقت بہت دنوں تک نہیں چل سکا۔ جب چند سال کے بعد ذاکر صاحب ڈاکٹر گل کو ممتاز سائنس داں سمجھ کر امریکہ سے یونیورسٹی کے شعبۂ فزکس میں پروفیسر کی حیثیت سے لائے اور ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، تو دہیں سے بائیں بازو والوں سے وجہ افتراق شروع ہوئی۔ ڈاکٹر گل کی علمی لیاقت کے بارے میں میرے لئے کچھ کہنا ذرا دشوار ہے اس لیے کہ جتنے منہ اتنی باتیں، لیکن اس کی شہادت دے سکتا ہوں کہ وہ ایک مضبوط انسان تھے جنھیں ذاکر صاحب سے بڑی عقیدت تھی۔ ۱۹۶۹ء میں جب ذاکر صاحب کی میت راشٹرپتی بھون کے بڑے گنبد کے نیچے آخری رونمائی کے لیے رکھی ہوئی تھی تو من جملہ اعزّہ کے جس شخص کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے وہ ڈاکٹر گل تھے۔ اُن کا اب علی گڑھ یا ذاکر صاحب سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔

رفتہ رفتہ بائیں بازو کے حضرات نے ذاکر صاحب کی علالت سے فائدہ اٹھا کر خود کو مجتمع کرنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کی جامعہ کے پرانے رشتے سے ذاکر صاحب تک شام کی نشستوں میں رسائی تھی۔ ذاکر صاحب ان کے تساہل اور علمی ناکردگی سے آزردہ رہتے لیکن انھیں عام معاملات میں صائب الرائے سمجھتے تھے۔ اُن میں یہ خصوصیت بھی تھی کہ کمیونسٹ آئیڈیالوجی سے گہرا شغف رکھنے کے باوجود، کچھ باعتبار خاندانی روایات اور ابتدائی تعلیم اور کچھ باعتبار پیشہ (وہ ادارۂ اسلامیات کے سربراہ تھے) اس قبیل کے چھٹ بھیئوں کے مقابلے میں زیادہ وسیع الخیالی اور شرافتِ نفس کے مالک تھے۔ ذاکر صاحب پر اثر انداز ہونے کا ان کا طریقہ نہایت دقیق اور نفسیاتی ہوتا۔ ذاکر صاحب ان کی رائے سے ایک زمانے میں اس قدر متاثر تھے کہ اپنے دوست رشید صاحب کے

برمحل جذباتی عمل کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔ رشید صاحب اکثر اس کی شکایت بھی کرتے۔ رجسٹرار کے دفتر پر محمود حسین صاحب کی حکمرانی تھی جو مستعد اور کارگزار آدمی تھے اور انگریزی کے استاد ہونے کی حیثیت سے انھیں اس کی تحریر و تقریر پر پورا عبور تھا۔ انگریزی وہ بولتے نہیں تھے بلکہ اس کی قرأت کرتے تھے، جس کی وجہ سے طلبہ میں ان کا نام 'قاری محمود' پڑ گیا تھا۔ بہت جلد ذاکر صاحب کو اس حلقے کی بڑھتی ہوئی مضبوط گرفت کا احساس ہونے لگا اور جب یہ لوگ پروفیسر گل کے خلاف اکیڈمک کونسل کے مجھ جیسے منتخب شدہ ممبران تک کو حرکت میں لے آئے تو انھوں نے خطرے کا مکمل طور پر احساس کر لیا۔

کمیونسٹ سیاست کا، چاہے وہ کسی ملک کی ہو یا یونیورسٹی کی کسی بھی تحریک کو منظم کرنے کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے، یعنی فیصلے ایک چھوٹی سی منظم جماعت کرتی ہے۔ اس کے بعد ذاتی روابط اور پروپیگنڈے کے ذریعے ایک وسیع حلقے کی ہمدردی حاصل کی جاتی ہے۔ غیر منظم اشخاص ان کی سیاسی چالبازی کا بہت جلد شکار ہو جاتے ہیں اور کبھی انسان دوستی کے نام پر، کبھی جمہوریت کے جھنڈے تلے (حالانکہ اصل جمہوریت سے ان کا کوئی رابطہ نہیں) کوئی بھی نوجوان 'ترقی پسند' ہونے کو کیوں کر رد کر سکتا ہے۔ یہ تو ایک بے ضرر ترکیب ہے جس سے کم از کم انسان کا نفس تو موٹا ہو جاتا ہے۔ غیر ترقی پسند یا رجعت پسند کہلانا کون پسند کرے گا۔ حالاں کہ از روئے قواعد 'ترقی پسند ادب' کی ترکیب سرتاسر غلط ہے اس لیے کہ ترقی پسند ادیب ہو سکتا ہے ادب نہیں۔ لیکن چلتی کا نام گاڑی ہے۔

علی گڑھ کے قیام میں، مَیں بھی اس دور سے گزرا ہوں۔ میری خوش قسمتی کہیے یا بد قسمتی 'اسلامیوں' اور 'کمیونسٹوں' دونوں نے مجھے مستقبل کا 'ہم سفر' سمجھ کر مجھ پر کام کیا ہے۔ ایک زمانے میں منٹو سرکل کے مشہور استاد سید محمد ٹونکی صاحب (جو ان معنوں میں مجموعۂ اضداد تھے کہ نماز بھی پڑھتے تھے اور پکّے کمیونسٹ بھی تھے) مجھے اپنی گوں کا سمجھ کر کمیونسٹ پارٹی کا ہفتہ وار میرے پاس بیچنے کے لیے اپنے ہاسٹل آتے۔ میں نے چند ہفتے اسے خریدا لیکن اس میں سوائے پارٹی کے پروپیگنڈے کے مجھے کچھ نہیں ملا۔ ایک بار جب وہ اس کے چند پرچے لیے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئے تو میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "ٹونکی صاحب آپ کی مروّت

میں اسے خرید لیتا ہوں لیکن مجھے اس میں کچھ ملتا ہے نہیں"۔ ایک جھٹکے کے ساتھ پرچہ میرے ہاتھ سے لیا اور یہ جا وہ جا۔ اس کے بعد کبھی نہیں لوٹے، میں نے بے اختیاری میں ایک بات کہی تھی، لیکن آخر میں سبک سار رہا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ذاکر صاحب نے اپنی وائس چانسلری کے آخری دور میں اس حلقے کی گرفت کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے قبل وہ اکثر مجھ سے کہتے تھے کہ زندگی کا کھیل ایک قسم کی پتنگ بازی ہے۔ پتنگ کا پیچ ڈھیل سے بھی لڑایا جاتا ہے اور کھینچ کر بھی۔ میں ڈھیل کا پیچ لڑنے والوں میں ہوں۔ اس کے بعد کہتے اللہ میاں کی رسّی بھی ڈھیلی بتائی جاتی ہے۔ میں نے ایک بار کہہ دیا کہ زیادہ ڈھیلی رسّی دیجئے تو جانور رسّی سمیت بھاگ جاتا ہے۔ یہ سن کر بامعنی انداز میں خاموش ہو گئے۔

۵۶ء آتے آتے ان کا ذہن علی گڑھ کو چھوڑ دینے کا بن چکا تھا، حالاں کہ ابھی اُن کی وائس چانسلری کی کچھ مدّت باقی تھی۔ اس کی جانب انھوں نے سب سے پہلے اشارہ رشید صاحب سے کیا۔ رشید صاحب یہ سن کر بڑے سراسیمہ تھے۔ ہفتوں شام کی نشستوں میں تنہائی پا کر انھوں نے 'مرشد' سے اپنا ارادہ بدلنے کو کہا۔ ادھر علی گڑھ میں زبردست فرقہ وارانہ فساد ہو گیا جس سے بددلی اور بڑھ گئی۔ ایک شام میں وائس چانسلر کی کوٹھی کے دروازے میں داخل ہوا تو رشید صاحب اندر سے تیزی کے ساتھ لپکتے ہوئے باہر نکلے۔ مجھے دیکھ کر ذرا توقف کیا پھر کہا "مسعود صاحب! آج میں نے ذاکر صاحب سے کہہ دیا ہے کہ آپ یونیورسٹی کو رِفت رلیف کے ہاتھوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔"

'مرشد' چلے گئے تو 'مرید' کا ایمان متزلزل ہو گیا۔ پہلی بار رشید صاحب کے قلم سے ان کے خلاف تحریر نکلی یہ "ذاکر حسین حیات اور شخصیت" کے مختصر پیش لفظ کی شکل میں جب وہ کچھ روز تک دہلی اور جرمنی میں قیام کرنے کے بعد پٹنہ کے راج بھون میں داخل ہو گئے تو رشید صاحب کو ایک اور صدمہ پہنچا لکھا "انھیں علی گڑھ سے نکل کر کہیں جانا تھا تو جامعہ ملیہ جاتے"، جس کے لیے انھوں نے خود اپنی خدمات پیش کی تھیں۔

ذاکر صاحب کا 'ڈھیل' کا طریقۂ کار علی گڑھ میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جامعہ ملیہ ایک چھوٹی سی برادری تھی۔ پرانی رفاقت کی یادیں ابھی تک تازہ تھیں۔ ذاکر صاحب اگر ایک

جانب طنزاً یہ کہتے تھے کہ "یہ چڑیا کے برابر دماغ رکھنے والے لوگ ہیں" تو دوسری طرف کوئی کلرک یا چپراسی بھی ناراض ہو جاتا تو اسے منانے کی فکر میں رہتے۔ بچوں کے ادیب، الیاس مجیبی صاحب ان کے سکریٹری تھے۔ بیگم صاحبہ سے کچھ عزیز داری بھی ہوتی تھی۔ بڑے نازک مزاج آدمی تھے۔ ذاکر صاحب اُن کی تُنک مزاجی سے تنگ رہتے۔ ایک دن کہنے لگے "ہماری زندگی کا واحد مقصد یہ ہے کہ مجیبی صاحب سے نبھائے جائیں۔"

علی گڑھ زیادہ بڑی دنیا تھی۔ یہاں برادری کے اُصولوں سے نہیں، جوڑ توڑ سے کام چلتا تھا۔ ذاکر صاحب جس سانچے میں ڈھل چکے تھے وہ علی گڑھ کے لیے سازگار نہیں تھا۔ وہ ایک نہایت ذہین انسان تھے اس لیے دوست دشمن سب کی صلاحیتوں کو سمجھتے تھے لیکن سمجھ کا جو تقاضا ہوتا اس کے مطابق عمل پیرا نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے اکثر 'اُستاد' قسم کے لوگ اچھے استادوں کو پیچھے ہٹا کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ خوشامدی ہیری رہتے اور خوددار گھاٹے میں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے تم ڈاکٹر مترا کو جانتے ہو۔ میں نے کہا نام سنا ہے، دیکھا آج تک نہیں۔ کہنے لگے دیکھو گے کیسے وہ گھر سے نکلتے ہیں تو فزکس کے لیے لیب میں چلے جاتے ہیں اور وہاں سے نکل کر گھر۔ آج وہی مترا C.S.I.R کے ڈائرکٹر ہیں۔ وہ لوگوں کو پہچانتے خوب تھے۔ کیمسٹری کے شعبہ میں، ریڈر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے اس وقت ڈاکٹر عمر فاروق کام کر رہے تھے، پروفیسر شپ کے امیدوار تھے۔ لندن کے امپریل کالج کے پی ایچ۔ ڈی تھے، لیکن وہاں سے واپس آنے کے بعد حسب روایت علی گڑھ کوئی تحقیقی کام نہیں کیا تھا۔ دن رات تاش کھیلتے، گپ مارتے یا حقہ پیتے۔ انھوں نے سن رکھا تھا کہ ذاکر صاحب تحقیق کرنے والے کے بڑے قدرداں ہیں۔ چنانچہ اپنے چند اسکالروں کو حکم دیا کہ لیبارٹری میں گئی رات تک کام کرتے رہا کریں۔ اِدھر سے جب بھی گذر ہیے ساری فیکلٹی آف سائنس میں تاریکی چھائی ہوتی لیکن کیمسٹری کا شعبہ جگ مگ کرتا ہوتا۔ ذاکر صاحب کے بھی نوٹس میں یہ بات آئی۔ معاملہ کی تہ تک پہنچ گئے اور کہنے لگے "آجکل کیمسٹری کے شعبہ میں ہر شب چراغاں ہوتا ہے۔" بات عمر فاروق صاحب کے کانوں تک پہنچ گئی۔ بہت ناراض ہوئے اور چند ماہ کی طویل رخصت لے کر انگلستان پہنچے تاکہ اپنے فرسودہ علم کو تازہ کر سکیں۔ اس وقت میں بھی وہاں تھا۔ یہاں بھی اُن کا زیادہ تر وقت تاش بازی میں گزرتا۔ کبھی کبھی امپریل کالج کی طرف بھی

چھوآتے۔ واپس آکر اپنے علم تازہ کے معرکے رشید صاحب کو سُناتے (جن سے اُن کا خلوص ذاکر صاحب کے وائس چانسلر ہو جانے کے بعد بہت بڑھ گیا تھا) اور کنکھیوں سے میری جانب دیکھتے جاتے۔

غرض کہ علی گڑھ اس قسم کی اساتذہ سے بھرا ہوا تھا۔ ایک دوسری مصیبت علی گڑھ میں اقربا پروری کی تھی۔ مشہور صحافی آرن شوری نے ایک زمانے میں علی گڑھ کے بعض برسرروزگار خاندانوں کے شجرے شائع کیے تھے۔ جو چپراسی اور کلرک کی جگہوں سے لے کر پروفیسری اور پرووسٹ تک کی اسامیوں کا احاطہ کرتے تھے۔ اسی سے باہمی رقابتیں اور مناقشات پیدا ہوتے تھے۔ آپ ایک کلرک کو چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے' زنجیر دور تک ہل جاتی تھی۔ برادری کا ایک پورا حلقہ بگولے کی طرح آپ کو اپنی سمیٹ میں لے لیتا تھا۔ یہ 'حرم' کے اندر کی لڑائی تھی۔ اس کے باہر کی زور آزمائی تو علی گڑھ مسلسل کرتا رہا ہے۔

اسے علی گڑھ کی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ کبھی بھی اکثریت کے دل میں گھر نہ کر سکا حالاں کہ اس ادارے میں غیر مسلم طلبہ اور اساتذہ کی تعداد ہمیشہ معتد بہ رہی ہے۔ سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ رہی ہے کہ شہر علی گڑھ' جس میں غیر مسلموں کی ۲/۳ اکثریت ہے اور اس کے دھرم سماج اور بارہ سینی جیسے کالجوں کے طالب علم اور اساتذہ کی آنکھوں میں مسلم یونیورسٹی ہمیشہ کھٹکتی رہی' ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی اور ۱۹۴۷ء کے بعد زیادہ شدت سے۔ ذاکر صاحب چاہتے تھے کہ علی گڑھ کو سیکولر ہندوستان کا 'تصویر چہ' بنا دیا جائے۔ ان کے خیال میں مسلم اقلیت کی بقا کے لیئے یہی ایک تدبیر تھی۔ اس میں دو طرفہ تنگ نظری کی دقتیں حائل تھیں۔ ہندو سمجھتے تھے کہ پاکستان بننے کے بعد مسلمانوں کا ہندوستان پر کوئی حق باقی نہیں رہا وہ یہاں سے چلے جائیں اور یا ان کی شرائط پر اس ملک میں رہیں۔ مسلمان نہ صرف دلِ ریش ریش' رکھتا تھا اسے اب خاکِ وطن کے ہر ذرہ کو دیوتا سمجھنے میں تامل تھا۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین دونوں کو اپنے مسلمان ہونے پر فخر تھا لیکن اس کے ساتھ وہ اسی غلو کے ساتھ خود کو ہندوستانی بھی سمجھتے تھے۔ اس اندازِ نظر کے تضادات اس وقت اور منقح ہو جاتے ہیں جب سابق پرشوتم داس ٹنڈن جیسے لوگوں سے پڑتا ہے جنھوں نے ایک بار وار دو کے

حوالے سے، ذاکر صاحب کی قوم پرستی کے بارے میں شبہ کا اظہار کیا تھا۔ اسٹریچی ہال کے ایک جلسے میں اس سلسلے میں ذاکر صاحب کا جواب اور جلال دونوں دیدنی تھے۔

میرے خیال میں ہندوستانی قومیت اور مسلمان کے سلسلے میں مولانا آزاد اور ذاکر صاحب کا بتایا ہوا راستہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیئے آج بھی صحیح ہے۔ ہمیں اس ملک میں بہرحال رہنا ہے اس لیئے اس سے وفاداری بہ شرطِ استواری اپنی بقا کے لیئے لازمی ہے۔ لیکن ہمیں اپنا اسلامی تشخص کو بھی (اور یہاں میں 'اسلامی' صرف محدود مذہبی معنوں میں نہیں بلکہ وسیع ترین تہذیبی اور تاریخی معنوں میں استعمال کر رہا ہوں) قائم رکھنا ضروری ہے۔ اس کے لیئے ہمیں ہندوؤں کے اچھے اور دانشمند طبقے کا اعتماد حاصل کرنا چاہیئے تاکہ رجعت پسندانہ قوتوں کے ساتھ نبرد آزمائی کی جا سکے۔ مسلمانوں کے ذہن کے جالوں کو جدید تعلیم کے ذریعہ صاف کرنا ہوگا۔ اسلام کے نام پر جو بہت کچھ خرافات پھیل گئی ہے، اسے دور کرنا ہوگا۔ دوسری جانب ہم وطنوں کی اپنے تہذیب و تمدّن کے ظلمت پسندانہ اور دیو مالائی عناصر کی جدید تعلیم کے ذریعے اصلاح کرنا ہوگی۔ جب اصلاح کا یہ عمل دونوں طرف ہو جائے گا تو تاریخ کے کسی نہ کسی پہلو پر 'سنگم' کا نقطہ ڈھونڈھ لیں گے چاہے وہ مولانا آزاد کے وحدتِ ادیان کی شکل میں ہو یا ذاکر حسین کے عالمی انسان دوستی کے نظریے میں۔

دسواں باب

'ڈھونڈھنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں'

(اقبال)

(۵۹ تا ۶۰ء)

علی گڑھ میں ترقی کی راہیں مسدود ہوئیں تو وقتی طور پر ایک نئی راہ نکل آئی۔ لسانیات کے اسکولوں میری ملاقات ڈاکٹر جان گمپرز سے ہوئی جو بنیادی طور پر لسانیات کے طالب علم تھے لیکن سماجی لسانیات سے دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے میرٹھ کے نواح کی 'ہندوستانی' پر اس نقطۂ نظر سے کچھ کام بھی کیا تھا وہ یہودی النسل جرمن تھے لیکن ان کا خاندان امریکن بن چکا تھا۔ ان سے خاصے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ ہندوستان سے واپس جا کر جب وہ Association of Asian Studies کے عہدہ دار بنے تو میں انھیں یاد رہا اور از خود انھوں نے ایسوسی ایشن کی سینئر فیلو شپ کے لیے میرا نام تجویز کیا۔ اس کی اطلاع مجھے ۱۹۵۹ء میں میسور میں ملی یہاں میں سمر اسکول میں پڑھانے کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس فیلو شپ کے تحت مجھے اجازت تھی کہ اپنی پسند کی یونیورسٹیوں میں جا کر ایک ایک سمسٹر رہوں اور جس پروفیسر کے لکچروں میں چاہوں شرکت کروں۔ چنانچہ اس کے لیے میں نے ٹیکساز یونیورسٹی، آسٹن اور ہارورڈ کا انتخاب کیا۔ آسٹن میں پروفیسر اے۔ اے۔ ہِل تھے جو لسانیاتی اسلوبیات کے ماہر تھے۔ ہارورڈ میں لسانیات کا کوئی خاص ماہر پیشِ نظر نہیں تھا لیکن مجھے وہاں کے السنہ مشرقیہ کے شعبہ جات اور ہارورڈ یونیورسٹی کی لائبریری میں مخزونہ السنہ مشرقیہ کے ذخائر سے دلچسپی تھی۔

میں نے نیویارک تک کا سفر کے۔ ایل۔ ایم کے ہوائی جہاز سے کیا۔ یہ میرا ہوائی جہاز سے پہلا سفر تھا۔ مجھے اس وقت تک ہوائی سفر کرنے میں جھجک محسوس ہوتی تھی۔ اس زمانے میں بہت سی ہوائی کمپنیوں کے ایجنٹ علی گڑھ آتے اور یہیں بیٹھے بیٹھے بکنگ ہو جاتی۔ میرے پاس ایر فرانس کا ایجنٹ بھی آیا تھا۔ میں نے مذاق میں کہا کہ یہ تو 'ایر چانس' ہے پہنچے پہنچے، نہ پہنچے نہ پہنچے، تو خفا ہو کر چلا گیا۔ ہماری پہلی منزل قاہرہ تھی جہاں جہاز رات کو پہنچا۔ قاہرہ کے ایرپورٹ پر کھانے پینے کی اشیاء کے متعلق سے وہ تمام گندگی دیکھی جس کے لیے مشرق مشہور ہے۔ دوسری منزل روم تھی۔ روم کے ایرپورٹ پر اترنے کے لیے جب ہوائی جہاز چکر لے رہا تھا اور پرواز کے دوران وہاں کے آثار الصنادید کی جھلکیاں نظر آئیں تو بے اختیار اقبال کا یہ شعر زبان پر آگیا۔

سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دِلّی یاد آتی ہے وہی عظمت، وہی عبرت، وہی شانِ دلآویزی

اطالوی یورپ کے 'باورچی' کہلائے جاتے ہیں۔ اُن کے لیے یہ ایک تحقیری کلمہ ہے لیکن قاہرہ کے بعد یہاں جو کچھ کافی کے ساتھ نوش کیا اس کا ذائقہ کام و دہن میں دیر تک رہا، اس طرح کہ کُلّی کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ تیسری منزل مغربی جرمنی کا شہر فرانک فرٹ تھا۔ ایرپورٹ پر صفائی کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر وقت ٹوک زبان چاٹتے رہتے ہیں۔ یہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ مرغ اس درجہ تندرست تھا کہ چھوٹا موٹا دنبہ معلوم ہوتا تھا۔ چوتھی منزل ہالینڈ کا ایمسٹرڈم تھا جہاں K-L-M کا ہیڈکوارٹر تھا۔ یہاں ٹھہرنے کے لیے ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ اس لیے عارضی پرمٹ دے کر شہر کی سیر کرائی گئی۔ تھوڑی دیر کے لیے نیشنل میوزیم بھی گئے جہاں ازمنہ وسطیٰ کی مصوری کے شاہکار دیکھے۔ یہ مصوری 'خطوط' سے زیادہ 'خط و خال' پر مشتمل ہے اس لیے پسند آئی۔ ڈچ عام طور پر سہ لسانی ہوتے ہیں یعنی انگریزی اور جرمن زبان بولنے پر قدرت رکھتے ہیں، اس لیے بات چیت کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

شام کو یہاں سے چل پڑے۔ صبح ہوائی جہاز سے نیویارک پہنچا۔ اسی شام ریل سے آسٹن (ٹیکساس) کا سفر اختیار کیا جو میری پہلی منزل تھی۔ آسٹن کو شمالی نیویارک سے مختلف پایا۔ یہاں لوگوں میں لاطینی نسل ہونے کی وجہ سے حسن اور لباس دونوں میں مشرقیت پائی۔ شہر بھی کھلا اور صاف ستھرا تھا۔ دریا میں یونیورسٹی شہر کی جان تھی۔ البتہ بسوں میں کالوں کے لیے علاحدہ نشستوں کی تخصیص دیکھ کر صدمہ ہوا۔

یہ امریکی مدنیت پر سیاہ داغ ہے۔

پروفیسر ہل شعبۂ انگریزی کے استاد تھے لیکن لسانیات کے ماہر تھے۔ اس زمانے میں امریکی یونیورسٹیوں میں ادب اور لسانیات کے اساتذہ میں رشہ کشی ہو رہی تھی، بعینہٖ جس طرح ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں آج پائی جاتی ہے۔ خاص طور پر انگریزی ادب کے استاد اس علم کی ادب پر یلغار کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے اور پروفیسر ہل اسی میدان کے اسکالر تھے جو لسانیات کا اطلاق تفہیم ادب کے لیے کر رہے تھے۔ ادب کے اساتذہ کہتے تھے کہ ادبی تنقید نے ادب کی تفہیم کے لیے جو اصول وضع کر دیئے ہیں انھیں کے ذریعے اس کی تنقیص یا تحسین کی جانی چاہیئے۔ لسانیات کے ماہرین کا خیال تھا کہ ادبی تنقید کی اصلاحیں گنجلک اور مبہم ہوتی ہیں اس لیے کہ ان کی تہ میں کوئی واضح لسانی تصور نہیں ہوتا۔ یونانیوں کے زمانے سے جو اصطلاحیں دہرائی جا رہی ہیں ان سے ادبی تنقید آگے نہیں بڑھی ہے۔ ذوق کے نام پر ادبی تنقید زیادہ تر تاثراتی ہوتی ہے یا عمرانیاتی علوم کی دلدل میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ ۱۹۵۰ء تک جدید لسانیات اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی تھی۔ بلوم فیلڈ کی معرکۃ الآرا کتاب ”زبان“ ۱۹۳۳ء میں شایع ہوئی۔ اس نے توضیحی لسانیات کا نظریاتی چوکھٹا فراہم کر دیا۔ ۱۹۵۰ء کے بعد لسانیات کا اطلاق اکتسابِ زبان اور تفہیم ادب پر کیا جانے لگا۔ پروفیسر ہل اس وقت لسانیات کا ادب پر اطلاق کرنے والوں کے سرخیل تھے۔

جب میں پروفیسر ہل سے ان کے دفتر میں ملا تو دیکھا، دفتر کیا تھا، چھوٹی موٹی لائبریری تھی جس میں کتابوں کے شیلف چھت تک جاتے تھے جن تک پہنچنے کے لیے المونیم اسٹیل کی سبک سیڑھی رکھی ہوئی تھی۔ وہ کلاس سے فارغ ہوتے تو اپنے 'دفتر لائبریری' میں طلبہ سے ملاقاتوں کے ساتھ تحقیقی کاموں میں مصروف رہتے۔ علی گڑھ کے ایک وائس چانسلر سید ہاشم علی صاحب کو یہ حسرت رہی کہ یہاں کے پروفیسروں کے کمروں میں جس چیز کا فقدان ہے، وہ کتاب ہے۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ صرف دفتر کے کمروں ہی میں نہیں یہ نایاب شے ان کے مکانوں میں بھی شاذ ملتی ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ پروفیسر ہل کی اس سے بھی زیادہ بڑی لائبریری ان کے مکان پر تھی۔ مکان پر ہوں کہ دفتر میں، وہ ہمہ وقت اپنے علمی کاموں میں مصروف رہتے۔

پروفیسر ہل کے لکچروں میں، جن میں میں پابندی سے حاضری دیتا تھا۔ وہی پایا جس کی

مجھے تلاش تھی یعنی لسانیات اور ادب کو کس طرح ہمدگر کیا جاسکتا ہے۔ میں ادبی تنقید کی فقرے بازی اور قولِ محال سے بیزار تھا۔ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مقدس وید اور دیوانِ غالب" "غزل اردو شاعری کی آبرو ہے" جن فقروں پر لوگ سر دھنتے تھے میری سمجھ میں اُن کا مفہوم نہیں آتا تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ انھیں انشا پردازی کہہ سکتا ہوں، ادبی تنقید ہرگز نہیں۔ ان سے مجھے لطف مل سکتا ہے بصیرت نہیں ملتی۔ جہاں تک قدماء کے مشاہدات کا تعلق ہے ان میں کچھ جان پاتا تھا۔ لیکن ہر سطح پر علوم کے حوالے سے ان کی نئی تشریحات کی ضرورت محسوس کرتا۔ بیان و بلاغت کی کتب میں 'حرف'، کا تصور اس طرح چھایا رہا ہے کہ 'صوت'، کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ حالاں کہ حرف تو صرف جامہ ہے زبان کی جان تو صوت ہوتی ہے۔ صرف و نحو کی سطح پر منطق اور فلسفے نے ہماری قواعد کی جو درجہ بندی کر دی ہے اس سے ہم سر مو تجاوز نہیں کر سکے ہیں۔ قواعد نویسی کے ہم نے تین چوکھٹے بنا رکھے ہیں۔ (۱) یونانی۔ لاطینی (۲) سنسکرت (۳) اور عربی۔ باقی تمام جدید زبانوں کی قواعد کو ہم ان چوکھٹوں میں بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اوقات چوکور میں گول۔ فتح محمد جالندھری نے اپنی اردو قواعد میں عربی کے تتبع میں صیغۂ تثنیہ کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے بعد لکھ دیا ہے کہ یہ اردو میں نہیں ملتا۔

غرض قواعد نویسی ہو یا عروض و بلاغت کے اصول ہماری علمی نظر ان گہرائیوں تک نہیں جاتی جو توضیحی لسانیات نے اس صدی میں پیدا کر دی ہے۔ شعر و ادب بھی زبان سے پیدا ہوتا ہے اس لیے اس کے اصول وضع کرنے میں علم زبان سے اغماض کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ لفظ و معنی کی بحث پر آؤ تو دیو مالا کی چھوٹ پڑتی ہے یا ہم فلسفیانہ موشگافیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم یہ محسوس تو کر لیتے ہیں کہ شاعر "گنجینۂ معنی کا طلسم" بناتا ہے لیکن اس ترکیب کے پیچھے جس معنیاتی حقیقت سے سامنا ہے اس کی توضیح نہیں کر پاتے۔ چنانچہ یا تو "شاعری جزویست از پیغمبری" کہتے آئے ہیں یا "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں" ہم نے زبان کے تہ نشین امکانات کو چامسکی کے وقت تک مطلق سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

چامسکی کی معرکۃ الآرا تصنیف Syntactic Structures پہلی بار ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی جس نے جدید لسانیات کی دنیا ہی بدل دی۔ آج لسانیات کی ہر سطح صوتیات، صرف، نحو،

معنیات۔ پر چامسکی کا نظریہ اثر انداز ہو رہا ہے لیکن پروفیسر ہل کا تعلق بلوم فیلڈ کے 'بیہاری' دبستان سے تھا۔ انھوں نے ابھی تک (یعنی ۱۹۵۹ء تک) چامسکی کے نقطۂ نظر کو لائق اعتنا نہیں سمجھا تھا اس لیے ان کی 'لسانیاتی اسلوبیات' کی اساس بلوم فیلڈ کے نظریے پر قائم تھی۔

چامسکی کے لسانی نظریے کو ماہرینِ لسانیات اس وقت تک کس قدر مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے جو فرانس کے مشہور لسانیات کے ماہر پروفیسر مارتی نے مجھ سے پٹیالہ کی ایک کانفرنس میں بیان کیا تھا۔ پروفیسر مارتی نے عرصہ تک کولمبیا یونیورسٹی میں بھی لسانیات کے پروفیسر اور لنگوئسٹک سوسائٹی آف امریکہ کے نامور جریدہ "زبان" کی مجلسِ مشاورت کے رکن رہے ہیں۔ چامسکی نے Syntactic Structures کا مسودہ ایک طویل مقالے کی شکل میں لکھ کر پہلے 'زبان' میں شائع ہونے کے لیے بھیجا تھا۔ 'زبان' کے کارگزار ایڈیٹر نے رائے کے لیے اسے پروفیسر مارتی نے کو بھیجا۔ مارتی نے اس کے سلسلے میں نہایت مختصر الفاظ میں لکھا "اس مقالے کا لسانیات سے کوئی تعلق نہیں اس لیے 'زبان' کے علاوہ کہیں بھی شائع کیا جا سکتا ہے۔"

چامسکی کے نظریے میں متداول لسانی نظریے سے اس قدر مغائرت تھی اور اس کی فکر پر فلسفہ اور ریاضی کا اس قدر ہجوم تھا کہ ماہرینِ لسانیات نے ابتدا میں اسے لائق اعتنا تک نہیں سمجھا۔ آئنسٹائن کو نیوٹن کے ٹھوس مادی نظریے کو رد کرنے میں اسی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ دونوں کی فکر کی اہمیت اہلِ علم پر رفتہ رفتہ آشکار ہوئی تھی۔

آسٹن میں میں نے تقریباً دو سمسٹر گزارے۔ اس کے بعد ہارورڈ کا رُخ کیا۔ ابھی تک مجھے ہوائی جہاز سے سفر کرنے میں تکلف تھا اس لیے ریل کے ذریعے ساری امریکا کا چکر لگاتا ہوا۔ لاس اینجلز، سان فرانسسکو، شکاگو اور نیویارک ہوتا ہوا ہارورڈ پہنچا۔ اپنے پہنچنے کی اطلاع پہلے سے کر دی تھی اس لیے طلبہ کی امدادی جماعت کی جانب سے میرے قیام کا بندوبست قریب میں ایک لینڈ لیڈی کے یہاں کر دیا گیا تھا۔ ہارورڈ تعلیم کی قبلہ گاہ ہے۔ اس بارے میں یہاں سے جو نکلتا ہے اسے نہ صرف امریکہ کی دوسری یونیورسٹیاں بلکہ ہندوستان تک کی جامعات اپنا لیتی ہیں۔ جنرل ایجوکیشن کی اسکیم نکلی تو علی گڑھ تک اس کی زد میں آ گیا۔ بغیر یہ سوچے ہوئے کہ ہمارے یہاں تخصیصی تعلیم ہے کہاں۔ ہمارے یہاں تو ہر چیز جنرل ہوتی ہے۔ اس

تعلیم کی ضرورت تو اس سماج کو ہے جہاں تخصیصی تعلیم، بالخصوص میکانیکی تعلیم نے انسان کو کل کا پرزہ بنا دیا ہو۔

ہارورڈ میں لسانیاتی لوگ بہت کم تھے لیکن دریا پار .M.I.T میں نوام چامسکی جیسے شہرۂ آفاق لوگ موجود تھے۔ بلوم فیلڈ کی ’بیوہاریت‘ کا طلسم ٹوٹ رہا تھا اور لسانیات نئی پرواز کے لیئے پر تول رہی تھی۔ ہارورڈ کے ادارے میں اس وقت مشہور عالم آئی۔ اے رچرڈز بھی موجود تھے لیکن انھوں نے اپنی تحقیقات کو اب صرف انگریزی زبان پڑھانے کے طریقوں تک محدود کر دیا تھا۔ جس شخص نے ساری عمر ادب کی ماہیئت اور معنی کی معنویت سمجھنے میں گزاری تھی آخری عمر میں بچوں اور بالغوں کو انگریزی پڑھانے کے طریقوں کی ایجاد پر وقت صرف کر رہا تھا! ہارڈ ورڈ میں میں نے خود کو کسی پروفیسر یا لکچروں کے سلسلے سے وابستہ نہیں کیا لیکن اس کی مشہور آفاق لائبریری سے استفادہ کرتے ہوئے فن شعر پر بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس زمانے میں میرے سر میں سودا سمایا ہوا تھا کہ زبان کے نازک ترین استعمال یعنی شاعرانہ استعمال کی کُنہ تک پہنچ سکوں۔ لسانیات کا مطالعہ اب میرے لیئے ثانوی ہو گیا تھا۔ جب ادبی نقادوں کی لفاظی سے گھبرا جاتا تو پھر لسانیات میں غوطہ زن ہوتا۔ قدماء کے علم بیان وبلاغت کے بارے میں مشاہدات اور فرمودات کو لسانی علم کی کسوٹی پر کسنے کی کوشش کرتا۔ اس میں چامسکی کے نظریے سے بہت مدد ملتی اس لیئے کہ اس نے علمِ لسان کی آنکھیں باہر کے بجائے اندر کی جانب کر دی تھیں۔ اب ’معنی‘ اس قدر بے معنی، نہیں تھا جس قدر کہ ’بلوم فیلڈیوں‘ نے سمجھ رکھا تھا لیکن اس کے لیئے نفسیاتی لسانیات‘ پر کام کرنے کی ضرورت تھی۔ ہارورڈ ہی میں میں نے ادب اور مارکسزم پر مختلف تصانیف پڑھیں جس کا نتیجہ میرے ”سماج اور شعر“ والے مضمون کی شکل میں نکلا جو میں نے امریکہ سے واپسی کے بعد لکھا اور جس پر بعض حلقوں میں بڑی لے دے ہوئی اور سی۔ پی۔ آئی کے جریدے میں یہ تک لکھا گیا کہ یہ ڈالر بول رہے ہیں۔ حالاں کہ روبل اسی قدر جھنکار دیتے ہیں جس قدر کہ ڈالر۔ ہارورڈ کے قیام میں میری دلچسپی کا مرکز ”تخلیقِ شعر“ کے مسائل رہے۔ اس لیئے کہ لسانیات کا اطلاق کرنے سے پہلے جاننا چاہتا تھا کہ شعر کے بارے میں ادبی نقادوں نے کیا سوچا

اور کہا ہے۔ صرف ان ادبی نقادوں کے اقوال میں بصیرت ملی جنھیں خود تخلیقِ شعر کا تجربہ تھا۔ لیکن ان کے بیانات بھی تاثراتی تھے۔ ان میں سے کوئی بھی جدید لسانیات سے واقف نہیں تھا۔ مختلف اصوات کس طرح ارکانِ تہجی کی شکل اختیار کرتی ہیں اور پھر یہ ارکان کس طرح "لفظ" کی تشکیل کرتے ہیں، ان کے دائرۂ نظر سے دور تھا۔ پھر یہ نظر نحوی ساخت میں جا کر اور اُلجھ جاتی تھی۔ معنیات کی سرحدوں پر جا کر تو ماہر لسانیات بھی ساکت و صامت ہو جاتا ہے لیکن ادبی ناقدین کی طرح وہ قیاس آرائیوں سے اجتناب کرتا ہے اور شاعر کے منتخب کردہ الفاظ پر متبادل الفاظ رکھ کر غور کرنے لگتا ہے۔

ادبی تنقید کی ایک اور اُلجھن جس سے میں اس زمانے میں دوچار تھا یہ تھی کہ جب ادبی نقاد عام بیانات پر اُتر آتا ہے تو وہ نہ اصنافِ ادب پیشِ نظر رکھتا ہے اور نہ اصنافِ شعر، مثلاً ناول اور افسانہ کی حقیقت نگاری شعر کی حقیقت نگاری سے الگ ہوگی اور شعر میں بھی غنائی شاعری کے اصولِ نقد بیانیہ شاعری یا نظم نگاری کے اصولوں سے مختلف ہوں گے۔ غنائی شاعری موسیقی سے قریب ترین ہے۔ جس طرح موسیقی کے موثر ہونے کا اندازہ "سماجی تنقید" سے نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح غنائی شاعری کو (جس میں غزل کا اہم مقام ہے) ہمیشہ سماجی اقدار کے تابع نہیں لایا جا سکتا۔ غزل میں "خود کاوی" کی جو کوشش ہوتی ہے اُسے شاعر کی شخصیت کے حوالے سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ایک رِلکے، غالب یا میر خود اپنی ذات پر پیچ و تاب کھانے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ کسی سیاسی انقلاب کا مرہونِ منت نہیں ہوتا۔ چنانچہ میں نے نقدِ شعر کو متنِ شعر اور شاعر کی لسانی مہارت کے مطالعے تک محدود رکھنے کی کوشش کی۔

اب میں اپنی فیلوشپ کے اختتام پر آ چکا تھا اور واپسی کے لیے پر تول رہا تھا کہ اچانک برکلے سے ڈاکٹر جان گمپرز کا خط ملا کہ کیلیفورنیا یونیورسٹی (برکلے) کے ساؤتھ ایشین ڈپارٹمنٹ کے صدر، پروفیسر ہیلر کی یہ خواہش ہے کہ فیلوشپ کے اختتام پر ہندوستان واپس جانے کے بجائے میں ایک تعلیمی سال کے لیے برکلے آ جاؤں اور ہندی اردو کی تعلیم کے سلسلے میں وہاں شعبے کے اساتذہ کی مدد کروں۔ میں رکنے کا خواہشمند تو تھا لیکن ایک تو شعبۂ اردو کے نئے صدر پروفیسر آل احمد سرور کے خط پر خط آ رہے تھے کہ

وہاں لسانیات کے پرچوں کی پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے، دوسرے، بیوی بچے علی گڑھ میں تھے اور امریکی سماج کی خوفناک تنہائی سے گھبرا گیا تھا اس لیے میں نے بے دلی کے ساتھ ڈاکٹر گمپرز کو لکھا کہ میں رُک جاؤں گا بشرطیکہ آپ کی یونیورسٹی میرے بیوی بچوں کے (جو اس وقت تعداد میں تین تھے) بلانے کا بندوبست کر سکے۔ میری اس درخواست پر غور کیا گیا اور میرے مشاہرے میں تھوڑی سی تخفیف کرنے کے بعد میرے بال بچوں کے سفر خرچ اٹھانے کی ذمہ داری لے لی گئی۔ اس کے بعد میں نیویارک منتقل ہو گیا۔ یہاں ڈیڑھ مہینے کے انتظار کے بعد میری بیوی دو بچوں کی انگلی پکڑ کر اور ایک کو گود میں لے کر ایک صبح ہوائی جہاز سے اتریں۔ نیویارک کے قیام میں میں نے اس شہر اور اس کے نواح کی خوب سیر کی اور وہاں کی مشہور پبلک لائبریری کو بھی کھنگالا۔ انتظار اور تنہائی کا میرے لیے یہ بڑا خوفناک تجربہ تھا۔

ع آہ اِس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں

"آباد ویرانے" کا یہ تجربہ مجھ تک مخصوص نہیں تقریباً ہر ہندوستانی نے جسے چند سال یورپ یا امریکہ میں گزارنے پڑے ہیں اس کو محسوس کیا ہے۔ بعض نے اس سے نجات پانے کے لیے "حوریانِ فرنگی" کی محبت میں پناہ لی، بعض نے مے نوشی اور مدہوشی میں۔ چوں کہ میں اقبال کی طرح (تازہ ترین تحقیق کے مطابق) دونوں سے محروم رہا، اور متاہلانہ زندگی کی آسودگی سے آشنا بھی تھا اس لیے کام سے فراغت پا کر فرصت کا وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ بعض اوقات بلا کسی مقصد کے نیویارک کی سڑکوں یا باغوں میں مارا مارا پھرتا، وہاں بھی جی نہیں لگتا تو عجائب گھروں میں گھومتا رہتا۔ تسکین نہ ملنے کی صورت میں ذوقِ نظر آتشِ شوق کو اور بھڑکاتا۔ اس وقت اندازہ ہوا کہ انسان اپنی اصل سے کٹ کر کس قدر بھیانک زندگی گزارتا ہے! یہاں فراق نے سہارا دیا ؎

میں ہوں، دل ہے، تنہائی ہے
تم بھی ہوتے، اچھا ہوتا

نیویارک سے برکلے کا سفر پھر ہم نے ریل سے اختیار کیا۔ ریل سے اتنے لمبے سفر امریکہ میں عام طور پر پسند نہیں کیے جاتے۔ ریلیں تو وہاں بار برداری کا وسیلہ ہیں۔

راستے میں ٹھنڈا دودھ پینے کی وجہ سے میری چھوٹی بچی نادرہ کو شدید قسم کا نزلہ اور زکام ہوگیا۔ اسی حالت میں ہم برکلے پہنچے جہاں پہلے سے نچلے متوسط طبقے کے علاقے میں ایک کاٹیج ہمارے لیئے کرائے پرلے لی گئی تھی۔ کاٹیج کے مالک کسی جونیر کالج کے ریٹائرڈ استاد ڈاکٹر مور تھے۔ انھوں نے بچی کو بیمار دیکھ کر پڑوس کے ایک کلینک کا پتہ دیا جو کئی ڈاکٹروں نے اشتراک میں قائم کیا تھا۔ بچی کو فوراً لے جاکر دکھایا اس لیئے کہ اُسے تیز بخار بھی ہوگیا تھا۔ تجویز ہوا کہ کلینک کے دوسرے حصّے میں خون، پیشاب اور پاخانے کے ٹیسٹ کرائے جائیں۔ اس کے بعد دوا تجویز ہوگی۔ بل سیکڑوں پہنچ گیا۔ تیسرے روز پھر بچی کو لے کر گئے۔ اب تجویز ہوا کہ گردے متاثر ہیں۔ ان کا ایکسرے کرایا جائے۔ اس پر الگ سے گراں قدر رقم خرچ ہوئی۔ ہماری مالی پریشانی بڑھنے لگی۔ میری بیوی نے کہا مجھے تو یہ سب لُوٹنے کا دھندہ معلوم ہوتا ہے۔ بچّی کے نہ گردے خراب ہیں اور نہ پھیپھڑے۔ معمولی زکام ہے، البتہ غدود متاثر ہیں۔ اس لیئے تیز بخار ہوجاتا ہے۔ چنانچہ وہ گھریلو معالجہ کیلیئے چند اجزا خرید کر لائیں اور اُن سے جو علاج کیا تو بچّی دو روز میں بالکل ٹھیک تھی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے میں نے دوستوں سے کہا یہاں علاج کے بجائے مرجانا سستا ہے۔ ایک ستم ظریف نے کہا کہ مرنے کے بعد اگر گڑنے کی خواہش ہے تو یہ اس سے بھی زیادہ مہنگا پڑتا ہے۔ اس کے بعد اندازہ ہوا کہ امریکی ذہن ہر وقت ڈالر کے چکر میں کیوں رہتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی بات یا آدمی کو بھی ڈالروں میں تول کر بتایا جاتا ہے۔ یعنی یہ ملین ڈالر کی بات ہے یا وہ ملین ڈالر کا آدمی ہے۔

ہمارے مالکِ مکان ڈاکٹر مور نہایت شائستہ اور خلیق انسان تھے۔ وہ متوسط طبقے کے ہر امریکی کی طرح محنتی اور جفاکش بھی تھے۔ ہماری کاٹیج کافی پُرانی تھی اور ہر قسم کی مرمت چاہتی تھی وہ اپنے موٹر میں بڑھئی کے سارے اوزار بلکہ گھاس کاٹنے کی مشین تک لے کر آتے ہر قسم کی مرمت خود کرتے اور سامنے کے لان کی گھاس تک خود کاٹتے۔ انھیں ہاتھ کا کام کرنے میں کسی قسم کا عار نہیں تھا۔ یوں بھی امریکہ میں انسان کے ہاتھ کی بہت قیمت ہے۔ جنس سستی ہے لیکن اس میں انسان کا ہاتھ لگ جائے تو قیمت دُگنی ہو جاتی ہے۔ وہاں دور کی بھی اُجرت اس قدر مقرر ہے کہ ہم اس کا سان و گمان بھی نہیں کر سکتے۔

ظاہر ہے ڈاکٹر موئر اپنے گھر کا سارا کام کرنے بعد ہی کرائے کے مکان کا رُخ کرتے ہوں گے۔

ایک بار رات کو تیز ہوا سے، جو خلیج سان فرانسسکو کی جانب سے چلتی تھی، برآمدے کے کچھ شیشے ٹوٹ گئے۔ موئر صاحب کو جب علم ہوا تو ایک روز موٹر میں چھوٹے بڑے شیشے، ان کو کاٹنے کی ایک کنّی اور پٹّنگ (مسالہ) لے کر آئے اور کام پر پل پڑے۔ میری بڑی بچّی فریدہ کے لیے، جس کی عمر اس وقت چھ سال ہوگی، یہ ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا۔ وہ مور صاحب کے ارد گرد مسلسل گھومتی رہتی اور سوالوں کی بوچھار شروع کردیتی، یہ خیال کرکے کہ موئر صاحب اس کی زبان ضرور سمجھتے ہونگے۔ "ایں مور صاحب! یہ آپ کیا کاٹ رہے ہیں۔ شیشہ کیسے کٹ جاتا ہے۔ کنّی میں کیا لگا ہوا ہے وغیرہ" موئر صاحب اس خیال سے کہ بچّی اضطراب میں کہیں پاؤں شیشوں پر نہ رکھدے بار بار کہتے "Sit Down"۔ وہ بچاری موئر صاحب کی ترکی، کیا سمجھتی سمجھی یہ ناراض ہوکر دھمکا رہے ہیں۔ ماں کے پاس باورچی خانے میں دوڑی ہوئی گئی اور کہا "امّی! امّی! مور صاحب مجھ سے کہہ رہے ہیں "ڈنڈالاؤں"۔ دیکھئے تقلیبِ صوت کے اعجاز نے کسی طرح ایک بچّی کی سماعت کے لیے "سِٹ ڈاؤن" کو "ڈنڈالاؤں" میں تبدیل کردیا! جب میں نے موئر صاحب کو یہ لطیفہ سُنایا تو فریدہ کو پیار کرتے جاتے اور ہنس ہنس کر لوٹ جاتے تھے بار بار پیار سے کہتے "ڈنڈا نو، ڈنڈا نو"۔

برکلے میں میں نے اُردو ہندی کی تدریس کے ساتھ اپنی دلچسپی کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ امریکن یونیورسٹیوں میں کتب خانوں میں جو سہولتیں ہیں وہ قابلِ رشک ہیں۔ کونسی کتاب ہے جو وہاں موجود نہیں۔ اور جو موجود نہیں وہ منگادی جاتی ہے۔ کتب خانوں کا عملہ عبادت کے طور پر آپ کی خدمت کرنے کو تیار رہتا ہے۔ غرض کہ ایسا ماحول ہوتا ہے کہ پڑھنے لکھنے کو خود بخود جی چاہتا ہے۔ کتب کی فراہمی کے علاوہ جدید فوٹو گرافی کی تیکنک سے جس قدر سہولتیں پیدا کی جاسکتی ہیں وہ بھی سب موجود تھیں۔ میں نے برکلے کی لائبریری میں فوٹو فلموں کی شکل میں مسلم لیگ پر ایسا مواد بھی دیکھا جو ہندوستان تک میں دستیاب نہیں۔ یہ مواد غالباً کسی ایسے ریسرچ اسکالر کی فرمائش پر مہیا کیا گیا تھا جو مسلم لیگ کی تحریک پر کام کر رہا تھا۔ مشہور روزناموں کی فلمیں الگ تھیں ان کا ایک علاحدہ سیکشن تھا۔

مجھے شعبے کی جانب سے عبرانی کے ایک پروفیسر کا جو طویل رخصت پر ملک سے باہر گئے ہوئے تھے، کمرہ دیا گیا۔ اس سے ملحق عربی کے ایک استاد کا جن کی شہرت مصر تک پھیلی ہوئی تھی کمرہ تھا۔ امریکی یونیورسٹیوں میں حسنِ خدمت پر سبکدوش اساتذہ کا نہ صرف احترام کیا جاتا ہے بلکہ اگر ان میں سے کسی میں دم خم باقی رہ گیا ہو تو انھیں وہ تمام سہولتیں دی جاتی ہیں جو دیگر اساتذہ کو حاصل ہوتی ہیں۔ وہ شعبے کے عربی کے استاد ڈاکٹر برنر کے استاد تھے اور میں دیکھتا تھا کہ ڈاکٹر برنر ان کا کس قدر احترام کرتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا ان کا احترام امریکی کلچر کی دین تھی یا اُس کا ماخذ دور مشرق کی سرزمین کی برکت تھی اس لیے کہ دونوں یہودی النسل امریکی تھے۔ پیرانہ سالی کے باوجود ان میں حوصلہ، قلم و رقم اب تک باقی تھا۔ پابندی سے آتے اور اپنا علمی کام کرتے۔ ان کے کمرے میں کتابوں کا اس قدر انبار تھا کہ خلیف چھت تک پہنچتا تھا اُن تک رسائی کے لیے المونیم اسٹیل کی سبک سیڑھی تھی۔ میں ہمیشہ اُن سے اس خدشے کا اظہار کرتا کہ کہیں وہ چڑھنے میں گر نہ پڑیں۔ کہتے کہ نہیں میرے پیروں میں دم خم ہے۔ انھوں نے ایک بار مجھ سے کہا کہ "میں نے آپ سے زیادہ خاموش پڑوسی آج تک نہیں دیکھا۔" میں نے جواب دیا ع

فیض یہ کس کی نظر کا ہے کرامت کس کی ہے

پھر اس مصرع کا مطلب سمجھایا تو بہت خوش ہوئے۔ یہ نہیں بتایا کہ اقبال نے یہ مصرع مسولینی کے لیے کہا تھا۔

پروفیسر موصوف شعبے کے عربی کے استاد اور میرے عزیز دوست مسٹر برنر کے استاد تھے جو ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ دونوں یہودی تھے۔ شعبے کے صدر مسٹر بیلر تھے لیکن ان کا تعلق کسی ہندوستانی زبان سے نہیں تھا۔ صرف ڈاکٹر جان گمپرز کو ہندوستان اور ہندوستانی زبانوں سے دلچسپی تھی۔ اتفاق سے وہ بھی یہودی تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہودی امریکہ کی مالیاتی دنیا ہی پر نہیں علمی دنیا پر بھی کس طرح چھائے ہوئے ہیں۔

برکلے سے ملا ہوا سان فرانسسکو کا اُم البلاد ہے جو مشرق کا نیویارک ہے۔ لیکن جب کہ نیویارک ہلکے رنگوں اور دھندلکوں کا جہان ہے سان فرانسسکو نیلے آسمان اور نیلگوں

سمندر کا سوادِ اعظم رکھتا ہے۔ موسم کے لحاظ سے بھی یہ نیویارک سے بہتر ہے اور چوں کہ کیلیفورنیا کو امریکہ کا کشمیر کہا جاتا ہے، فواکہات کی کثرت، موسم کی تازگی اور شہر اور قریوں کی صفائی دیکھ کر اقبال کا یہ مصرع یاد آتا تھا ع

افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

دودھ کی ندیاں، شہدِ ناب کی بہتات، مشروبات کی کثرت، کام و دہن کی آزمائش کے لیے کیا کچھ نہ تھا۔ مرغ کا گوشت سب سے سستا پایا، چنانچہ ہم لوگوں نے زیادہ تر اسی کو آزمایا۔ بچے اس آزمائش سے اس قدر عاجز آگئے تھے کہ جب ثابت مسور کی دال (بس یہی دال وہاں ملتی تھی) پکتی تھی تو من و سلویٰ سمجھ کر کھاتے۔ میں یونیورسٹی کے کیمپس سے نکلتے وقت پاس کے ریستوران سے المونیم فوائل میں لپٹا ہوا بجلی کے ہیٹر پر بھنا ہوا ایک مرغ شام کے کھانے کے لیے ضرور خرید لیتا۔ وہ گھر پہنچنے پر بھی بھبکتا ہوا نکلتا۔ بچے اس پر بھی راضی نہیں تھے۔ دودھ سے بھی سیر ہو گئے تھے۔ البتہ آئس کریم شوق سے کھاتے۔ یہی حال پھلوں اور ان کے عرق کا تھا۔ ہر چیز سے نیت بھر گئی تھی۔ گھر کا ہر فرد اس غذا پر سرخ سفید ہو گیا تھا۔ اس وقت تک میں 'کلوسٹرول' وغیرہ کی تباہ کاریوں سے واقف نہیں تھا۔ اتفاق سے ہندوستان آنے سے چند ہفتے قبل میں نے صحت کی انشورنس کے تحت اپنا میڈیکل معائنہ کرایا۔ ڈاکٹر نے تہدید کی کہ مسٹر حسین آپ کے خون میں شکر بہت بڑھ گئی ہے، وزن بھی زیادہ ہے۔ آپ اب احتیاط شروع کر دیجئے۔ پھر کچھ ہدایات اور دوائیں لکھ کر دیں اور کہا ہندوستان پہنچ کر ہر تین مہینے پر اپنا طبی معائنہ کراتے رہیے۔ جتنا کھایا پیا تھا یہ سن کر سب نکل گیا۔ واپس آنے کے بعد اپنے 'خون' سے کشاکش کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ تا حال جاری ہے۔ جب بھی کوئی شیرینی پیش کرتا ہے خود کو 'نمک خوار' بتا دیتا ہوں۔

اپنے بڑے بچے جاوید کے سلسلے میں مجھے امریکی اسکولوں کے تعلیمی نظام کا بھی تجربہ ہوا۔ اس کی عمر... دس سال کے قریب تھی۔ ہماری خواہش تھی کہ اس کا تعلیمی سال ضائع نہ ہو، اس لیے پڑوس کے ایک اسکول میں داخلہ کرا دیا۔ ظاہر ہے اس کی انگریزی بہت کمزور تھی اس لیے وہ کلاس میں بے جان سا خاموش بیٹھا رہتا اور ٹیچر دل کے

سوالات کا جواب نہیں دے پاتا۔ چند ہفتوں کے بعد مجھے اس کے کلاس ٹیچر نے اسی کے ہاتھ رقعہ بھیجا جس میں یہ خواہش ظاہر کی کہ میں ان سے جاکر اسکول میں ملوں۔ گیا تو انھوں نے نہایت تشویشناک لہجے میں کہا "مسٹر حسین، آپ کا بچہ نارمل نہیں ہے۔" دریافت کرنے پر تفصیلات بتانے لگیں، اور نفسیات کے کسی ماہر کے پاس لے جانے کے لیے کہا۔ میں صورتِ حال کو فوراً سمجھ گیا کہ جاوید کے بارے میں یہ اسی انداز میں سوچ رہی ہیں جس طرح ہمارے برکلے پہنچنے پر وہاں کے ڈاکٹروں نے میری چھوٹی بچی کے معمولی سے زکام کا بتنگڑ بناکر آدھے درجن ٹیسٹ بنا دیئے تھے۔ میں نے کہا آپ تشویش نہ کریں اور مجھے پرنسپل صاحبہ سے ملنے کا موقع دیں۔ چند روز میں اُن سے ملاقات کا وقت مقرر ہو گیا۔ گیا تو وہ مجھے زیادہ سمجھدار اور معقول نظر آئیں۔ میں نے کہا جاوید بالکل نارمل بچہ ہے۔ اس کی 'ایب نارمل' حرکتوں کا تعلق انگریزی زبان کی استعداد کم ہونے کی وجہ سے ہے۔ دو تین مہینوں میں دیکھئے گا وہ کلاس میں چل نکلے گا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ اس کے بعد پھر اس کی کوئی شکایت نہیں آئی، امریکہ کے ڈاکٹروں کا تجربہ تھا ہی، ان کے تعلیمی نظام کا یہ تجربہ مزید ہوا تو بے ساختہ زبان سے نکلا؎

گر ہمیں مکتب وہمیں مُلّا

البتہ اس قدر ضرور کہونگا کہ باوجود بعض خرابیوں کے (مثلاً ہر امریکن بچے کا خط خراب ہوتا ہے) امریکی سماج اپنے بچوں کو مستقبل کی دولت سمجھ کر عزیز رکھتا ہے۔ یہ صورت چاہے خاندان میں نہ ہو (جہاں ہر تین شادیاں ایک طلاق پر ختم ہوتی ہیں) لیکن سماج اور حکومت کی نظر میں ضرور ہے۔ میں نے دیکھا اسکولوں کے چاروں طرف سڑکوں پر آہستہ موٹر چلانے کی ہدایات لگی ہوتی ہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ان پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں خفیہ پولیس کے لوگ 'اسپیڈ' کی شناخت کے لیے باریک تار سڑکوں پر ڈالے ہوئے دور بیٹھے رہتے ہیں۔ ان تاروں پر سے موٹر گذرتے ہوئے اپنی رفتار بتا جاتی ہے اور قانونی کارروائی کے لیے اس موٹر کا نمبر فوراً نوٹ کر لیا جاتا ہے۔

سماجی احساس کی ایک اور مثال کا واقعہ مجھے یاد آرہا ہے۔ جاوید کے اسکول کے سامنے بچوں کے کھیلنے کا میدان تھا۔ جہاں ایک دن پڑوس کا کتا آ گیا۔ بچوں کو

فٹ بال کے ساتھ اچھلتے کودتے دیکھ کر وہ بھی اُچھلنے لگا۔ اِس اُچھل کود میں اتفاق سے اس کا دانت جاوید کی ٹانگ میں لگ گیا۔ بس پھر کیا تھا اسکول اور محلّے دونوں میں کہرام مچ گیا۔ ٹیلیفون کھڑکھڑانے لگا۔ ایک خاتون نے (جو کتّے کی مالکہ تھیں) پہلے تو ہم سے معافی مانگی، اس کے بعد یقین دلایا کہ ان کے کتّے کے ٹیکا لگا ہوا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس سلسلے میں میڈیکل ایڈ پر جو بھی خرچ ہو اُسے وہ برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ سماجی ذمہ داری کے احساس کی یہ انتہا تھی۔

برکلے میں سال بھر گذارنے کے بعد بالآخر وطن کو واپسی کی تیاری ہونے لگی باوجود نعمتوں اور راحتوں کے واپسی کی خوشی تھی اور اقبال کا یہ شعر وردِ زبان رہتا ؎

فرنگ میں کوئی دن اور مَیں ٹھہر جاؤں
مرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ

میرے خیال میں اقبال ہی نہیں اِس ذہنی کیفیت سے قیامِ فرنگ میں ہر ہندوستانی گزرتا ہے۔ "وہ مشتِ خاک" جس سے وطن عبارت ہے اور جس کے بدلے میں حالیؔ نے 'بہشت' تک لینے سے انکار کیا ہے 'مشتِ خاک' نہیں 'طرزِ حیات' ہوتا ہے جس کے باہر انسان زیادہ دنوں تک خوش نہیں رہ سکتا۔ یہ کبھی تنہائی بن کر ستاتا ہے اور کبھی دوری کی شکل میں کاٹتا ہے۔ میرے ان تاثرات کا دھندلا سا عکس اس غزل میں دیکھئے، جو میں نے قیامِ امریکہ کے پہلے سال میں لکھی تھی جب میں تنہا تھا:

ترے دیار میں کوئی بھی ہم زباں نہ مِلا
ہزار نقش ملے، کوئی رازداں نہ مِلا
میں سوچتا ہوں کہ یہ بھی حسین ہیں لیکن
تصوّرِ رخِ جاناں کا امتحاں نہ مِلا
یہ سچ نہیں ہے کہ چھٹنے کے بعد جانِ وصال
تجھے زمیں نہ ملی، مجھ کو آسماں نہ مِلا

ادائے خاص ملی اور صلائے عام ملی
مگر کہیں بھی وہ اندازِ جانِ جاں نہ ملا
گداشناسیٔ اہلِ کرم مسلّم ہے
ہم اٹھ کے جس کے قدم لیں وہ پاسباں نہ ملا
جہاں بھی دیکھا وہیں پایا تجھ جانِ وصال
تری نگاہ کا پرتو، کہاں کہاں نہ ملا
وہ دل ہی کیا جو محبت سے آشنا نہ ہوا
سفینہ کیا وہ جسے بحرِ بیکراں نہ ملا
کسے سنائیں غزل بہر شرحِ دلِ مسعود
کہ اس دیار میں کوئی بھی نکتہ داں نہ ملا

(امریکہ اکتوبر ۶۵ء)

چنانچہ ہم سب ہندوستان لوٹنے پر خوش تھے۔ پھر طے کیا کہ سفر خشکی اور سمندر سے کیا جائے، حالاں کہ ہمیں ہوائی جہاز سے سفر کرنے کی اجازت تھی اور اس کے ذریعے ہم دو روز کے اندر پہنچ سکتے تھے۔ چنانچہ برکلے سے نیویارک تک کا سفر پھر ریل سے طے کیا۔ نیویارک سے کوئن میری (جواب معطل ہو چکا ہے) برٹش کمپنی کا جہاز لیا۔ جہاز کیا تھا سمندر پر تیرتا ہوا شہر تھا۔ اس کے عرشے، ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، ایسا معلوم ہوتا تھا آپ کسی پانچ ستاروں کے ہوٹل میں آگئے ہیں۔ تینوں بچوں سمیت کھانے کے لیئے دونوں وقت ہم لوگ ڈائننگ روم جاتے۔ چوں کہ میری بیوی کو ذبیحہ کا بہت خیال رہتا تھا اس لیئے روز مچھلی کی فرمائش ہوتی۔ چنانچہ انگریز بیرا، جو غیر معمولی طور پر مسخرا تھا، ہمیں دیکھتے ہی کہتا "فش اینڈ چپس" آرہے ہیں۔ "چپس" کا اشارہ ظاہر ہے تینوں بچوں کی جانب ہوتا۔ ہفتہ بھر میں بحرِ اوقیانوس پار کر کے لندن پہنچ گئے۔ وہاں ایک ہوٹل میں ٹھہرنے کا پہلے سے انتظام تھا۔ بال بچوں کو تین روز تک لندن کی سیر کرائی۔ ایک فرج اور کچھ چھت کے پنکھوں کی خریداری کی اور بحری جہاز سے بمبئی کے لیئے روانہ ہو گئے۔

میں دس برس پہلے لندن میں سال بھر رہ چکا تھا۔ اس وقت لندن، دہلی

اور بمبئی کے مقابلے میں ایک نہایت عمدہ شہر معلوم ہوا تھا۔ امریکہ سے واپسی پر یہاں کی ہر چیز گھٹیا لگی۔ بچوں کے لیے دودھ لینے، وہ کم تر، ریستوران میں کھانا کھایا وہ گھٹیا ملا۔ غرض کہ امریکی معیار سے ہر چیز کو فروتر پایا۔ وہاں سے سوئے مشرق روانہ ہوئے تو جہاز ہی سے بمبئی کی خوشبو آنے لگی۔ بمبئی پہنچ کر معلوم ہوا کہ لندن اس سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ یہاں کی تو ہر چیز بد سے بدتر تھی، لیکن یہ احساس کہ۔ اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے!۔ زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا۔

بمبئی میں معلوم ہوا اس روز ریلوں کی اسٹرائک تھی۔ ہم نے ہوائی جہاز کے سفر کے بدلے میں فرسٹ کلاس ایر کنڈیشنڈ کا ریزرویشن کرایا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک گاڑی میں جگہ ملی۔ ساری گاڑی کو خالی پایا۔ سروس کی قلت اور تنہائی کے خوف سے فرسٹ کلاس میں تھرڈ کلاس کا لطف آیا!

گیارھواں باب

دکھن ملک بھوتیچ خاصا اہے (وجہی)

(۶۲ تا ۶۶۸)

علی گڑھ واپس آکر میری بے اطمینانی بڑھتی گئی۔ میرے لیے ترقی کے راستے مسدود تھے۔ موجودہ صدرِ شعبہ، پروفیسر آل احمد سرور مجھ سے عمر میں صرف سات سال بڑے تھے جیسا کہ اشارہ کرچکا ہوں وہ شعبہ میں لسانیات کی دوسری پروفیسری کے لیے بہت زیادہ خواہش مند بھی نہیں تھے۔ میری امریکہ کی غیر حاضری میں اُنھوں نے لسانیات کی ایک ریڈرشپ حاصل کرلی تھی۔ اب ان کی خواہش تھی کہ میں اس پر چلا جاؤں تاکہ میری ریڈری پر ڈاکٹر محمد عُزیر کا تقرر کیا جاسکے، جو ابھی تک لکچرر تھے۔ میں ڈاکٹر عُزیر صاحب کا بڑا احترام کرتا تھا اس لیے کہ وہ اللہ کے ایک نیک بندے تھے۔ لیکن میرے ساتھ جو بے انصافی ہو رہی تھی (جس کا چرچا علی گڑھ میں عام تھا) اس کے پیشِ نظر میں نے اس منتقلی سے انکار کر دیا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نئی ریڈری پلان کی پوسٹ تھی اور میرا تقرر شعبے کی سب سے پُرانی ریڈری رشید احمد صدیقی صاحب کی جگہ پر ہوا تھا۔ میرے اس انکار کے بعد خوش ہوں، کہ ڈاکٹر عزیر صاحب کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ کسی نہ کسی تاویل کے ذریعے لسانیات کی ریڈری پر ان کا تقرر کر دیا گیا، حالاں کہ عزیر صاحب اور میں دونوں، اس بارے میں متفق تھے کہ ان کی ترقی کا سب سے آسان طریقہ یہ ہو تاکہ مجھے لسانیات کی پروفیسری قائم کرکے اس پر

ترقی دے دی جاتی اور ان کا تقرر میری جگہ پر ہو جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ پروفیسر شپ قائم کرنے کی تجویز اکیڈمک کونسل میں پیش بھی ہوئی تھی لیکن چوں کہ صدر شعبہ کی مرضی نہیں تھی اس لیے ریڈری میں تبدیل کر دی گئی۔

میں اب علی گڑھ سے غیر مطمئن تھا۔ اور نظریں اِدھر اُدھر دوڑانے لگا تھا۔ اس زمانے میں پروفیسری بڑی مشکل سے ملتی تھی، ایک تو یہ بہت کم تھیں۔ دوسرے مقابلہ بہت سخت تھا۔ حسن اتفاق، پروفیسر عبد القادر سروری کسی کام کے سلسلے میں علی گڑھ تشریف لائے۔ ان سے مجھے نیاز مندی حاصل تھی اور وہ میرے کام کے قدر داں تھے۔ جب وہ پونا کے سمر اسکول میں بحیثیت طالب علم آئے تھے تو اس وقت انھوں نے مجھے استاد کی حیثیت سے بھی دیکھا تھا بلکہ اردو داں ہونے کے باعث ڈاکٹر کاترے نے انھیں صوتیات کے اس گروپ میں رکھا تھا جسے میں پڑھا رہا تھا۔ انھوں نے مجھے جونیر سمجھ کر درخواست دی کہ انھیں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کے گروپ میں منتقل کر دیا جائے۔ ڈاکٹر کاترے اس پر برہم تھے کہ ایک اُردو کا آدمی اور بنگالی کے گروپ میں جانا چاہتا ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے ڈاکٹر کاترے سے پُر زور سفارش کی کہ ان کی درخواست کو منظور کرتے ہوئے انھیں چٹرجی کی کلاس میں بیٹھنے کی اجازت دے دی جائے۔ ڈاکٹر کاترے ناراض اِس بات پر تھے کہ وہ ایک نئے علم کی واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جونیر سینیر کے چکّر میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے بہرحال، ہمارے معاشرے میں حفظِ مراتب کی جو روایت ہے، اس کا حوالہ دے کر انھیں قائل کر لیا اور قبل اس کے کہ وہ میری کسی کلاس میں شرکت کر سکیں، ان کے نام کا چٹرجی کے رجسٹر میں اندراج ہو گیا۔ میں نے اس راز کو سروری صاحب پر کبھی افشا نہیں کیا۔

بہرحال علمی اعتبار سے وہ میرے قدر داں تھے۔ انھوں نے علی گڑھ کے اس بار کے سفر میں برسبیلِ تذکرہ اپنے ریٹائرڈ ہونے کا تذکرہ کیا اور بالواسطہ انداز میں یہ جاننا چاہا کہ آیا میں حیدر آباد آنے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں نے ہامی بھر لی۔ چند مہینوں کے بعد ان کا خط ملا جس میں اردو کے شعبے کی پروفیسری کے اعلان کا تراشہ اور ساتھ میں درخواست

کا فارم ملفوف تھا۔ میں نے نہایت بے دلی کے ساتھ اسے بھر کر بھیج دیا۔ فروری ۶۲ء میں اچانک رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی کے یہاں سے مجھے انٹرویو کی اطلاع ملی اور میں دکن کے لیے پابہ رکاب ہو گیا۔ وہاں پہنچا تو میرے بڑے بھائی امتیاز حسین خاں ششدر رہ گئے۔ ساری عمر وہاں گزارنے کے بعد بھی وہ عثمانیہ یونیورسٹی کی ملازمت کو نہ معلوم کیوں، میرے لیے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ دوسرے دن میں اپنی تصانیف کا پلندہ اٹھائے، سوٹ پہنے انٹرویو کے لیے آرٹس کالج کی سنگین عمارت میں پہنچا جہاں وائس چانسلر کا دفتر تھا۔ دفتر سے ملحق ایک کمرے میں امیدواروں کو بٹھایا گیا تھا۔ خاص خاص امیدواروں میں دو عثمانیہ کے تھے یعنی ڈاکٹر حفیظ قتیل اور ڈاکٹر رفیعہ اور ایک میری طرح باہر کے یعنی ڈاکٹر گیان چند جین، جو اس وقت بھوپال سے آئے تھے۔ میں غالباً چوتھے نمبر پر بلایا گیا۔ اندر جا کر دیکھتا ہوں تو سروری صاحب کے علاوہ پروفیسر اعجاز حسین اور پونا کے شری بھگوت دیال ورما موجود تھے۔ شری ورما پونا کے ایک کالج میں اردو فارسی کے استاد تھے اور یہ حسن اتفاق تھا کہ چند سال قبل وہ لسانیات کے سمر اسکول میں میرے طالب علم کی حیثیت سے شرکت کر چکے تھے۔ صدر انتخاب کمیٹی وائس چانسلر ڈاکٹر ڈی۔ ایس۔ ریڈی تھے۔ پرنسپل اور ڈین کی حیثیت سے پروفیسر عبدالقادر نے شرکت کی جو میرے بڑے بھائی کے دوست تھے۔ مجھے اپنے منتخب ہو جانے کی قوی امید ہو گئی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں ابھی باہر نکل کر اپنے کاغذات ٹھیک ہی کر رہا تھا کہ ایک کلرک آیا اور مجھ سے کہا "صاحب (مراد وائس چانسلر) کہہ رہے ہیں کہ آپ ابھی نہ جائیں" اور لوگ جو کمرے میں تھے انھوں نے نتیجہ کو بھانپ لیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے پھر طلب کیا گیا اور ڈاکٹر ریڈی نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں عثمانیہ جوائن کرنے میں کتنا وقت لوں گا۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک آدھ مہینے میں آجاؤں۔ لیکن میں نے کہا کہ علی گڑھ کا کورس نا تمام پڑا ہے، اس کے بعد امتحانات ہوں گے اس لیے مجھے جون تک مہلت دی جائے۔ اس وقت تک عثمانیہ یونیورسٹی تعطیلاتِ گرما کے بعد کھل جائے گی۔

شام تک اردو کے نئے پروفیسر کے انتخاب کی خبر عام ہو گئی۔ میں سروری صاحب کے یہاں جا کر ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب سے ملا تو انھوں نے بڑے مزے لے لے کر

گیان چند صاحب کی اُمید واری کا قصہ سنایا۔ ہُذا جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہوگا یہ الہ آباد کے طالب علم رہے ہیں لیکن وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے ہمیں کبھی نہیں پوچھا۔ اب جو انھیں اس انتخاب کمیٹی کے رکن ہونے کی خبر ملی تو اچانک میرے پاس خط آیا اور مجھے کسی زبانی امتحان کے لیے بھوپال آنے کی دعوت دی، جہاں وہ اس وقت حمیدیہ کالج میں اردو کے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ میں نے بھی یہ خیال کیا کہ حیدرآباد تو جانا ہے ہی ایسی تاریخ دی کہ میں بھوپال ہوتا ہوا حیدرآباد پہنچوں۔ چنانچہ بھوپال میں امتحان لیا اور جب حیدرآباد کے لیے روانہ ہوا تو وہ بھی امیدوار کی حیثیت سے میرے ہم سفر تھے۔

شام کو ورما صاحب سے بھی ملاقات ہوئی تو انھوں نے اپنی معمولاً نیازمندی سے کہا "آپ سے بہتر اور کون عثمانیہ کو مل سکتا تھا۔ میں نے تو صرف حق شاگردی ادا کیا ہے۔" میں ان کے یہ کہنے پر رلتہ خطی تھا، حالاں کہ خوب جانتا تھا کہ وہ یونیورسٹی کے پروفیسر نہیں تھے بلکہ پونا کے ایک کالج کے استاد تھے!

دو روز کے بعد جب علی گڑھ کے لیے واپسی کا سفر اختیار کیا تو اتفاق سے اپنا ہم سفر ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کو پایا۔ اسی سفر میں انھوں نے مجھے گیان چند صاحب کے ہم سفر ہونے کا قصہ سنایا تھا۔

جون ۶۲ء میں حیدرآباد پہنچ کر سروری صاحب سے شعبۂ اردو کا چارج لیا۔ وہ اس وقت توسیعِ ملازمت پر چل رہے تھے۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ریڈی شعبے میں ان کی کارگزاری سے زیادہ خوش نہیں تھے اور چاہتے تھے کہ میں جلد از جلد حیدرآباد پہنچ جاؤں۔ میں وہاں تنہا پہنچا تھا اور اپنی ہمشیرہ کے ساتھ ریڈ ہلز (لال ٹیک) میں مقیم تھا۔ کچھ عرصے کے بعد میری بیوی بھی بال بچوں کو لے کر آگئیں۔ چند ہفتے لال ٹیک میں مزید قیام کرنے کے بعد میں اُڈی کمیٹ میں یونیورسٹی کے مکان میں منتقل ہو گیا، جو ڈاکٹر ریڈی کی عنایت سے مجھے الاٹ ہو گیا تھا۔ یہ مکان کسی زمانے میں ایک جاگیردار نے شہر سے باہر موسمِ گرما گزارنے کے لیے بنوایا تھا۔ سامنے کی زمین میں جہاں موجودہ انجینئرنگ کالج ہے، اس کا آموں کا باغ تھا۔ مکان میں مکانیت بہت کم تھی صرف دو بڑے کمرے اور ایک بہت بڑا ہال تھا جو غالباً رقص و سرود کی محفلوں

کے کام آتا ہوگا۔ اس کا رُوکار عظیم تھا، رومن فنِ تعمیر کے اونچے ستون اور کشادہ سرِ در تھا۔ ڈاکٹر ریڈی جب کبھی شہر جاتے ہوئے اس طرف سے گزرتے تو مجھ سے بعد کو ضرور کہتے "نواب کا محل معلوم ہوتا ہے"۔ میں کہتا "جی ہاں! صرف باہر سے" میرا اصل مسئلہ اس 'محل' کے لیے فرنیچر اور اسباب آرائش فراہم کرنے کا تھا جو میں اپنے قیام کی چھ سالہ مدت میں بھی نہ کر سکا۔ مکان مل جانے کے بعد مجھے بچوں کے داخلے کی فکر ہوئی۔ جاوید علی گڑھ سے ساتواں درجہ پاس کر کے آیا تھا' اُسے مسعود یزدانی صاحب کی بیگم صاحبہ کی سفارش سے حیدرآباد کے ایک اچھے اسکول 'گرامر اسکول' میں داخلہ مل گیا۔ دونوں بڑی بچیاں۔ فریدہ اور نادرہ۔ لڑکیوں کے مشہور محبوبیہ اسکول داخل ہو گئیں۔ اِس اسکول کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ نظام شاہی میں جاگیردار گھرانے کی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا تھا اور یہاں سے لڑکیاں مردانہ بولی۔ میں جاتا ہوں، میں جاؤں گا۔ کہتی ہوئی نکلتیں۔ میں نے اس کی تحقیق کی تو معلوم ہوا بولی ٹھولی کا یہ انداز مغل شہزادیوں سے نکلا تھا جن کی بلوغت کی عمر پہنچنے تک لڑکوں کی طرح تربیت کی جاتی تھی، بغیر دوپٹے کا لباس، گول کامدار ٹوپی اور کھڑا پاجامہ ان کا لباس ہوتا۔ گھڑسواری کی تربیت دی جاتی۔ وہ مردانہ بولی بولتیں اور ان کو بیٹی کے بجائے 'بیٹا' سے بلایا جاتا۔ آج بھی ہم لاڈ میں بیٹی کو 'بیٹا' کہہ دیتے ہیں۔

حیدرآباد پہنچنے کے دو مہینے کے بعد ہی میرے آخری 'بیٹا' (یعنی بیٹی زیبا) کی پیدائش ہوئی۔ صحت اور وزن کے لحاظ سے بھی وہ 'بیٹا' معلوم ہوتی تھی۔ ساڑھے بارہ پاؤنڈ وزن' موٹے موٹے ہاتھ پاؤں۔ لیڈی ڈاکٹر زبیدہ اس کو فخریہ اپنے کلینک میں آنے والوں کو دکھاتیں۔ کچھ عرصے تک اس کی ولادت کے چکر میں رہا۔ اس سے فارغ ہو کر شعبہ کی جانب متوجہ ہوا۔ ڈاکٹر ریڈی نے دورانِ گفتگو اس سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا۔ در اصل انتشار و افتراق اس شعبے کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا جو ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر عبدالقادر سروری کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے کھلی جنگ میں تبدیل ہو چکا تھا' اور ہر وائس چانسلر کے لیے دردِ سر بنا رہا۔ ڈاکٹر ریڈی کا خیال تھا کہ اب اس شعبے کو کسی 'غیر ملکی' (بیرونِ حیدرآباد کا) کے سپرد کرنا چاہیے تاکہ اس کی پارٹی بندی ختم ہو۔ شعبے کے اساتذہ میں سب سے سینیئر

ڈاکٹر حفیظ قتیل اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ تھیں جو بحیثیت ریڈر مرکزی شعبے میں کام کر رہی تھیں۔ زینت ساجدہ ویمنس کالج کی اچھی استاد سمجھی جاتی تھیں۔ ہمدرد اور پُرخلوص خاتون تھیں۔ لیکن مزاج کا یہ عالم تھا ع کی بات جس سے اُس نے شکایت ضرور کی۔ ڈاکٹر حفیظ مرنجاں مرنج جسمانی اعتبار سے ٹھُس مگر کلاسیکی ادب میں ٹھوس قابلیت کے آدمی تھے۔ ان کا معرکتہ الآرا تحقیقی کام وہ چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ 'معراج العاشقین' خواجہ بندہ نواز کا رسالہ نہیں، ان کے کئی سو سال بعد کسی دوسرے اہلِ تصوّف نے تصنیف کیا تھا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، پروفیسر سروری صاحب کی ترجیحی فہرست میں نمبر ایک تھی۔ انھیں کے ساتھ انھوں نے "اردو نثر کا ارتقا" اپنا تحقیقی مقالہ تصنیف کیا تھا، جسے حوالے کی کتاب سمجھا جاتا ہے، لیکن اس کے بعد وہ کوئی خاص کام نہ کر سکیں۔ وہ خاطر تواضع کرنے اور تعلقات بڑھانے میں ید طولیٰ رکھتی تھیں۔ ان کے پاس توصیفی کلمات کہنے کا جمع خرچ بھی بہت زیادہ تھا۔ نوجوان اساتذہ میں سب سے اچھی صلاحیت کی مالک ڈاکٹر سیّدہ جعفر تھیں۔ وہ بھی سروری صاحب کی عزیز شاگرد تھیں لیکن شاید آخری زمانے میں استاد اور شاگرد کے ویسے تعلقات نہیں رہے تھے اس لیے کہ ایک بار باتوں کی رَو میں سروری صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ "یہ جتنی زمین کے اوپر ہیں اتنی ہی اندر ہیں"۔ بہر حال مجھے اُن سے اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوا، اور ان کا قد زمین کے اوپر بڑھتا ہی گیا۔ میں نے انھیں ریڈر بنانے میں پوری مدد کی۔ اب دکنیات کی ماہر کی حیثیت سے ان کا علمی حلقوں میں احترام سے نام لیا جاتا ہے۔

شعبے کے پہلے سال کی تقسیم کار کے وقت میں نے تاریخِ زبان کے پرچے کے علاوہ دکنی نثر کے شہ پارے، وجہی کے 'سب رس' کو پڑھانے کی ذمہ داری بھی لی۔ مجھے یاد ہے کہ میرے اس انتخاب کے وقت اساتذہ اور طلبہ دونوں میں چہ می گوئیاں تھیں۔ یعنی ایک 'غیر ملکی' دکنی کے شاہ کار کا حق کس طرح ادا کر سکتا ہے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد جب میں نے 'سب رس' کے متن کو اردو زبان کے ارتقا کے ساتھ مربوط کر کے درس دینا شروع کیا تو ذہین طلبہ نے فوراً محسوس کر لیا کہ وہ 'ملکی' ہوتے ہوئے بھی دکنی اردو کے رموز و غوامض سے کتنے ناواقف تھے۔ اہلِ زبان ہونے کے یہ معنی نہیں

ہو۔ تر کہ آپ ''زبان، جانتے بھی ہیں۔ دکن کی تمام تر خصوصیات جو اسے جدید اُردو سے مُمیّز کرتی ہیں وہ اس کے پراکرت نژاد الفاظ ہیں جو فتوحاتِ علائی و تغلق کے ساتھ گجرات اور دکن پہنچے تھے اور جن کا منبع و سرچشمہ نواحِ دہلی کی بولیاں تھیں۔ وہ نہ تلگو سے مستعار لئے گئے ہیں اور نہ کنڑ سے۔ مراٹھی کے بعض الفاظ سے اشتراک اس وجہ سے پایا جاتا ہے کہ ہند آریائی خاندان کے رشتے سے مراٹھی، ایک مُتجانس زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ دکن کے اساتذہ اور محققین دونوں کی یہ محرومی رہی ہے کہ وہ نواحِ دہلی کی بولیوں سے نا واقفِ محض رہے ہیں۔ چاہے وہ ڈاکٹر محی الدّین قادری زور ہوں یا پروفیسر عبدالقادر سروری۔ سروری صاحب کسی قدر ہندی سے واقفیت رکھتے تھے۔ زور صاحب کو پنڈت ونشی دھر النکار سے مدد لینی پڑتی تھی۔ اس لحاظ سے دکنی اردو کے سب سے اچھے اسکالر ڈاکٹر شری رام شرما گزرے ہیں، جنھوں نے ہندی میں اپنی معرکتہ الآرا کتاب "دکھنی ہندی کا اُدبھو اور وکاس" ۱۹۶۴ء میں تصنیف کی اور نام کمایا۔ ان کی بھی دقتیں دو تھیں: ایک تو انھیں دکنی اردو کو ''دکھنی ہندی'' ثابت کرنا تھا اور دوسرے وہ دکنی کے مخطوطات سے، اردو کم جاننے کی وجہ سے، خاطر خواہ استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے بعض اوقات زبر دست غچّا کھا جاتے تھے۔ بہر حال اُن کا بڑا احترام کرتا تھا اور مجھے سخت افسوس تھا کہ ایسے اہلِ علم کو شعبۂ ہندی کے اربابِ حل و عقد نے عرصہ تک لکچرار کی اسامی پر ڈالے رکھا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ جب حق بہ حقدار رسید، تو وہ ایک حادثے میں جاں بحق تسلیم ہو گئے۔

دکنی اردو کے سائنسی مطالعہ کے ساتھ ساتھ میں نے اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا سے متعلق (جو میری تحقیقات کا خاص موضوع رہا ہے) علمی نقطۂ نظر کی ترویج کرتے ہوئے اپنی تحریروں میں ''دکنی'' کے مقامی نام پر شمس اللہ قادری اور عبدالحق کے پسندیدہ نام ''قدیم اردو'' کو ترجیح دی۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ اردو کا ''دکنی'' نام سولھویں صدی سے پہلے نہیں ملتا۔ وجہی تک نے ''سب رس'' میں اسے ''زبانِ ہندوستان'' کہا ہے۔ اس سے پہلے اس کا عام نام ہندی اور ہندوی رہا ہے۔ قدیم اردو (یا اردوئے قدیم) کے نام پر دکن کے بہت سے اہلِ علم نے ناک بھوؤں چڑھائی لیکن میرا اندیشہ دراز صحیح ثابت ہوا۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ اور ڈاکٹر شری رام شرما نے اسے صاف صاف ''دکھنی ہندی'' بنا دیا۔ اَمرت رائے کا تو

خیال ہے کہ اردو کی بدعت ولی اور اس کے بعد سے شروع ہوئی ورنہ اس سے قبل کی دکنی تمام تر ہندی یا ہندوی ہے جس کا ادب ہندی تاریخِ ادب کا اسی طرح جزو بنایا جاسکتا ہے جس طرح برج بھاشا یا اودھی کا ادب۔ لیکن یہ ان کی بدنیتی یا خود فریبی ہے۔ وجہی کی 'سب رس'، یا نصرتی کے قصائد قدیم اردو کے نقوش ہیں نہ کہ قدیم ہندی کے، اسلوب اور فرہنگ دونوں اعتبار سے۔ اردو کا دامن بہت وسیع ہے۔ یہ غالب و اقبال تا نظیر اکبرآبادی اور پریم چند، سب کا احاطہ کرتی ہے لیکن اپنی 'کھڑی بولی' اساس سے یک لحظہ غافل نہیں ہوتی۔ اسی لیے یہ برج بھاشا اور اودھی کے ادب پاروں کو اپنانے سے انکار کرتی ہے۔

علمی اعتبار سے عثمانیہ یونیورسٹی میں میرا چھ سالہ قیام (۱۹۶۲ تا ۱۹۶۸ء) خود میرے لیے بارآور رہا۔ اسی دوران میں نے 'قدیم اردو' کے نام سے اردو کے قدیم متون کو، سائنسی انداز میں مرتب کرکے چار ضخیم جلدوں میں شائع کیا، جن میں 'پرت نامہ'، 'بکٹ کہانی'، اور 'ابراہیم نامہ' کے متون میرے مرتب کردہ ہیں۔ ابراہیم نامہ کا متن نہایت ادق زبان میں لکھا ہوا تھا اور اس کا صرف ایک ہی خطی نسخہ دستیاب تھا، اس لیے باوجود کوشش کے ڈاکٹر زور بھی اس کی تدوین کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ میں نے یہ ہفت خواں دو سال کی محنتِ شاقہ کے بعد طے کیا۔ اسی زمانے میں میں نے اپنے علمی و لسانیاتی مضامین کا انتخاب 'شعر و زبان' کے نام سے ۱۹۶۶ء میں شائع کیا۔ اس میں 'تخلیقِ شعر'، 'مطالعۂ شعر (صوتیاتی نقطۂ نظر سے)'، 'سماج اور شعر'، 'ہندوستان میں اردو کا عروج و زوال'، 'دکنی یا اردوئے قدیم'، 'علی گڑھ تحریک، مسلم یونیورسٹی اور اردو زبان' اور 'اردو صوتیات کا خاکہ' جیسے اہم مضامین شامل ہیں۔ ایک اور اہم کتاب جو میں نے اس زمانے میں ترتیب دی، 'عیسوی خاں کا قصّہ مہرافروز و دلبر' ہے، جس کا واحد نسخہ آغا حیدر حسن مرحوم کے کتب خانے کی زینت تھا اور جو انھوں نے نہایت فیاضی سے مجھے مرتب کرنے کے لیے دیا۔ یہ شمالی ہند کی سلیس زبان میں لکھی ہوئی ایک قدیم داستان ہے۔ اس داستان کو یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ ہندی والوں کے لیے بھی قدیم ہندی کی نثر کے اوّلین نمونے کے طور پر اہمیت رکھے گی بڑی محنت سے ہندی رسمِ خط میں مع حواشی کے شائع کیا لیکن جو لوگ وجہی کی 'سب رس' کے دعویدار ہیں انھوں نے بھی اس سے اغماض کیا۔ صرف ہندی کے نقّاد رام ولاس شرما نے اپنی معرکۃ الآرا

تصنیف "بھارت کے پراچین بھاشا پری وار اور ہندی" میں ہندی کے ارتقاء سے بحث کرتے ہوئے اس سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اسی کے ساتھ آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈمی نے میرا دکنی اردو کی لغت، کا پراجکٹ منظور کیا اور مجھے ایک تنخواہ دار اسسٹنٹ بدیع حسینی صاحب کو اس کام کے لیے فراہم کیا۔ میں نے اس میں ازخود ڈاکٹر غلام عمر خاں کو شریک کیا۔ بعد کو مجھے اس سلسلے میں تلخ تجربہ ہوا۔ جب یہ کام اپنے آخری مراحل میں تھا اور میں حیدرآباد سے پرواز کرنے کے لیے پر تول رہا تھا تو انھوں نے شرپسند کالکرنی کے ساتھ یہ مشہور کیا کہ یہ سارا کام تو ان دونوں کا ہے جو مسعود حسین خاں نے ہڑپ کر لیا ہے۔ حالاں کہ عمر خاں میں اس کام کو تنہا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی اس لیے کہ وہ ہندی یا شمالی ہند کی بولیوں کے کینڈے سے قطعاً ناواقف تھے۔ میں تو ریکارڈ کی خاطر یہ تک کہنے کو تیار ہوں کہ اس لغت کی تدوین میں مجھے اپنے شاگرد و اسسٹنٹ بدیع حسینی سے کہیں زیادہ مدد ملی ہے، جن کی نظر دکنی کے محاورے پر بہت اچھی تھی۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی نے لغت کا معاوضہ بھی مجھ ہی کو دیا ہے۔

اسی قسم کے علمی اشتراک کا دوسرا تجربہ مجھے پروفیسر نورالحسن ہاشمی کی جانب سے ہوا جنھوں نے بکٹ کہانی کے تیسرے ایڈیشن میں میرا لکھا ہوا پہلے ایڈیشن کا دیباچہ حذف کر کے اپنا کام بنا لیا ہے۔ حالاں کہ بکٹ کہانی کا قدیم ترین نسخہ (نمبر ۹) جو ادارۂ ادبیات (حیدرآباد) کا مخزونہ ہے اور جس پر اس متن کی اساس ہے سراسر میرا مرتب کردہ ہے۔ اسی طرح بکٹ کہانی کے پہلے ایڈیشن کے پیش لفظ کا ایک ایک لفظ میرا لکھا ہوا ہے۔ ترتیب و تہذیب کے اس کام میں شریک غالب ہونے کے باوجود میں نے فراخ دلی سے سرورق پر اس کے مرتبین میں پہلی جگہ ان کے نام کو دی تھی۔

کئی لحاظ سے حیدرآباد کا چھ سالہ قیام میری علمی زندگی کا ایک یادگار زمانہ رہا ہے۔ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کا مجھے مکمل اعتماد حاصل رہا اس میں وائس چانسلر ڈاکٹر ڈی۔ ایس۔ ریڈی، پرنسپل اور ڈین پروفیسر عبدالقادر اور ان کے بعد سنسکرت کے پروفیسر آر نیدر شرما خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ رفقائے شعبہ نے مجھ سے مکمل تعاون کیا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر ڈاکٹر حفیظ قتیل اور ڈاکٹر رفیہ سلطانہ کا نام لوں گا جو اردو

کی پروفیسر شپ کے دعویدار رہے تھے۔ مجھ پر غیر ملکی ہونے کا لیبل بھی چسپاں نہ ہو سکا اس لیئے کہ میرے دادا فدا حسین خاں پچھلی صدی کے اختتام پر حیدرآباد جا کر بس گئے تھے اور وہاں بیگم بازار میں اپنی رہائش کے لیئے دو منزلہ بھی تعمیر کرالیا تھا۔ والد نے بھی اپنی ملازمت کا آغاز وہیں سے کیا لیکن عمر نے وفا نہیں کی۔ میرے چچا ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور بڑے بھائی امتیاز حسین خاں نے بھی نیک نامی کے ساتھ اپنی ساری زندگی عثمانیہ یونیورسٹی کی نذر کی۔ اور بڑے بھائی تو بالآخر حیدرآباد ہی کی خاک کا پیوند ہو گئے۔ حیدرآباد پہنچنے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اپنے دادا کی طرح مجھے بھی شاہ نصیر کی اس جنت میں رہ پڑنا چاہیئے۔ چنانچہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے شوہر محمود صاحب کے مشورے سے ہم دونوں نے میر عالم تالاب کے کنارے نہایت پُر فضا مقام پر دو پلاٹ خرید لیئے اور پروگرام بنا لیا کہ علی گڑھ کا مکان بیچ کر یہاں تعمیر کی جائے۔ لیکن ۱۹۶۸ء میں میری مراجعتِ علی گڑھ کے بعد یہ پروگرام منسوخ کرنا پڑا اور اس قطعہ کو فروخت کر دیا۔

- نہ صرف اپنا تحقیقی کام کرنے کے مواقع مجھے عثمانیہ میں ملتے رہے، بعض طلبہ نے میری نگرانی میں نہایت اعلیٰ تحقیقی مقالے بھی لکھے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ان میں ڈاکٹر مغنی تبسم کا مقالہ "فانی: حیات اور شاعری" اور ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کا "رشید احمد صدیقی: حیات اور شاعری"، تحقیقی ادب میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ مغنی تبسم صاحب نے اردو میں پہلی بار فانی کے آہنگ کا تجزیہ صوتیات کے اصولوں کی روشنی میں کیا، جس میدان میں میں اپنی امریکہ کی واپسی کے بعد سے کام کر رہا تھا۔ سلیمان اطہر جاوید صاحب کی بڑی سفارشوں اور مشکل کے بعد رشید صاحب کے حصار تک رسائی ہوئی اور احسان رشید صاحب کی مدد سے ان کی حیات کے بارے میں نایاب مواد حاصل کیا۔ مجھے اس بات کی تھوڑی سی خلش رہی جو کام علی گڑھ میں ہونا چاہیئے تھا وہ عثمانیہ میں ہوا۔

وجہی نے قطب مشتری میں سچ ہی کہا ہے کہ دکھن ملک بھوتچ خاصا اہے۔ یہ خاصہ کئی لحاظ سے ہے۔ اس کا سب سے دلچسپ پہلو یہاں 'ملکی' اور 'غیر ملکی' کا مسئلہ ہے۔ یوں تو مقامیت، کا شکار کسی حد تک ہر خطہ ہوتا ہے لیکن یہ جذبہ حیدرآباد میں کچھ زیادہ ہی رہا ہے۔ سقوطِ حیدرآباد سے پہلے تو یہ ایک متعدی مرض کی طرح پھیلا ہوا تھا جس کا شکار شمال سے

آئے ہوئے بڑے بڑے علماء، فضلاء اور شعراء تک ہو جاتے تھے، لیکن ۱۹۶۲ میں جب میں حیدرآباد پہنچا ہوں اس وقت تک یہ صرف اندازِ فکر کے طور پر باقی تھا۔ مجھے اس سے بھی بوجوہ سابقہ نہیں پڑا۔ اس وقت تک اس کے سیاسی اسباب ختم ہو چکے تھے۔ جامعہ عثمانیہ، عثمانیہ یونیورسٹی بن چکی تھی۔ شمال سے لوگوں کی آمد بھی ختم ہو گئی تھی۔ اب منفی جذبے کی جگہ دکن اور دکنی کے ایک مثبت تفاخر نے لے لی تھی۔ مثلاً 'دکنی زبان' اور 'دکنی ادب' کی اصطلاحوں پر اصرار تھا۔ یعنی 'دکھنی ہندی' کے اندیشہ ہائے دراز کی پیشِ نظر 'دکنی اردو' کی اصطلاح منسوخ کرنی چاہی تو اس کو بھی تائید نہیں ملی۔ 'قدیم اردو' (عبدالحق) یا 'اردوئے قدیم' (شمس اللہ قادری) کی تراکیب تو قطعاً قابلِ قبول نہیں تھیں۔ بالآخر وہی ہوا کہ ڈاکٹر بابو رام سکسینہ، شری راہل سانکرتاین اور ڈاکٹر شری رام شرما جیسے محققین نے اسے 'دکھنی ہندی' میں تبدیل کر دیا۔

تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو آصفی دور میں ملکی کی تحریک چلانے والے بیشتر خاندان شمال سے آئے ہوئے تھے کسی نے دکن کی تعریف کرتے ہوئے اُسے ریل کے تیسرے ڈبّے سے تشبیہ دی ہے جس میں ایک بار داخل ہو جانے کے بعد آپ 'اہلِ خانہ' ہو جاتے ہیں اور بعد کو آنے والوں کو آپ 'بیرون خانہ' کہہ کر ان پر دروازہ بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود خاندانِ آصفیہ غیر ملکی تھا۔ ان کے ساتھ آئے ہوئے دیگر امراء و روساء اور عسکری غیر ملکی تھے۔ ایران و عرب سے تعلق رکھنے والے خاندان غیر ملکی تھے۔ مخدوم محی الدین اور سلیمان اریب جیسے ادیبوں کے بھی آباو اجداد غیر ملکی تھے۔ فرق صرف تفاوتِ زمانی کا تھا۔ کوئی دو سو برس پہلے آیا تھا تو کوئی سو برس پہلے۔ فانی نے جو دکن ہی کے پیوند زمین ہوئے ع غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا۔ اپنے اس احساس کو زبانِ غزل میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا ہمیں
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ۱۹۴۸ء میں رسّی تو جل چکی تھی مگر 'دکنیت' کے تفاخر کی شکل میں بَل باقی تھا۔ ان حالات میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے 'آصف جاہ اوّل' تصنیف کی، پروفیسر ہارون خاں شیروانی نے تاریخِ دکن کی جلدیں لکھیں، قطب شاہیوں کی تاریخ

مرتب کی اور بانیٔ حیدر آباد، محمد قلی قطب شاہ کی حیات اور کارناموں پر سب سے مستند مونوگراف لکھا۔ میرے حیدر آباد پہنچنے تک یوسف صاحب تو علی گڑھ آچکے تھے لیکن جامعہ عثمانیہ کی باقیات میں سب سے اہم شخصیت پروفیسر ہارون خاں شیروانی کی تھی جس نے میری نسبتی عزیز داری بھی تھی۔ انھیں دیکھ کر مجھے جامعہ عثمانیہ مرحوم کی عظمت وجلال کا خیال آجاتا تھا۔ سن رسیدگی کے باوجود ان کا علمی انہماک پرانے اہلِ علم کی یاد دلاتا تھا۔ میں نے ان کی سی مرتب اور منظم علمی زندگی گزارتے ہوئے بہت کم عالموں کو دیکھا ہے جو کام ہاتھ میں لیتے اسے تکمیل تک پہنچاتے۔ میں اکثر ان کے دولت کدے پر حاضری دیتا۔ مکان کیا تھا ایک کتب خانہ تھا جس میں صبح سے شام تک پابندیٔ اوقات کے ساتھ وہ کام کرتے رہتے تھے۔ آخری زمانے میں ان کا زیادہ تر وقت تاریخِ دکن کی تالیف میں گذرتا جو وہ ڈاکٹر جوشی کے تعاون سے مرتب کر رہے تھے۔ ایک دن اچانک میرے یہاں آئے اور کہنے لگے "مسعود میاں! آپ کو میرے لیے ایک کام کرنا ہے۔ انکار نہ کیجئے گا۔" دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ تاریخِ دکن کے ازمنہ وسطیٰ کی جلد کے لیے مجھ سے دکنی اردو کے ادب پر ایک باب لکھوانا چاہتے ہیں۔ مجھے اس ذمہ داری کو قبول کرنے میں کسی قدر تامل تھا، اس لیے کہ دکنی اردو کی ادبیات کے حیدر آباد میں کچھ اور ماہر اور دعویدار موجود تھے۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ جو کام میں کر سکتا ہوں کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ بہر حال انھیں کی ہمت افزائی پر میں نے قلم سنبھالا اور اب وہ مضمون ایک ذیلی باب کی شکل میں تاریخ دکن کی متذکرہ جلد میں شامل ہے۔

شیروانی صاحب کی علمی دلچسپیاں متنوع تھیں۔ تاریخ کے علاوہ انھیں اردو زبان اور اس کے مسائل سے بھی گہری دل چسپی تھی۔ وہ انگریزی اور اردو دونوں بے تکان لکھتے تھے۔ ساتھ ہی ان کا فارسی زبان کا علم اور فارسی مخطوطہ شناسی کا ملکہ غیر معمولی تھا۔ یہ ان کی بد قسمتی ہے کہ مورخ کی حیثیت سے مورخین کے ترقی پسند گروہ نے جن کا فارسی کا مبلغ علم بس یوں سا ہوتا ہے، ان کی قدر نہ کی اور 'غیر ملکی' ہونے کے ناتے، دکن کی ساری عمر خدمت کرتے کے باوجود، وہ حیدر آباد میں یاد نہیں رکھے گئے۔ لیکن ازمنہ وسطیٰ کے مورخین کا وہ طبقہ جن کی اس دور کے بنیادی ماخذات تک رسائی ہے ان کی تصانیف کو آج بھی حوالے کی کتب کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ تاریخ کا کوئی زاویۂ نظر، علمی کمی کا بدل نہیں بن سکتا!

حیدرآباد میں بہ ہمہ وجوہ مطمئن ہونے کے باوجود علی گڑھ کی یاد اور خلش باقی رہی۔ یہ مارچ ۱۹۶۶ء میں بڑے بھائی کے اچانک انتقال کے بعد تیز تر ہو گئی۔ وہاں میرا ذاتی مکان تھا، وطنِ مالوف قائم گنج نہایت قریب تھا۔ میرے بیشتر عزیز و اقارب یو۔پی۔ اور دہلی میں بسے ہوئے تھے۔ دکن کی کشش بھائی صاحب کی طرح شاید مجھے دکن کا پیوندِ زمین بنا دیتی اگر خاتونِ خانہ یعنی میری بیوی کی مصلحت بینی آڑے نہ آجاتی۔ میرے ایک لڑکا اور چار لڑکیاں تھیں۔ لڑکیاں پریم چند کی زبان میں "گنگا جمنا کی طرح بڑھتی آرہی تھیں"۔ عمر بھر جو کمایا تھا وہ کھایا۔ ان لڑکیوں کا کیا ہوگا؟ یہ سوال مجھ سے پہلے اُن کے ذہن میں پیدا ہونے لگا۔ حیدرآباد کے معیار کا سگھڑ جوڑا کہاں سے آئے گا، جہاں لڑکیاں شادی کے ہاٹ میں بکتی ہوں وہاں ہم اپنے محدود وسائل اور اجلے خرچ کے پیشِ نظر قیمت کہاں سے چکا سکیں گے۔ ہماری فیملی پلاننگ بھی تاخیر کی شادی کی وجہ سے اچھی نہیں ہوئی تھی۔ یعنی ریٹائرڈ ہونے تک ہم زیادہ سے زیادہ دو بچوں کو لگا سکتے تھے۔ باقی تین بچیوں کا کیا ہوگا؟ ملازمت میں میری اُچھل کود نے پنشن کا حق بھی سوخت کر دیا تھا اور جو کچھ پراویڈنٹ فنڈ ملتا رہا وہ اکھاڑ پچھاڑ کی نذر ہوتا رہا۔ نجمہ ان تفکرات سے مجھے دوچار کرتی رہتیں۔ پہلے تو میں حسبِ معمول سُنی اَن سُنی کرتا رہا، لیکن تکرار میں اثر ہوتا ہے، بالآخر اس کا شکار ہو گیا۔ اِدھر علی گڑھ سے خبریں آنا شروع ہوئیں کہ وہاں لسانیات کی پروفیسری آنے والی ہے۔ لسانیات کا شعبہ نواب علی یاور جنگ کے ذہن میں بھی تھا اور جیسا کہ مجھے بعد کو ڈاکٹر ریڈی نے بتایا کہ انھوں نے مجھے واپس لے جانے کی فرمائش بھی کی تھی؛ لیکن ڈاکٹر ریڈی اس بات پر آمادہ نہیں ہوئے اور اُن سے کہا "نواب صاحب! آپ بھی عثمانیہ کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ یہاں کے شعبۂ اردو کی تاریخ بھی آپ کی نظر میں ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ مسعود حسین کو لے جا کر اس شعبے کا حشر پہلا جیسا بنا دیں۔ انھوں نے آکر اسے سنبھال لیا ہے اور میں ان کے کام سے بہت مطمئن ہوں"۔ اس کے بعد نواب صاحب نے مجھے واپس بلانے کا خیال چھوڑ دیا۔

لیکن ۱۹۶۵ء میں جب ڈاکٹر عبدالعلیم مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو چونکہ وہ سیاسی خیالات کے اختلافات کے باوجود میرے قدردانوں میں تھے، انھیں علی گڑھ سے میری ہجرت کے اسباب کا بھی علم تھا۔ پہلا کام جو انھوں نے کیا یہ تھا کہ

پرو وائس چانسلر فضل الرحمٰن صاحب سے کہا کہ مجھے خط لکھ کر دریافت کیا جائے کہ وہ علی گڑھ لسانیات کی پروفیسری پر آنے کے لیۓ تیار ہو جائیں گے۔ فضل الرحمٰن صاحب کا کہنا ہے کہ انھوں نے مجھے اس مضمون کا خط لکھا تھا، لیکن وہ مجھے کبھی نہیں ملا۔ چنانچہ علیم صاحب کی تحریک سے کافی عرصہ تک میں غافل رہا۔ جب کچھ دنوں کے بعد علی گڑھ ایک امتحان کے سلسلے میں آنا ہوا اور علیم صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے شکایت کی کہ "حضرت! اب تو آپ خط کا جواب تک نہیں دیتے" میں نے کہا کیسا خط؟ اس وقت انھوں نے تفصیل بتائی اور میرے یہ بتانے پر کہ اس قسم کا کوئی خط مجھے تا حال نہیں ملا ہے، اپنی پیش کش کو دہرایا۔ میں نے فوراً قبول کر لی، اِن شرائط کے ساتھ کہ میں انٹرویو میں حاضر نہیں ہونگا اور دوسرے یہ کہ میرا تقرر چند اضافوں کے ساتھ کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انتخابی کمیٹی کا ہونا ضروری تھا، وہ ہوئی۔ اس میں ڈاکٹر سنیتی کمار چڑجی بھی تھے۔ انھوں نے فوراً میرا نام تجویز کرتے ہوئے کہا "وہ آپ ہی کے آدمی ہیں انھیں بلا لیجیے"۔

بہت جلد مجھے تقرر کا پروانہ مل گیا۔ اس کو لے کر میں ڈاکٹر ریڈی سے ان کی کوٹھی پر ملا اور کہا کہ مجھے اُن کی سرپرستی میں یہاں ہر قسم کی آسائش اور عزت حاصل ہے لیکن میری ذاتی مجبوریاں ہیں جن کے تحت مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ بادلِ ناخواستہ انھوں نے مجھے اس کی اجازت دی اور پھر وہ گفتگو سنائی جو ان کے اور علی یاور جنگ کے درمیان میرے بارے میں ہوئی تھی، جس کا تذکرہ میں اوپر کر چکا ہوں۔

میرے تقرر کی خبر علی گڑھ میں پھیلی تو بہی خواہوں اور دوستوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ رشید صاحب نے ۱۲ر جولائی ۶۸ء کے خط میں لکھا:

"۱۰ر جولائی کا نوازش نامہ ملا۔ ہاتفِ شیراز بہت پہلے سے "یوسفِ گم گشتہ" کے کنعان واپس آنے کی بشارت دے رہے تھے۔ لیکن کیا کیجیے اس 'قمر در عقرب' یا اشٹ گرہ، کو (معلوم نہیں سنسکرت کا صحیح مترادف استعمال کر رہا ہوں یا نہیں؛ بہت دن ہوئے یہ لفظ سننے میں آیا تھا)

جس کی نحوست و نجاست یونیورسٹی پر مسلّط ہے۔ پرو وائس چانسلر صاحب سے درخواست کی ہے کہ آپ کی خدمت میں تقرر کا اطلاع نامہ (باضابطہ) جلد سے جلد بھجوا دیں تاکہ آپ یہاں پہنچنے کا انصرام بروقت اور آسانی سے کر سکیں۔ ابر و باد و باراں کی بے دریغ بخشی سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کے خیر مقدم کے لیے میگھ دوت نے حیدرآباد کے موسم کو علی گڑھ منتقل کر دیا ہو۔"

خلیق احمد نظامی صاحب نے مختصراً لکھا "حق بہ حقدار رسید۔"

بارھواں باب

علی گڑھ (۴)

(۶۸ تا ۷۳ء)

اگست ۶۸ء میں حیدر آباد کو خیرباد کہہ کر میں پھر علی گڑھ آن دھمکا۔ اس سے قبل میں اپنا مکان 'جاوید منزل' جو یونیورسٹی کے پاس کرائے پر تھا، واگذاشت کرا چکا تھا۔ حیدر آباد میں کچھ سامان اونے پونے بیچا اور باقی ایک ٹرک پر لدوا کر علی گڑھ کے لیے روانہ کر دیا۔ اس اکھاڑ پچھاڑ میں ایک بار پھر میرا کافی نقصان ہوا۔ لیکن علی گڑھ واپس آنے کی اس قدر خوشی تھی کہ اس کی پروا نہ کی۔ میرے مزاج میں ہے کہ جب کسی کام کو پورا کرنے کی دُھن سما جاتی ہے تو پھر اس میں اخراجات کی مطلق پروا نہیں کرتا۔

علی گڑھ پہنچ کر معلوم ہوا کہ لسانیات کا شعبہ صرف کاغذ پر قائم ہوا تھا۔ میرا اس کی پروفیسری پر تقرر ضرور ہو گیا تھا لیکن نہ تو طلبہ تھے نہ اسٹاف اور نہ کمرے۔ وقتی طور پر آل احمد سرور صاحب، صدر شعبۂ اردو کی عنایت سے اُن کے شعبے میں مجھے ایک کمرہ مل گیا اور پڑھانے کے لیے تاریخ زبانِ اردو کے چند گھنٹے۔ یہاں بیکار بیٹھ کر میں اکثر سوچتا کہ اگر یہ صورت چھ سال قبل نکل آتی تو میرا حشر اس کہاوت کے مطابق کہ "جاؤ پوت دکھن، یہ ہیں کرم کے پچھن"، کیوں ہوتا۔ گھر سے بے گھر ہونے کی نوبت کیوں آتی، اپنی ملازمت کی پنشن سے کیوں محروم ہوتا۔ میں ایسے کاموں میں تقدیر پر زیادہ بھروسا

نہیں کرتا۔ البتہ انسان کی تدبیر پر یقین رکھتا ہوں۔ چنانچہ ایک شخص کی ترکیب، سے ہیں دکھن اور دوسرے شخص کی "تدبیر" کے ذریعے پھر واپس علی گڑھ آیا!

اگلے سیشن یعنی ۱۹۶۹ء میں شعبۂ لسانیات کے لیے تین کمرے جنرل ایجوکیشن سنٹر میں مل گئے اور چار طالب علموں پر مشتمل ایم۔اے کی پہلی کلاس اسی سال کھل گئی۔ شعبۂ اردو سے میرے پرانے طالب علم ڈاکٹر عبدالغفار شکیل کی خدمات لسانیات کے شعبے میں منتقل کر دی گئیں۔ اگلے سال ۱۹۷۰ء میں چار نئے طالب علموں نے داخلہ لیا۔ ایک اور استاد اقتدار حسین خاں کا بحیثیت لیکچرر اضافہ ہوا۔ نئے شعبہ کی درسیات کا تمام تر رُخ ہم نے اردو زبان کی جانب رکھا کہ یہی اس کے قیام کی وجہ جواز تھی۔ جب پی ایچ ڈی میں داخلے کا سلسلہ شروع ہوا تو ایسے موضوعات کا انتخاب کیا گیا جن کا براہ راست تعلق اُردو زبان سے تھا مثلاً "سولھویں تا اٹھارہویں صدی کی شمالی ہند کی اردو کا لسانی تجزیہ"، "اردو ہندی کا تقابلی مطالعہ"، "دہلی کی کرخنداری اردو کا تجزیہ"، "دکنی اردو کا تجزیہ" وغیرہ وغیرہ میرے پرانے ساتھی ڈاکٹر انور انصاری، جو اب شعبۂ نفسیات کے صدر تھے، جنرل ایجوکیشن سنٹر کے ڈائریکٹر بھی تھے۔ جگہ کی سخت قلت کی وجہ سے ان سے شعبے سے ملحق ایک کمرے کا تقاضا کیا۔ اس میں جنرل ایجوکیشن کا کباڑ بھرا ہوا تھا۔ پہلی گفتگو میں انھوں نے اس پر ہمدردانہ غور کرنے کا وعدہ کیا لیکن اس کے بعد "بہانۂ بسیار" کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں بھی اہلِ غرض بن کر پیچھا کرتا رہا۔ اب ان سے شرفِ ملاقات تک حاصل نہیں ہوتا تھا۔ لکھنوی تکلف کے انداز میں کہلا بھیجتے، "مسعود صاحب تکلیف نہ کریں، میں خود حاضر ہوں گا"۔ اس "تکلف اور تکلیف" دونوں سے تنگ آکر میں نے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالعلیم کا رُخ کیا۔ انھوں نے طعنہ دیا کہ "وہ تو آپ کے پرانے یار ہیں"، میں نے کہا "جی ہاں! یہی تو بدنصیبی ہے، دوستی کا حجاب اکبر درمیان ہے"۔ کہنے لگے "یہاں تو ہر شخص اپنی ریاست بنائے بیٹھا ہے"۔ میں نے کہا "وائس چانسلر کا ریاست شکن، ہونا ضروری ہے"۔ میری یہ بات ان کی معمول کی گہری خاموشی میں ڈوب گئی اور میں پھر کتا رہ پر رہ گیا!

خدا خدا کر کے شعبے کی قسمت جون ۷۲ء میں پلٹی جب آرٹس فیکلٹی کی نئی عمارت

میں اس کو تیسری منزل پر چند کمرے مل گئے اور شعبہ، جنرل ایجوکیشن سینٹر سے وہاں منتقل ہو گیا۔ وہاں دو بڑے کمرے تھے۔ ایک میں سمینار لائبریری اور دوسرے میں صوتیات کی لیبارٹری قائم کی۔ سمینار کے لیے میں خود دہلی جا کر منشی رام منوہر لال کی دکان پر گھنٹوں صرف کرتا اور کتابیں منتخب کرتا۔ صوتیات کی تجربہ گاہ کے لیے ایک سینئر ٹیکنیشین مبین احمد خاں صاحب کا تقرر کرایا اور ٹیپ ریکارڈر اور ٹیپ خریدے۔

اسی زمانے میں ماورائے شعبہ بھی میری سرگرمیاں بڑھیں۔ ۱۹۶۹ء میں سرور صاحب چھ ماہ کے لیے امریکہ گئے تو مجھے انجمن ترقی اردو کا قائم مقام سکریٹری نامزد کیا گیا۔ میں نے دفتری کام کے علاوہ اس کے دو رسالے سہ ماہی 'اردو ادب' اور ہفتہ وار 'ہماری زبان' کی ادارت کا کام بھی سنبھال لیا۔ 'ہماری زبان' کے اداریوں نے مجھے اردو داں طبقے سے بحیثیت صحافی متعارف کیا۔ میرے بیشتر اداریے اردو زبان سے متعلق ہوتے جن پر مجھے مسلسل داد رشید صاحب سے ملتی۔ وہ ہر اداریے پر رقعہ کی شکل میں کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیجتے۔ میں ان کی اس حوصلہ افزائی کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتا اور میرے قلم کو مہمیز ملتی۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(۱) 'سنسکرت، اصطلاحاتِ علمیہ اور اردو زبان' (۸ر اکتوبر ۱۹۶۹ء)

"'ہماری زبان' کا پچھلے ہفتے کا اداریہ خوب تھا، ترتیب، مقدمات، عبارت اور لب و لہجہ ہر اعتبار سے، مبارک باد دیتا ہوں۔ خیال تھا کہ ملاقات ہو جائے گی تو زبانی تہنیت پیش کروں گا۔"

(۲) 'اردو ایک تہذیبی قدر اور ضرورت' (۱۲ر نومبر ۱۹۶۹ء)

" 'ہماری زبان' میں آپ کا تازہ ترین اداریہ خوب ہے عبارت کیا، اشارت کیا ادا کیا! اور یہ سب لنگوئسٹک ہونے کے باوجود!۔۔۔۔۔ اس سے قبل جتنے مضامین تھے وہ مبنی بر حقائق تھے۔ یہ ہمارے تہذیبی تقاضوں (غیرت اور حمیت) کا اقرار اور اعلان ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ کارے کردی!"

(۳) 'اردو بحیثیت ذریعۂ تعلیم' (۱۸ر نومبر ۶۹ ۱۹ء)

"پرسوں ہماری زبان میں آپ کا اداریہ (اردو ذریعۂ تعلیم) دیکھا۔ میں سمجھتا ہوں ایسے مدلّل و مسلسل مضامین، سب و شتم اور جزع و فزع سے پاک اردو کی حمایت میں کہیں اور شائع نہیں ہوئے۔"

(۴) 'اردو رسمِ خط' (۴ دسمبر ۱۹۶۹ء)

"آج ہماری زبان کا یکم دسمبر کا شمارہ ڈاک سے موصول ہوا۔ اردو رسمِ خط کے عنوان سے آپ کا اداریہ بے نظیر ہے۔ ایسے اہم اور متنازعہ فیہ مسئلے پر اس جامعیت اور قابلیت سے اتنا مختصر مضمون میری نظر سے نہیں گزرا۔ پھر اس کا سنجیدہ، شریفانہ اور علمی لب و لہجہ۔ میرے نزدیک یہ مضمون اِس موضوع پر حرفِ آخر ہے۔"

(۵) 'اردو ہے جس کا نام.....' (۱۱ دسمبر ۱۹۶۹ء)

"پرسوں ہماری زبان میں آپ کا مضمون اردو کی مرکزیت اور لامرکزیت سے متعلق پڑھا۔ جب سے آپ نے یہ اداریے لکھنے شروع کئے ہیں اردو کے معرکہ آراء مسائل پر اس اختصار و جامعیت کے ساتھ، ایسے خوبصورت اسلوب اور شگفتہ عالمانہ انداز میں کسی اور کا کوئی مضمون، کم سے کم میری نظر سے نہیں گزرا۔ مدتوں پہلے سے بھی۔

بار بار اِس قسم کے توصیفی کلمات، وہ بھی آپ کو لکھنا، کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا، لیکن جی یہی چاہتا ہے کہ آپ کا جو حق ہے وہ ہر حال میں اور ہر وسوسے و خطرے کو نظر انداز کر کے آپ کو پہنچا دینا، بہرحال اولیٰ ہے۔"

(۶) 'گر وگر نتھ صاحب اور اردو' (۱۸ دسمبر ۱۹۶۹ء)

"جب سے انجمن کا کام آپ کے سپرد ہوا ہے، ہماری زبان کے اداریے ہر اعتبار سے بڑے وقیع ہونے لگے ہیں.... ان مضامین کا مجموعہ ضرور شائع ہونا چاہیے۔" (۱)

(۷) 'اردو بہ نام ہندی' (۵ جنوری ۱۹۷۰ء)

"ہماری زبان کے سالِ نو کا آپ کا پہلا اداریہ پیشِ نظر ہے۔ جس جامعیت کے ساتھ زبان کے کتنے تاریخی لسانی اور نزاعی مسائل کو آپ نے عالمانہ حقیقت پسندانہ اور دلنشیں انداز

میں قلم برداشتہ قلم بند کیا ہے اُسے میں اظہار وابلاغ کا بہترین نمونہ سمجھتا ہوں۔۔۔۔ میرا مستقل خیال ہے کہ آپ کے اداریوں کا 'آخریں' انجمن کی طرف سے ایک مجموعہ شائع کیا جائے" (۲)

(۸) ۱۹۷۱ کی مردم شماری اور اردو ' (۴، فروری ۱۹۷۰ء)

" ہماری زبان (یکم فروری کا) کل ملا۔ شمار و اعداد کے فن یا فنوں کو آپ نے ادب کا درجہ دے دیا ہے "

(۹) ' دل اور دے ان کو۔۔۔۔' (۱۱، فروری ۱۹۷۰ء)

" اِس ذہانت اور خوش مذاقی سے، جس کا اظہار عنوان کے انتخاب اور اس طرح کی دوسری باتوں سے ہوتا ہے، میں اس کا اندازہ کر لیتا ہوں کہ لکھنے والا کس مرتبے اور معیار کا ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ انجمن اور ہماری زبان کا جو چارج آپ کو ملا ہے، اس میں اللہ کی کوئی مبارک مصلحت پوشیدہ ہے "

(۱۰) اردو: علاقائی یا دوسری سرکاری زبان ' (۱۳، مارچ ۱۹۷۰ء)

" ہماری زبان، ۸، مارچ کا اداریہ اسی اعلیٰ پایہ کا ہے جیسے آپ کے اداریے ہوا کرتے ہیں، تنقیح، توضیح، زبان اور تدبر، ہر اعتبار سے۔۔۔۔ آپ کا شمار میں اُن چند (چند سے بھی کم) لوگوں میں کرتا ہوں، جو ہندوستان میں اِن دنوں اردو کے بہترین وکیل اور سفیر کہے جا سکتے ہیں "

(۱۱) ' اردو کا محضر نامہ ' (۲۵، اپریل ۱۹۷۰ء)

" ہماری زبان کا اسپیشل نمبر تھوڑی دیر ہوئی ملا۔۔۔۔ آزادی کے بعد اردو کا یہ کاغذی پیرہن یادگار رہے گا۔ عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا "

---

(۱) و (۲) رشید صاحب کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے میرے ایک عزیز شاگرد ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے ۱۹۷۳ء میں ان اداریوں کا مجموعہ " اردو کا المیہ " کے نام سے مرتب کر کے شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع کرایا۔

اِن اداریوں کے لیے تحسینی کلمات صرف رشید صاحب تک محدود نہیں تھے۔ مفتی عتیق الرحمٰن مرحوم نے انجمن ترقی اردو کے جلسے میں کہا کہ ان سے اردو کی تحریک چل پڑی ہے۔ ایک ملاقات میں سکندر علی وجد صاحب نے، جو اس وقت ایم۔پی تھے مجھ سے کہا "مسعود صاحب! آپ کی گراں قدر تصنیف 'اردو کا المیہ'، گھر اور لوک سبھا دونوں جگہ میرے پاس رہتی ہے۔ اسی سے میں اردو کے اعداد و شمار لیتا ہوں اور اسی سے اردو کی حمایت کے لیے دلائل۔"

۱۹۷۰ء، ۷۱ء اور ۷۲ء کے تین سال میرے لیے بڑی گھما گھمی کے تھے۔ ایک نئے شعبے کی تشکیل و تدریس کی ذمہ داریاں، انجمن ترقی اردو سے انتظامی وابستگی۔ قدیم متون کی ترتیب کا تسلسل، غرض کہ نہ اپنی صبح تھی اور نہ ہی شام۔ اسی زمانے میں میں نے شمالی ہند کے ایک قدیم متن روشن علی سہارنپوری کے عاشور نامہ کو مرتب کیا جو ۱۶۸۸ء کی تصنیف ہے اور جس کا واحد نسخہ رضا لائبریری، رام پور کا مخزونہ ہے۔ اس کا فوٹو عکس مجھے سید سفارش حسین صاحب نے لاکر دیا تھا اور جب وہ خود اس سے عہدہ بر آنہ ہو سکے تو مجھے اس کی جانب مائل کیا۔ میں نے سال بھر کی محنت کے بعد اس کی ترتیب و تدوین مکمل کرلی۔ جب میں نے خواہش ظاہر کی کہ اس کے مؤلفین میں ان کا نام بھی شامل کیا جائے تو بولے "اس میں میرا کیا ہے" ترتیب و تدوین آپ کی، پیش لفظ آپ کا۔ میں نے تو صرف خدمت کی ہے۔" کتاب شائع ہوتے وقت میں نے مولفین میں ان کا نام، ان کے یہ کہنے کے باوجود شامل کیا۔ علمی کاموں میں یہ فیاضی میرا ہمیشہ کا وطیرہ رہا ہے۔ حالاں کہ اس قسم کے اشتراک کے دو تلخ تجربے مجھے ہو چکے ہیں۔ ایک ڈاکٹر غلام عمر خاں سے، "دکنی اردو کی لغت" کے سلسلے میں، جن کی تفصیل میں نے کسی اور باب میں دی ہے اور دوسرا پروفیسر نور الحسن ہاشمی سے جن کے ساتھ بکٹ کہانی کی تدوین میں، میں شریکِ غالب کی حیثیت رکھتا تھا لیکن میرا حشر بقولِ غالب ع

"کہ جو شریک ہے میرا شریکِ غالب ہے"

ہوا۔ میں نے شریکِ غالب ہوتے کے باوجود مولفین میں ان کا نام اوّل رکھا۔ لیکن اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کراتے وقت انھوں نے میرے مقدمہ کا بیشتر حصہ اس سے

عارج کرکے آخر میں صرف اپنا نام رکھا!

میں اب عمر کے چوّن سال پورے کر چکا تھا۔ باوجود مرتب زندگی اور احتیاط کے بہر حال کام کی زیادتی سے اب جسم ٹوٹنے لگا تھا۔ جنوری ۳، ۱۹۷۰ء کو جب میں رات کی گاڑی سے لکھنؤ جانے کی تیاری کر رہا تھا تو معلوم ہوا کہ زمین پاؤں کے نیچے سے سرک رہی ہے، اور دل بیٹھا جا رہا ہے۔ شدید کمزوری کا دورہ پڑا۔ فوراً میرے ہم زلف ڈاکٹر حسین احمد، جو بچوں کے ڈاکٹر ہیں، اس ادھیڑ عمر کے ناتواں کو دیکھنے آگئے۔ ان کے توسط سے ڈاکٹر گپتا کو جواہر لال میڈیکل کالج میں دکھایا۔ ہر قسم کے ٹیسٹ تجویز ہوئے۔ E. C. G. ہوا۔ بعد کو تشخیص ہوئی کہ خون میں شکر کی زیادتی اور فربہی کی وجہ سے یہ دورا پڑا تھا۔ غذائی احتیاط اور بندشیں سخت کر دی گئیں۔ کچھ عرصے کے لیئے لٹا دیا گیا اور حکم ملا کہ بالائی منزل کی رہائش چھوڑ کر پلنگ اور بستر نیچے لایا جائے۔ کھوڑ میں کھاج یہ ہوئی گھٹنوں میں درد رہنے لگا۔ ہڈیوں کے ڈاکٹروں، ڈاکٹر عباس اور ڈاکٹر صادق کو دکھایا۔ صادق صاحب نے کمال صفائی سے کہا "ڈاکٹر صاحب ہم لوگ آپ کا علاج کر سکتے ہیں لیکن اس مرض میں مکمل شفا ناممکن ہے"۔ میڈیکل کالج سے یہ سن کر بہت نڈھال تھا، اس لیئے کہ میں اپنے پاؤں کو قلب سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ بہر حال اب میری دوڑ قلب اور ہڈیوں کے ماہرین کے درمیان تھی۔ ایک اعتبار سے جواہر لال میڈیکل کالج کا قیام، علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کے لیئے ایک نعمت سے کم نہیں۔ میں اس نعمت سے بارہا بہرہ ور ہوا ہوں۔

میں نہایت پکّے ارادے کا انسان ہوں، بہ شرطیکہ کسی قسم کی چنوتی کا سامنا ہو۔ زندگی میں عموماً کترا جانے کا قائل ہوں لیکن جب مقابلہ آجاتا ہے تو ڈٹ کر کرتا ہوں۔ جب ہڈیوں کے ڈاکٹر صاحبان نے مایوسی کا چیلنج پیش کیا تو میں نے طے کر لیا کہ میں اس کا مقابلہ کر کے رہوں گا۔ اس کے بعد وزن کو کم کرنے کا ایک باقاعدہ پروگرام بنایا اور غذا کے سلسلے میں اس قدر احتیاط کی کہ کوئی صوفی یا سادھو بھی کیا کرے گا۔ چند مہینوں میں ۱۵ کلو وزن کم کر لیا۔ رفتہ رفتہ پابندی سے ٹہلنا اور ہلکی ورزش بھی شروع کر دی۔ قبلہ قلب کی جانب سے تو مطمئن ہو چکا تھا، غذا اور ورزش کی احتیاط و پابندی نے پاؤں

کا بھی مزاج ٹھیک کر دیا۔ وزن کم ہو جانے کی وجہ سے جوانی کے خط و خال اُبھر آئے۔ طبی مشورے پر میں بالائی منزل سے نیچے آگیا تھا۔ اس سے مجھے سخت کوفت تھی اس لیے کہ میرا کتب خانہ بالائی پر نیچے آگیا تھا، جس کا نقشہ مکان تعمیر کرتے وقت میں نے خود بنایا تھا۔ اس کی صدر کھڑکی کھلے میدان کی جانب کھلتی تھی جہاں سے میں، اقبال ہال بننے تک، مسلم یونیورسٹی کے قبرستان کا نظارہ کر سکتا تھا۔ یہاں پر پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر عمر الدین جیسی ہستیاں ابدی نیند سو رہی ہیں۔ میں لکھنے پڑھنے سے تھک کر جب قبرستان کی جانب نظر اٹھاتا تو پردۂ خیال پر رشید احمد صدیقی مرحوم کی تصویر اُبھر آتی تھی:

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں، وہ جا رہے ہیں

نیچے کی منزل میں آکر میں اپنے گھر میں اجنبی بن گیا تھا، حالاں کہ وہاں میری بیوی بچیاں سب تھیں۔ تاہم زندگی کو با ہمہ اور بے ہمہ گزارنے کی جو عادت ابتدا سے پڑی تھی اس میں کسی تبدیلی کو برداشت کرنا میرے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔

صحت یاب ہونے کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا اپنا پلنگ اور بستر اوپر کی منزل پر لے گیا جہاں میری رفیقِ نازنینانِ حرم تھیں، زینے پر بے تکان چڑھنے لگا۔ قلب، قدم کا اور قدم قلب کا ساتھ ایک آہنگ کے ساتھ دینے لگے اور بقدر ۱۵ کلو سبک سار ہو جانے کی وجہ سے جسم میں پھرتی آ گئی۔

رشید صاحب نے مجھے پھر سے تندرست پاکر جامعہ اردو کا جُوا میرے کاندھوں پر لاد رکھا۔ جنوری ۷۲ء میں ان ہی کی تحریک سے میں شیخ الجامعہ اور ڈاکٹر رفیق زکریا امیرِ جامعہ منتخب ہوئے۔ ابھی میں جامعہ اردو کی ذمہ داری پوری طرح سنبھال بھی نہیں پایا تھا کہ ستمبر ۷۳ء میں میرا انتخاب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ہو گیا۔ جب میں رشید صاحب سے "آشیرواد" لینے کے لیے پہنچا اور شکایت کی کہ آپ نے ایک پٹھان کو شیخ بنا دیا اور اب نواب صاحب چھتاری اور جسٹس ہدایت اللہ

نے اسے "ڈبل شیخ" بنا دیا، تو کہنے لگے اب لطیفے کو زیادہ سنگین نہ بنائیے اور جامعہ ملیّہ کی خدمت کے لیے کمربستہ ہو جائیے۔ جامعہ کا آپ پر کئی طرح سے حق ہے۔

جامعہ ملیہ کی وائس چانسلری پر میرا انتخاب کس طرح عمل میں آیا۔ اس کی تفصیل میں نے کسی اور باب میں دی ہے۔

لیجیے ایک بار پھر بنجارا لاد چلا۔ پہلے مکان کے لیے کرایہ دار کی تلاش ہوئی وہ بھی ایک سرکاری دفتر کی شکل میں مل گیا۔ کچھ سامان ساتھ لیا اور باقی کو مکان کے دو کمروں میں بند کیا اور چل دیا۔

مسلم یونیورسٹی سے میرا تعلق قائم رہا اس لیے کہ جامعہ ملّیہ میں ۵ سال کے ڈپوٹیشن پر گیا تھا۔ دوسرا تعلق جامعہ اردو کا رہا۔ جامعہ اردو کی مجلس عام نے میرا تعلق اس سے نہیں ٹوٹنے دیا اور مجھے ایک بار پھر ۷۳ء میں شیخ الجامعہ منتخب کر لیا۔ البتہ مقامی طور پر نگرانی کے لیے میری تجویز پر ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی کو نائب شیخ الجامعہ بنا دیا گیا۔ میں ہر مہینے ایک یا دو بار آتا جاتا رہا۔ الحاج عبید الرحمن خاں شروانی اعزازی خازن کی حیثیت سے پہلی بار ۷۳ء میں منتخب ہوئے۔ وہ عرصے تک مسلم یونیورسٹی کے اعزازی خازن رہ چکے تھے اور مالیات کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ ان کا عام رجحان کفایت اور بچت کی جانب تھا۔ وہ خاندانی رشتے کے حوالے سے مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور اسی نسبت سے میں ان کا احترام کرتا۔ ہر بڑے خرچ پر ان کا کفایتی نوٹ لگانا ضروری تھا اس لیے کہ ان کے خیال میں اس کے بغیر کسی ادارے میں خازن کی وجہ جواز کیا ہے۔ چوں کہ وہ اس حیثیت میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ بھی برسوں کام کر چکے تھے اور ان کے بڑے مداح تھے، لطف لے کر سناتے کہ جب میں کسی خرچ پر اپنا کفایتی نوٹ لگاتا تو ذاکر صاحب کہتے: "شیروانی صاحب آپ کا اعتراض سر آنکھوں پر لیکن کام بھی ہونا ہے، اس لیے اب آپ ہی اس کے لیے راہ نکالیے۔ اور اس کے بعد میں "ہرا ڈال اور لال نکال" کے جادو سے خرچ کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ پیدا کر دیتا۔

سنانے کو یہ قصہ مجھے سنا گئے، اب میرے ہاتھ ایک ایسی جادو کی چھڑی آ گئی

کہ میں ذاکر صاحب کے حوالے سے اعتراض کرنے والے پر اعتراض کو زائل کرنے کی ذمہ داری ڈال دیتا اور وہ اپنے قلم سے اپنے اعتراض کو کاٹ دیتے۔ اس طرح بات بھی رہ جاتی اور کام بھی ہو جاتا۔

ع ہمارا کام ہوا اور تمھارا نام رہا

اردو کو میں نے پیشے کے طور پر اختیار کیا تھا، اب وہ میرا مقدّر بنتی گئی۔ ہماری زبان کے اداریے لکھتے وقت اس کی تاریخ اور تشکیل کے ساتھ ساتھ اس کی تقدیر پر بھی سوچنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ہر ہر قدم پر اس زبان کے ساتھ کیا کیا بے انصافی کی جا رہی ہے۔ میں ہندی کا کبھی مخالف نہیں رہا، میں نے اس زبان کو بڑے چاؤ سے اس زمانے کے علی گڑھ میں سیکھا جب پنڈت رام سروپ شاستری کو ہندی کے طالب علم کی تلاش ہوتی تھی اور آفتاب ہاسٹل سے چپراسی بھیج کر بلایا جاتا تھا۔ ہندی شاعری سے ہمیز پا کر پہلے پہل مجھے گیت نگاری کی تحریک ملی۔ لیکن آزادی ملنے کے بعد سے ہندی والوں کا جو رویہ اردو کی جانب رہا ہے اس نے بہت سی اچھی چیزوں میں میرے ایمان کو متزلزل کر دیا ہے۔ ریاستی حکومتوں نے (خاص طور پر اتر پردیش میں) اس کا تعلیمی نظام درہم برہم کر دیا۔ مردم شماری میں اس کے اعداد و شمار طرح طرح کی ترکیبوں سے گھٹا کر لکھے جانے لگے۔ اتر پردیش اور بہار میں اردو بولنے والے اتنے بھی نہیں درج کیے گئے جتنے کہ مسلمان ہیں! ووٹ حاصل کرنے کی خاطر ہر الکشن سے پہلے جھوٹے وعدے کیے گئے۔ اردو والوں سے کہا گیا کہ جب ہر ریاست کے مسلمان وہاں کی زبان اپنا چکے ہیں تو ہندی کے علاقے کے مسلمان ہندی کو کیوں نہیں قبول کرتے۔ آج ملک کی 'ایکتا' اور 'اکھنڈتا' کا کس قدر ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے لیکن اس کے سب سے بڑے دشمن خود ہندی والے ہیں جنھوں نے ملک کی 'ایکتا' اور ہندی زبان کو لازم و ملزوم سمجھ لیا ہے۔ خالصتان کی تحریک کا یہ رنگ نہ ہوتا اگر ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں پنجاب کے ہندوؤں نے اپنی مادری زبان پنجابی کو اپنانے سے انکار نہ کر دیا ہوتا۔ جب یہ صورت نہ چل سکی تو یہ لا یخ دیا گیا کہ زبان پنجابی

رہے لیکن اس کے لیے رسمِ خط دیوناگری تسلیم کیا جائے۔ اردو کے لیے دیوناگری رسمِ خط کی تحریک یہاں بھی چلائی گئی۔ بہار میں شری جگن ناتھ مشرا نے ریاست کے لسانی ایکٹ میں ترمیم کرا کے جب اردو کو بھی ثانوی زبان کی حیثیت سے داخل کرا دیا تو ہندی کے دانشور (دائیں اور بائیں بازو دونوں طرف کے) بلبلا اٹھے۔ مہا دیوی ورما اردو کے خلاف میدان میں کود پڑیں۔ امرت رائے نے اردو کو ایک لسانی انحراف بتایا، جو دکّی کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور ما قبل دکّی کے ادب کو 'ہندوی' کا نام دے کر ہندی تاریخ ادب کی کڑی بنا دیا۔ ترقی پسند دانشور نامور سنگھ اور ترقی پسند مصنفین نے اردو کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا بلکہ اسے ملک کے لیے بدنصیبی بتایا۔ ڈاکٹر گیان چند جین سے اشارہ پا کر امرت رائے نے اردو کو دستور کے آٹھویں شیڈول میں شامل کرنے کو پہلی لسانی بھول بتایا۔

اس کا جواب صرف یہ ہے کہ 'ذرا تلخ تر' اور گام را تیز تر' کر دیا جائے۔ اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ اردو اس ملک کی سیکولرزم کی ایک نشانی ہے اور اگر اس کے چاہنے والوں میں 'چند' بھی نہ رہیں تب بھی مسلمانوں کی تہذیبی ضرورت کا تقاضا ہے کہ اسے برقرار رکھا جائے۔

میں نے اس دوران اردو سے متعلق جو مضامین لکھے ان میں بار بار کہا کہ تاریخ کے بعض ادوار میں زبان، عقیدہ سے بھی زیادہ کسی جماعت کے تشخص اور بقا کے لیے اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ خود اردو والے اپنے لیے اس کو ایک 'قدر' تسلیم کریں۔ جب یہ ان کے لیے 'قدر' کا حکم رکھے گی تو اس کی تعلیم و ترویج اُن کا وظیفہ بن جائے گا۔ اردو کے زوال کی ذمہ داری بہت کچھ اغیار پر ہے۔ لیکن تھوڑی بہت خود اردو بولنے والوں پر بھی ہے جس کی انجمنیں، بیورو اور اکادمیاں فروعی کاموں کو اس کا اصل کام سمجھتی ہیں۔ ہم 'سنگ و خشت' کے لیے مرے مٹتے ہیں اور 'حرف و صوت' کو لائقِ اعتنا تک نہیں سمجھتے۔ کیا مسلمانوں میں کوئی پنڈت آنند نرائن مُلّا جیسا موجود ہے جو ان کی طرح یہ کہہ سکے:

"میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن اپنی مادری زبان نہیں چھوڑ سکتا۔"

اردو کے بارے میں میرے تلخ لہجے سے بعض دوستوں کو یہ شبہ ہوا کہ میں اپنی سیکولرزم کی ڈگر سے ہٹ گیا ہوں۔ میں بہ بانگِ دہل اعلان کرتا ہوں کہ میں نہ تو فرقہ وارانہ ذہنیت رکھتا ہوں اور نہ مولویانہ ذہن۔ میں مُلّا ہوں لیکن پنڈت آنند نرائن جیسا اُردو کا مُلّا۔ میں نے جب اپنے اداریوں کے مجموعے "اردو کا المیہ" کا انتساب ان الفاظ میں کیا:

"فریدہ، نادرہ، شاہدہ، زیبا
اور اُن جیسی لاکھوں اردو کی بیٹیوں کے نام جو اپنی مادری
زبان سے محروم کر دی گئی ہیں۔"

تو میرے دوست اور اردو کے قدیم خدمت گزار سری نواس لاہوٹی نے اشارۃً کہا کہ آجکل آپ بہت تلخ نوا ہو رہے ہیں۔ میں نے کہا کسی بھی جماعت کے لیے "زبان کشی"، ہر قسم کی "کشی" سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس طرح آپ ایک نسل کو گونگی بہری بنا دیتے ہیں۔ یہ ہماری بے بسی کی انتہا ہے کہ ہم اپنے بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم نہیں دے سکتے۔ ہم انگریزی اور ہندی سیکھنے کے خلاف نہیں لیکن یہ دونوں مادری زبانیں نہیں ہیں۔ مادری زبان میں اپنے بچوں کو تعلیم دینا ہمارا دستوری حق ہے۔ اس دستوری حق کو قانونی حق میں تبدیل کرنا ضروری ہے۔

اردو کے سلسلے میں جو انصافی اِس ملک میں ہو رہی ہے اُس نے میری قوم پرستی کی بنیادوں کو ہلا دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ نہ میرے حق میں مفید ہے اور نہ میرے وطن کے حق میں۔ میں اسے ہندی والوں کی کم نظری اور تھڑدلی سمجھتا ہوں کہ وہ ہندی کی ترویج کے لیے "اردو کشی" کو ضروری سمجھتے ہیں۔ انھیں ابھی تک غالباً اپنی زبان پر مکمل بھروسہ پیدا نہیں ہوا ہے۔ وہ اس سے بھی بے خبر ہیں کہ "اُردی" (اُردو + ھندی) جنوبی ایشیا میں لسانی ابلاغ کا سب سے بڑا ذریعہ بن چکی ہے جس کی تگ و تاز پاکستان (پاکستان و ہند) تک محدود نہیں بلکہ وہ برِصغیر کی حدود سے باہر نکل کر سنگاپور، اور عدن اور پورٹ سعید تک پہنچ چکی ہے۔ یہ ایک لسانی "دو مُنہی" ہے جس کے دونوں روپوں کا برقرار رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ یہ دنیا کی پانچویں عالمی زبان کی حیثیت سے اپنا مقام لے سکے۔

دراصل ہندی والے صرف اُردو سے خائف نہیں۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں۔ تامل، ملیالم، تلگو، مراٹھی، بنگالی، پنجابی وغیرہ کی بڑھتی ہوئی یلغار سے بھی لرزاں و ترساں ہیں۔ اِن سے تو زور نہیں چلتا، بے چاری اردو کے کان اینٹھنے لگتے ہیں۔ کاش وہ تاریخِ عالم کے اِس سبق سے آشنا ہوتے!

ع خدرا اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

تیرھواں باب

جامعہ ملیہ اسلامیہ (۲)

(۷۳ تا ۷۸ء)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مدرسۂ ثانوی کا ایک فرار شدہ طالب علم جب چالیس سال کے طویل وقفے کے بعد ۳ رنومبر ۱۹۷۳ء کو اس کے سربراہ کی حیثیت سے وہاں پہنچا تو اُس کے کچھ عجب طرح کے ملے جلے جذبات تھے۔ کچھ اس وجہ سے اور کہ جس کرسی پر میں وہ بیٹھ رہا تھا اس پر اس کے چچا ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۹۲۶ تا ۱۹۴۸ء براجمان رہ چکے تھے۔ اِس کرسی تک پہنچانے میں جامعہ ملیہ کی ثلیث کے ایک رکن ڈاکٹر سید عابد حسین کا دستِ غیب تھا۔ وہ میرے بارے میں پروفیسر محمد مجیب کی ۱۹۷۳ء میں مہلک بیماری کے بعد سے سوچ رہے تھے۔ جامعہ ملیہ کے امیرِ جامعہ جسٹس ہدایت اللہ سے خط و کتابت کے ذریعے مجھے متعارف کر رہے تھے اور جب انھیں معلوم ہوا کہ جسٹس صاحب نے نواب صاحب چھتاری کو سلیکشن کمیٹی کا صدر نامزد کیا ہے تو انھوں نے براہِ راست ان کو بھی لکھا۔ نواب صاحب مجھ سے پہلے سے واقف تھے۔ ان کا ذہن از خود میری جانب کام کر رہا تھا۔ عابد صاحب کی سفارش نے اس کی تصدیق کر دی۔

ایک روز صبح صبح جب نواب صاحب کے چھوٹے صاحبزادے، ابن میاں (ابن سعید خاں صاحب) میرے ہاں اچانک موٹر پر پہنچے تو مجھے تعجب سا ہوا۔ میں نے پوچھا خیریت تو

ہے؟ کہنے لگے نواب صاحب کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ کل جسٹس ہدایت اللہ صاحب کا فون آیا تھا۔ اُنھوں نے نواب صاحب کو جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر کی انتخاب کمیٹی کے لیے صدر نامزد کیا ہے۔ نواب صاحب نے اسے قبول کر لیا ہے۔ ٹیلیفون کرنے کے فوراً بعد آپ کا نام ان کی زبان پر آیا اور مجھ سے پوچھا کہ وہ کیسے رہیں گے۔ میں نے کہا بہت اچھے رہیں گے لیکن خود ان کی مرضی تو معلوم ہو جائے۔ فرمایا تم ہی یہ کام کرو۔ اس لیے اب آپ کا منشا لینے کے لیے آیا ہوں۔ انتظامی معاملات میری سرشت سے بعید تھے لیکن کچھ نواب صاحب اور عابد صاحب جیسے بزرگوں کی دلچسپی اور کچھ جامعہ ملیہ سے میری قدیم وابستگی، بغیر زیادہ غور کیے 'ہاں' کر دی۔ اب مجھے جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر منتخب ہو جانے کا یقین ہو گیا۔

اس سلسلے میں یہاں ایک لطیفہ بیان کرتا چلوں۔ اس کے راوی سید سفارش حسین صاحب تھے جن کو کرنل بشیر حسین زیدی صاحب کے مزاج میں بڑا درخور تھا۔ اوکھلے میں مقیم ہونے کی وجہ سے وہ اُن کے یہاں ہمہ وقت کے حاضر باش تھے۔ کچھ مشترک علمی دلچسپیوں کی وجہ سے میری بھی ان سے اچھی خاصی ملاقات تھی، اس لیے جب بھی وہ علی گڑھ آتے تو مجھ سے ضرور ملتے۔ ایسی ہی ایک ملاقات میں انھوں نے مجھے روشن علی کے عاشور نامے کی فوٹو نقل عنایت کی تھی۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے "بھئی ڈاکٹر! آپ کے بارے میں آسمانوں میں مشورے ہو رہے ہیں"۔ میں نے کہا "یعنی چہ"۔ کہنے لگے عابد صاحب اور سیدین صاحب دونوں کا خیال ہے کہ پروفیسر مجیب کے بعد آپ جامعہ ملیہ آجائیں۔ البتہ زیدی صاحب آپ کے بارے میں کچھ تحفظاتِ ذہنی رکھتے ہیں۔ ایک دن جب آپ کا تذکرہ اُن سے آیا تو کہنے لگے "میں انھیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ بڑی صلاحیت کے آدمی ہیں۔ بس یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر یوسف حسین کے بھتیجے ہیں"۔ ڈاکٹر یوسف حسین کی جانب اس اشارہ کا پس منظر یہ تھا کہ جب وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور یوسف صاحب پرو وائس چانسلر، تو دونوں میں شدید اختلاف ہو گیا تھا اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ انھوں نے یوسف صاحب سے استعفیٰ طلب کر لیا تھا۔ اس کے بعد سے ان کی رائے یوسف صاحب کے بارے میں اچھی نہیں رہی تھی۔ سفارش صاحب جب اپنی بات کہہ چکے تو میں نے نہایت عاجزانہ انداز میں کہا "سفارش صاحب!

آپ زیدی صاحب کے مقربینِ خاص میں ہیں کیا یہ ممکن نہیں ہو گا کہ ان کے اس اندیشے کے بارے میں میرا جواب ان کے کانوں تک پہنچا دیں"؟ بولے کیا؟ میں نے کہا "یہی کہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا بھی بھتیجا ہوں"۔ سفارش صاحب یہ سن کر پھڑک گئے۔ زیدی صاحب سے جا کر کہا میں نے پوچھا "زیدی صاحب کا جواب؟" کہنے لگے "لاجواب"!

ہاں، تو ۳/ نومبر ۷۳ء کی دوپہر جب میں جامعہ ملیہ پہنچا تو یادوں کا ایک ہجوم تھا، میری رہائش کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین کا ذاتی مکان کرائے پر لے لیا گیا تھا، اس لیے یادوں کا ہجوم اور بڑھ گیا۔ میں نے چاروں طرف نظر ڈالی اور جامعہ میں آشنا چہروں کی تلاش کی۔ ڈاکٹر سید عابد حسین سامنے کے مکان میں مقیم تھے۔ اُن کے یہاں ایک سے زائد بار حاضری دی اور نیک و بد، سمجھا۔ میرے اسکول کے استاد اور دارالاقامہ کے نگراں ارشاد الحق صاحب حیات تھے لیکن بسترِ مرگ پر ان کے یہاں حاضری دی۔ بڑی محبت سے پیش آئے اور اپنی اس نیت کا اظہار کیا کہ میں کسی دن ان کے یہاں آکر کھانا کھاؤں۔ میں نے کہا "آپ اچھے ہو جائیے، کھانے کے بہت سے مواقع نکلتے رہیں گے"۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا اور وہ جلد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ابتدائی اسکول کے سابق استاد عبدالغفار مدھولی صاحب کے یہاں گیا۔ وہ دمے کے پرانے مریض تھے لیکن اردو پڑھانے کے اپنے تعلیمی تجربات سے اب تک دست بردار نہیں ہوئے تھے۔ دفتر میں اپنے پرانے ساتھیوں میں سے شفیع الرحمن صاحب اور عبداللطیف اعظمی صاحب کو پایا۔ شفیع الرحمن صاحب، ارشاد الحق صاحب کے بھانجے تھے اور میرے زمانے میں خاکسار منزل کے ایک کمرے میں خاندان کے چند اور دیچا بیچے، کے ساتھ ایک بُوا کی نگرانی میں رہتے تھے میں انھیں اس وقت سے جانتا تھا۔ اس وقت وہ جامعہ ملیہ کے رجسٹرار تھے۔ عبداللطیف اعظمی صاحب شیخ الجامعہ کے سکریٹری کی حیثیت سے پروفیسر محمد مجیب سے مجھے ایک طرح کے 'ورثہ' میں ملے تھے۔ جامعہ ملیہ ہی کی پیداوار تھے اور ان سے بھی میری پرانی واقفیت تھی۔ اسمٰعیل خاں صاحب سے ملاقات ہوئی جو میرے

اسکول کے ساتھیوں میں تھے اور اس وقت ٹیچرز ٹریننگ کالج میں استاد تھے۔ اُن کے چھوٹے بھائی آزاد رسول صاحب سے بھی میں اسی وقت سے واقف تھا۔ اب وہ مدرسۂ ابتدائی کے نگراں تھے لیکن کسی اور ہی عالم میں رہتے۔ بچوں کی تربیت سے زیادہ ان کا رُجحان تزکیۂ نفس کی جانب تھا۔ انھوں نے ٹین کا ایک شیڈ ڈال کر اسے محمد علی ہال کا نام دے دیا تھا۔ جب جامعہ ملیہ کی جامع مسجد کی تعمیر مکمل ہوگئی اور اس کے لیے مدرسہ ابتدائی کی جانب راستے کی ضرورت ہوئی تو اس میں محمد علی ہال آڑے آیا۔ میں نے اس شیڈ کو ہٹانا چاہا تو انھوں نے بہت واویلا مچایا' فتویٰ دیا کہ شیخ الجامعہ صاحب ایک مسجد کو ڈھا رہے ہیں۔ حالاں کہ صورت حال یہ تھی کہ اس ہال میں نماز بھی ہوتی تھی اور ڈرامے بھی کھیلے جاتے تھے۔ اس لیے میں نے اسے محض خدا کا گھر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ میرا خیال تھا اب جب کہ خدا کا بڑا گھر بن گیا ہے اس کی راہ میں جو بھی رکاوٹ ہو اسے ہٹا دینا چاہیے۔ چنانچہ احتجاج اور فتوے کے باوجود کر دم رشد اور بچوں کے لیے بڑی مسجد کا راستہ کھل گیا۔ دفتر میں سابقہ بجّو دفتری سے پڑا جو ذاکر صاحب کے زمانے سے شیخ الجامعہ کی پیشی میں تھے لیکن جن کی دلچسپی دفتر کے باہر اپنی چائے کی دکان میں زیادہ رہتی تھی۔ پیرانہ سالی کے تمام آثار نمایاں ہونے کے باوجود وہ نہ ریٹائر ہونے پر مُصر تھے۔ چوں کہ ان کی تاریخ پیدائش کا کوئی ریکارڈ دستیاب نہیں تھا اس لیے انھیں' اسی قسم کے چند اور درجۂ چہارم کے ملازمین کے ساتھ' طبی معائنہ کے سپرد کیا گیا' اور جب ڈاکٹر کی رپورٹ پر انھیں خاصی مہلت دینے کے بعد ریٹائرڈ کیا گیا تو یہ کہتے ہوئے پائے گئے "جناب جامعہ سے جو نکل گیا وہ کچھ نہ کچھ بن گیا۔ ذاکر صاحب ہی کو دیکھ لیجیے۔ ہم نے بھی اگر جامعہ چھوڑ دی ہوتی تو آج کچھ بن گئے ہوتے"۔ اسی قسم کے 'جامعی' سے سابقہ پڑنے کے بعد ہی رشید احمد صدیقی صاحب نے کہیں لکھا ہے "جب بھی میں جامعہ جاتا ہوں تو مجھے جس قدر اس کے شیخ الجامعہ کا احترام کرنا پڑتا ہے' اسی قدر اُن کے چپراسی کا۔ اس لیے کہ دونوں خادمِ ملّت ہیں!"

شیخ الجامعہ کی کرسی پر جم کر بیٹھنے کے بعد میں اکثر سوچتا تھا کہ چالیس سال کے عرصے میں جامعہ کیا سے کیا ہو گئی ہے اور میں خود کتنا بدل چکا تھا۔ اِسی زمانے

میں میں نے عبدالغفار مدہولی صاحب کی خود نوشت "اک معلّم کی زندگی" کا دوبارہ مطالعہ کیا۔ اس پر پروفیسر مجیب کا مختصر سا پیش لفظ تھا جسے بغور دیکھا۔ مجیب صاحب نے اس میں نہایت ایمانداری سے اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے خود کو جامعہ کے مقاصد اور اندازِ نظر سے ہم آہنگ نہ پاتے ہوئے بھی ع حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم پر عمل کیا ہے۔ اس کی شہادت ان کے صاحبزادے پروفیسر محمد امین نے بھی اِن الفاظ میں دی ہے :

"اُن کو اس سے مطلب نہ تھا کہ قوم کی خدمت کریں۔ ان کو اصلیت میں اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنا تھا جس کو جھیلنے سے ان کو نفسیاتی تسکین ملے۔ یہ فلسفہ بغیر حضرت عیسیٰ کی زندگی اور دستووسکی کے خیالات کے گہرے مطالعے کے، مشکل سے سمجھ میں آئے گا۔" (جامعہ، مجیب نمبر)

یہ امر واقعہ بھی ہے کہ اس ادارے سے زیادہ گہری وابستگی رکھنے والی شخصیتوں۔ یعنی ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین نے، اس کا دامن چھوڑ کر اپنے عمل کے لیے وسیع تر جولانگاہیں تلاش کر لی تھیں، لیکن اودھ کا یہ 'شیخ'، اور جاگیردارانہ مزاج سے متصف یہ مُنحنی انسان گلِ محمد کی طرح قطب بنا جامعہ میں آخر وقت تک ڈٹا رہا۔ جامعہ ملیہ کا ماحول پروفیسر مجیب کے لیے کئی لحاظ سے اجنبی تھا۔ ایک تو ان کے ذہن کی، جواہر لال نہرو کے ذہن کی طرح 'لامذہبیت' میں پرورش ہوئی تھی، جب کہ جامعہ ملیہ پر مولانا محمد علی کی اسلامیت کا ٹھپّہ لگا ہوا تھا۔ ذاکر صاحب اور عابد صاحب، اِس اعتبار سے محمد علی نہیں تھے لیکن دونوں آزاد خیال ہوتے ہوئے، اسلامیت کی چلمن کے پس پشت رہتے تھے۔ مجیب صاحب اتنا بھی نہ کر سکے۔ ان کے مذہبی افکار اور ان کی اخلاقیات جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی فضا سے بالکل مختلف تھے۔ البتہ امارت کی آن بان کا تقاضا یہی تھا کہ ؎

اُس فتنہ خو کے در سے نہ اُٹھیں گے اب اسدؔ
اِس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

مسلم یونیورسٹی اگر مسلمانوں کا 'گڑھ' رہا ہے تو جامعہ ملّیہ بھی ان کا 'نگر' ہے۔ قوم پرستی جس کی لہر پر جامعہ ملّیہ وجود میں آئی تھی، وہ بھی اس کی اسلامیت کو نہ دبا سکی۔ اس

اعتبار سے دونوں کے مسائل یکساں ہیں، یعنی ذہین اور محنتی طلبہ کی کمی اور روشن خیال اساتذہ کا فقدان۔ دونوں جگہ داویلا ہوتا ہے کہ اغیار چھائے جا رہے ہیں۔ سائنس، انجینئرنگ اور ایجوکیشن کی فیکلٹیوں میں غیر مسلم طلبہ کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ علی گڑھ کے میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں میں ہر قسم کی تدابیر کے باوجود غیر مسلم طلبہ کی تعداد کو بڑھنے سے روکنا ناممکن ہو گیا ہے۔ اعلیٰ سطح پر یہ گھٹ کر غیر مسلم بن جاتا ہے اور اسی نسبت سے اردو کی حیثیت بطور ذریعۂ تعلیم کمزور ہو جاتی ہے۔ اردو ذریعۂ تعلیم جامعہ کے اغراض و مقاصد کا ایک اہم ستون تھا۔ علی گڑھ میں اردو کی جانب سے اغماز سرسید کے آخری دور سے شروع ہو گیا تھا۔ جامعہ کا قیام جن بنیادوں پر عمل میں آیا تھا وہ بھی آزادی ملنے کے فوراً بعد مسمار ہونے لگیں۔ ان دونوں اداروں میں اسلام اور اسلامیت کی خدمت لب بہت کی جاتی ہے مگر ان کے اصلی کردار کو صرف اردو ذریعۂ تعلیم کے وسیلے سے بچایا جا سکتا تھا لیکن اس کے لیے دونوں اداروں میں قوت ارادی کمزور ہو چکی ہے اور ہم اس کے لیے طرح طرح کی تاویلیں پیش کرتے رہتے ہیں۔ روزی روٹی کا حوالہ دیتے ہیں اس لیے کہ ہم اردو کی آئینی حیثیت کو ابھی تک نہیں منوا سکے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ آئین کی رو سے ہم سرکاری امداد سے چلنے والے اداروں کو فرقہ وارانہ خطوط پر ترقی نہیں دے سکتے لیکن کون سے آئین میں لکھا ہے کہ ہم لسانی اور مادری زبان کی بنیادوں پر تعلیمی ادارے قائم نہیں کر سکتے۔

جب میں جامعہ ملیہ پہنچا تو میرے دماغ میں یہ خیالات گھوم رہے تھے۔ اسکولوں کی جانب سے قدرے اطمینان تھا کہ ان میں جامعہ کی روایات باقی تھیں، اور اردو ذریعۂ تعلیم تھی لیکن کالج کی سطح پر جامعہ کا قوام بالکل بگڑ چکا تھا۔ ہر سطح پر اردو کے ساتھ ہندی ذریعۂ تعلیم کی بیخ لگی ہوئی تھی۔ چوں کہ کالج کے درجات میں غیر مسلم طلبہ کا ہجوم تھا اس لیے یہاں بے بسی تھی۔ اردو ذریعۂ تعلیم کو ۱۹۴۷ء کی دہشت انگیزی میں ختم کر کے ہم نے ہندی کے لیے دہانہ خود کھول دیا تھا۔ حالاں کہ جامعہ جیسے اداروں میں ہندی کا مقام انگریزی جیسا ہونا چاہیے تھا یعنی ایک اہم زبان کا، جو نہایت اعلیٰ معیار سے سکھائی

جائے،، ذریعۂ تعلیم کا ہرگز نہیں۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم رو بہ زوال تھا۔ اس کی جگہ بھی اردو کو لینی چاہیے تھی۔

اردو ایم۔اے کھل چکا تھا لیکن کس مپرسی کے عالم میں تھا۔ اس کے صدرِ شعبہ ریڈر کے گریڈ میں تھے۔ اساتذہ کی تعداد اور استعداد بھی کچھ یوں ہی سی تھی۔ اتفاق سے پہلے ہی کنووکیشن میں یو۔ جی۔ سی۔ کے چیئرمین مسٹر جان کنووکیشن کا خطبہ پڑھنے کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے اپنے خطبے میں جامعہ کی توسیع کی جانب جو اشارے کیے، اس میں اِس بات پر زور دیا کہ یہاں کا شعبۂ اردو ملک میں سب سے ممتاز ہونا چاہیے، اس لیے کہ اردو زبان کی تدریس و ترویج جامعہ ملّیہ کی اساس میں ہے۔ وہ کیرالا کے ایک عیسائی قوم پرست تھے اور جامعہ جیسے قومی اداروں کی تاریخ سے بخوبی واقف تھے۔ بہار سے تشریف لائے تھے وہاں ڈاکٹر ذاکر حسین سے بھی ان کا تعلق رہا تھا۔ مجھے اُن کے خطبے سے اشارہ مل گیا۔ اس لیے چند ہفتے بعد ہی یو۔ جی۔ سی کے دفتر میں حاضر ہوا اور جامعہ کے لیے اردو کی پروفیسری کا تقاضا کیا۔ اس سلسلے میں ان کی ہمدردی دیکھیے کہ فوراً نائب چیئرمین ڈاکٹر ستیش چندر کو بلایا اور اُن کے سامنے جامعہ کے لیے اردو کی پروفیسری کی منظوری دے دی۔ یہ کام جس قدر آسانی سے ہو گیا، میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں خوش خوش واپس لوٹا اور سب سے پہلے یہ خوش خبری عابد صاحب کو سنائی۔ اب ہم دونوں کو اس جگہ کے لیے ایک فعّال شخص کی تلاش ہوئی جو جامعہ کے شعبۂ اردو کو ملک میں ایک ممتاز جگہ دینے کی صلاحیت رکھتا ہو، اس لیے کہ اس وقت کے ریڈر اور صدر شعبہ پڑھے لکھے انسان ہونے کے باوجود یہ صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ کافی غور و خوض کے بعد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ پر نظر پڑی جو اس وقت دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر تھے لیکن متنازعہ فیہ شخصیت کے مالک تھے۔ پروفیسر مجیب نے اس جگہ کے لیے ڈاکٹر گیان چند کو بھی امید دلا رکھی تھی چوں کہ جامعہ کے شعبۂ ہندی کے صدر ایک مسلمان تھے، اس لیے ہمارے لیے یہ خیال بھی دلفریبی رکھتا تھا کہ اس طرح اردو کی سیکولر حیثیت زیادہ مضبوط ہو گی، اگر جامعہ جیسے قومی ادارے میں اردو کا سربراہ ایک ہندو ہو۔ ڈاکٹر گیان چند کا نام بھی زیر غور رہا، لیکن

علمی صلاحیت رکھنے کے باوجود انھیں اردو کے خُلقیہ (Ethos) کی گوں کا نہ پایا۔ ڈاکٹر محمد حسن بھی اُمیدوار تھے لیکن ان کے بائیں بازو سے انتہائی شغف اور جوکھٹے کی فکر کو جامعہ کے ماحول کے لیے مناسب نہیں پایا۔ لہٰذا لوٹ پلٹ کر نظر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہی پر جمی، اُن کی جاہ طلب اور متنازع فیہ شخصیت کے باوجود۔ ڈاکٹر محمد حسن اس ترجیح پر سخت شاکی ہوئے اور اس کے بعد مجھے پہچاننا چھوڑ دیا۔ میں اِس قسم کی آزادی اپنے دوستوں کو ایک یا دو بار سے زیادہ نہیں دیتا۔ میرے ان کے پُرانے مراسم تھے۔ دہلی یونیورسٹی میں ریڈری کی اسامی پر ان کا تقرر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے بہت سے تحفّظاتِ ذہنی کے ساتھ میری ہی سفارش اور ذمہ داری پر کیا تھا۔ اب جو ان کی یہ شانِ بے نیازی دیکھی تو میں بھی خدا بن بیٹھا اور میں نے ان کے وجود ہی کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا۔ یہ میرے ردّ عمل ہی کا شاید اثر تھا کہ عرصے کے بعد ان کا ایک خط آیا جس میں کچھ شکایت اور کچھ اپنے رویّہ پر شرمندگی تھی وہ چاہتے تھے کہ راہ و رسم کا دروازہ پھر کھل جائے لیکن یہ اس سے زیادہ نہ کھُل سکا کہ ہم سر اور ہاتھ کی ہلکی سی جُنبش کے ساتھ ایک دوسرے کو پہچاننے لگے۔

نارنگ صاحب ایک نہایت ذہین انسان ہیں، طلاقتِ لسانی کے ماہر قلم کے قلمکار اور فعّال شخصیت کے مالک۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ بلوچستان سے ہجرت کر کے واردِ دہلی ہوئے اور یہیں انھوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم مکمّل کی۔ بلوچستان میں ان کا ماحول سرتاسر مسلمانوں کا تھا۔ جس کا اثر تا حال ان کی شخصیت سے جھلکتا ہے۔ انھوں نے آتے ہی جامعہ کے شعبۂ اردو میں جان سی ڈال دی۔ ایسے ایسے سیمنار کرائے کہ باید و شاید ملک میں ہر طرف ان کی دھوم مچ گئی۔ اسی زمانے میں مَیں نے اوکھلا روڈ پر جامعہ کالج کے سامنے ایک کوٹھی خرید کر شعبۂ اردو کو دی۔ اس کی تزئین میں انھوں نے اپنا سارا سلیقہ دکھا دیا۔ ہر طرف ان کے انہماک اور کام کا چرچا تھا بجز ایک چھوٹے سے گروہ کے جس کا تعلق بائیں بازو سے تھا اور جو نارنگ کی رسوائی پر شروع سے تلا ہوا تھا۔ جامعہ کی دیواروں پر لکھا گیا کہ وہ CIA کے ایجنٹ ہیں۔ ان کی ذاتی زندگی کے حوالے سے کردار کشی کی گئی۔ حالاں کہ ان میں سے اکثر کی ذاتی زندگی اُن سے بد تر تھی۔ اور جب دیکھا کہ اس پروپیگنڈے کا شیخ الجامعہ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو پھر شیخ الجامعہ کو

ہدف بنایا جانے لگا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نارنگ صاحب کے ایک استقبالیہ میں میں نے ان کو جامعہ میں خوش آمدید کہتے ہوئے کہا تھا "نارنگ جامعہ کے لیئے اور جامعہ نارنگ صاحب کے لیے ایک چیلنج ہیں۔ دیکھئے دونوں ایک دوسرے سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں"۔ آج اپنا وہ قول مجھے رہ رہ کر یاد آرہا تھا۔ بائیں بازو کے گروہ کے سرغنہ کالج آف ایجوکیشن کے پرنسپل ڈاکٹر سلامت اللہ تھے جو خود وائس چانسلری کے امیدوار تھے۔ مجھے شروع سے ان سے بھی نپٹنا پڑا۔ ابتدا میں مجھے جامعہ کے وسیع حلقے کی تائید حاصل رہی۔ اس لیے یہ گروہ سوائے غلط پروپیگنڈے کے اور کچھ نہ کرسکا۔ لیکن ۷۷ء میں نارنگ صاحب سے ایک بڑی چوک ہو گئی جس کا تذکرہ میں بعد کو کردوں گا، پہلے درجہ چہارم کے ملازمین کی سرگرمیوں کا حال بیان کردوں۔ ان کی ایسوسی ایشن پر ایک کلرک مصطفےٰ علی صاحب نے قبضہ کر رکھا تھا، جو اس کے فنڈ پر صبح سے شام تک سگرٹوں کا دھواں اڑاتے پھرتے اور ٹیکسیوں پر سوار وزارت تعلیم کے دفتر کے چکر لگاتے رہتے۔ میں نے اپنی عمر میں اُن سے چلتر انسان نہیں دیکھا۔ انھیں اپنی لیڈری کو قائم رکھنے کے لیئے بہت سے گُر آتے تھے۔ شروع شروع میں میں نے جامعہ اسپرٹ میں ان ملازمین کے مسائل کو ہمدردی سے حل کرنے کی کوشش کی۔ جامعہ کے محدود وسائل کے اندر ان کے جائز مطالبات کو پورا کیا۔ جو مانگیں پوری نہ کرسکا ان کے لیئے یو۔ جی۔ سی۔ کو سفارشی خطوط لکھے لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب کچھ ہی دنوں کے بعد ایک روز پھر شیخ الجامعہ کے دفتر کے باہر نعروں کا شور سنائی دیا۔ معلوم ہوا کہ مصطفےٰ علی اپنے گرگوں کے ساتھ ہنگامہ آرا ہیں اور مجھ سے ملنے کے خواہش مند۔ ان سے کہا گیا کہ صرف ۵، ۶ اراکین پر مشتمل ایک وفد شیخ الجامعہ کے دفتر میں ملنے کے لیئے آسکتا ہے۔ مصطفےٰ صاحب مسکراتے ہوئے تشریف لائے۔ انھیں آداب مجلس از بر تھے۔ اس لیئے تلخیٔ کلام کی نوبت بہت کم آتی تھی۔ انھوں نے ایک بار پھر اپنی مانگوں کو نمبر وار دُہرایا۔ میں نے کہا میں آپ کی پندرہ مانگوں میں دس پوری کرچکا ہوں باقی پانچ کے لیئے یو۔ جی۔ سی اور وزارتِ تعلیم کو لکھ چکا ہوں۔ اب کیا شکایت رہ گئی ہے۔ کہنے لگے شیخ الجامعہ صاحب اب بھی ہماری پانچ نہیں، پندرہ مانگیں ہیں۔ میں نے کہا "یہ کیونکر؟"

کہا کہ دس نئی مانگیں شامل کرکے پندرہ کی لسٹ پھر پوری کر دی گئی ہے۔ میں نے کہا "بہت خوب! یہ تو شیطان کی آنت کی طرح کبھی بھی ختم نہیں ہوں گی"۔ ہنس کر بولے "شیخ الجامعہ صاحب! ہمارا کام ہے مانگیں پیدا کرنا اور آپ کا کام ہے انھیں پورا کرنا"۔ جس دن یہ ختم ہو جائیں گی اس دن ہماری لیڈری بھی ختم ہو جائے گی۔ ایک لمحے کے لیے تو میں سکتے میں آ گیا لیکن بہت جلد سمجھ گیا اور اس کے بعد میں نے "جامعہ اسپرٹ" میں مسائل حل کرنے کے فلسفہ کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔

اب میکرا اور درجۂ چہارم کے ملازمین کے درمیان زور آزمائی کا آغاز ہو گیا۔ میں نے مجلس منتظمہ میں درجۂ چہارم کے ملازمین کے آئین میں تبدیلیاں کرا دیں، یہ دفعہ داخل کرا دی کہ ایسوسی ایشن کے عہدہ داروں کا درجۂ چہارم کے ملازمین سے ہونا ضروری ہے۔ اس طرح مصطفےٰ صاحب کی لیڈری کو ختم کر دیا۔ ان کو بامصرف بنانے اور معروف رکھنے کے لیے ان کا تبادلہ سوشل ورک سے مرکزی دفتر کے اکاؤنٹس آفس میں کر دیا۔ لیکن شورش کا سلسلہ جاری رہا اور اب وہ رور سے ڈوریاں کھینچ کر کٹ پتلیوں کا تماشا کرنے لگے۔ ملک کی بدقسمتی اور وائس چانسلروں کی خوش قسمتی سے ۱۹۷۵ء میں اندرا گاندھی نے ایمرجنسی کا اعلان کیا۔ اب ہر قسم کے احتجاجی کھیل تماشے بند تھے۔ ایک دوبار ان لوگوں نے کروٹ لینے کی کوشش کی تو اوکھلے کے تھانے دار نے بلا کر دھمکا دیا۔ اس کے بعد چوہوں کی طرح سب بلوں میں گھس گئے۔ اگلے دو سال امن سے گزر گئے۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں اچانک ایمرجنسی ختم کر دی گئی۔ دوسرے ہی روز شیخ الجامعہ کے دفتر کے سامنے نعرہ بازی ہو رہی تھی، اس بار انتقامی جذبے کے ساتھ!

اب میں "واقعۂ نارنگ" کی جانب رجوع کرتا ہوں جس کا سرا اٹھا کر چھوڑ دیا تھا۔ نارنگ صاحب کے بارے میں لکھ چکا ہوں کہ انھیں ایک خاص نقطۂ نظر کے تحت دوسرے بعض اچھے اساتذۂ اردو پر ترجیح دے کر جامعہ ملّیہ لایا گیا تھا۔ ہم لوگوں کو یہ بھی علم تھا کہ وہ ایک متنازعہ فیہ شخصیت رہے ہیں۔ وہ ایک حوصلہ مند مگر جاہ طلب انسان ہیں۔ طبیعت میں خودپسندی اور شدّت ہے۔ یہ مثبت ہوتی ہے تو وہ کارہائے نمایاں کر بیٹھتے ہیں جب منفی ہو جاتی

تو جارحانہ انداز اختیار کر لیتی ہے۔ وہ اپنے ہدف پر نظر رکھتے ہیں، تیر کیسا ہے اور کہاں سے چلتا ہے اس سے انھیں غرض نہیں ہوتی۔ اپنے مقصد کے لیئے وہ ہر قسم کے ذریعے کو استعمال کر سکتے ہیں حتیٰ کہ طلبہ تک کو۔

جامعہ میں ایک دو سال تو ان کے اچھے گزرے، صرف بائیں بازو کا گروہ ان کے خلاف پروپیگنڈا کرتا رہا۔ اب اس میں وہ لوگ بھی شریک ہو گئے جو ان کی بے پناہ توانائی اور فعالیت سے خائف تھے۔ جامعہ کے اساتذہ میں ایک طبقہ نااہلوں کا ایسا بھی تھا جو نہ خود کام کرنا چاہتا تھا نہ کسی کو کام کرنے دینے کا قائل تھا۔ ان کی قوت ان کی گروہ بندی میں تھی۔ چنانچہ عام تائید حاصل کرنے کے لیئے انھوں نے نارنگ صاحب پر اب فرقہ داریت کا الزام لگانا شروع کر دیا۔ میں ذاتی علم کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ نارنگ صاحب فرقہ وارانہ ذہن نہیں رکھتے۔ لیکن جب دیگر اساتذہ نے ان کے خلاف اس حربے کو استعمال کرنا چاہا تو پھر انھوں نے بھی اس کے استعمال میں دریغ نہیں کیا۔ جامعہ کالج میں ہندو طلبہ کا تعلق بیشتر سماج کے ان طبقات سے تھا جہاں فرقہ واریت کے جذبات عام تھے۔ وہ جامعہ کی روایات سے بھی واقف نہیں تھے، نہ اُس کے خُلقیہ سے۔ انھیں میں ایک شورہ پشت نوجوان روہتاس نامی تھا جس کا تعلق پاس پڑوس کے ایک گاؤں گُلبیا سے تھا۔ میں اُسے شورہ پشت اس لیئے کہہ رہا ہوں کہ وہ ہمیشہ جامعہ کو بدنام کرنے کے درپے رہتا۔ ایک بار اُس نے سیڑھیاں لگا کر جامعہ کالج کی تمام عمارتوں پر نعرے لکھ دیئے تھے۔ جب میں نے اس سے باز پُرس کی تو ہنس کر کہا "شیخ الجامعہ صاحب ان عمارتوں پر کئی سال سے قلعی اور رنگ نہیں ہوا ہے۔ چاہتا ہوں کہ اسی طرح ہو جائے!" خیر تو نارنگ صاحب نے سیاست کا جواب سیاست سے دینے کے لیے اُس سے اور اُس جیسے چند طالب علموں سے ربط ضبط پیدا کیا اور جامعہ میں "مسلم فرقہ واریت" کے نقطے پر دونوں ہم رائے ہو گئے۔ اس شورہ پشت نے اس کی اطلاع معاشیات کے شعبے کے (جہاں وہ طالب علم تھا) ایک مسلمان استاد انور رضا رضوی صاحب کو دی جو نارنگ صاحب کی تاک میں تھے۔ دونوں میں سانٹھ گانٹھ ہوئی۔ انھوں نے اسے امتحان میں بہت اونچے نمبر دینے کا وعدہ کیا اور اس نے نارنگ صاحب کی گفتگو کو ٹیپ کرنے کی پیش کش کی۔ چنانچہ اسے ایک نہایت اثر پذیر

ٹیپ ریکارڈر فراہم کیا گیا۔ اس نے پلان کے مطابق نارنگ صاحب کو ٹیلیفون کیا۔ گفتگو کا سلسلہ جامعہ ملّیہ سے شروع ہوا اور یہاں ہندو طالب علموں سے جو تعصّب برتا جاتا ہے اس سے ہوتا ہوا بعض اشخاص تک جا پہنچا۔ جن کے بارے میں اس نے اس انداز سے سوالات کیے کہ نارنگ صاحب کھُل گئے۔ ٹیلیفون پر گفتگو کا یہ سلسلہ تقریباً آدھ گھنٹے چلتا رہا اور ٹیپ ہوتا رہا۔ نارنگ صاحب کو یہ سان وگمان بھی نہ ہوا کہ میری صدا بندی کی جا رہی ہے۔ غرض کہ اس نے اپنے سوالات سے ان سے ایسے جوابات حاصل کر لیے جن سے ان کے دل کی بات کا پتہ چلتا تھا۔ یہ اُس نے، اس امید میں کہ اب تو مجھے بی۔اے۔ میں فرسٹ کلاس مل ہی جائے گا، اپنے معاشیات کے استاد کو لا کر دیا۔ وہ دوسرے دن فاتحانہ انداز میں میرے مکان پر آئے اور بولے "شیخ الجامعہ صاحب! میں آپ کو ایک ٹیپ سُنانا چاہتا ہوں" ٹیپ ریکارڈر ان کے ساتھ تھا۔ میں نے سنا تو حیرت میں رہ گیا۔ لیکن گولی بندوق سے نکل چکی تھی۔ اس کے بعد وہ ٹیپ جگہ جگہ سُنایا گیا۔ ٹیپ سے مزید ٹیپ بنائے گئے اور اب وہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ بڑے بڑے مجمعوں کو سنایا جانے لگا۔ مجھ سے مانگ کی گئی کہ مجلس عاملہ کا خصوصی جلسہ طلب کر کے نارنگ صاحب کو فوری طور پر معطّل کیا جائے۔ مجلسِ عاملہ کے اراکین نے بھی نارنگ صاحب کا ٹیپ سُنا۔ میں نے تجویز کیا کہ معطل کرنے کے بجائے عاملہ یک نفری تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دے۔ اس لیے واقعہ کا ثبوت تو آپ لوگوں کے پاس محفوظ ہے، نارنگ صاحب برسرِ کار رہتے ہوئے، اس پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ لیکن میری اس تجویز کو مسترد کر دیا گیا اور اب ایجی ٹیشن کی رفتار تیز تر کر دی گئی۔ میں اپنی تجویز پر اڑا رہا اور کہتا رہا کہ جامعہ برادری اس سے قبل جامعہ کی عمارتوں پر جو کچھ ان کے بارے میں لکھتی رہی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ سخت تھا جو کچھ کہ نارنگ صاحب نے جامعہ کے بعض اصحاب کے بارے میں ٹیلیفون پر کہا ہے۔

بہرحال ہنگامہ آرائی بڑھتی رہی اور اب ہمہ وقتی سیاست بازوں نے اس کا رُخ نارنگ صاحب کے بجائے میری جانب پھیر دیا۔ صدورِ شعبہ کا ایک خفیہ جلسہ ہوا جس میں میرے خلاف عدمِ اعتماد کا میمورنڈم تیار کیا گیا اور وہ اشوکا ہوٹل جا کر جٹس

ہدایت اللہ امیرِ جامعہ کی خدمت میں پیش کیا، جو اتفاق سے اس وقت دہلی آئے ہوئے تھے۔ مجھے اس وقت اس کا علم نہ ہو سکا۔ البتہ کچھ روز کے بعد جب میرا بمبئی جانا ہوا اور امیرِ جامعہ کے مکان پر "تنظیمی ملاقات" کے لیے گیا تو انھوں نے مجھے اپنے دفتر میں بلا لیا۔ جوں ہی میں سامنے کی کرسی پر بیٹھا انھوں نے دراز سے ایک فائل نکال کر دی اور کہا "آپ جب تک اس پر نظر ڈالیے، میں زیرِ قلم تحریر کو ختم کر لوں"۔ یہ وہی میمورنڈم تھا جو صدورِ شعبہ نے انھیں اشوکا ہوٹل میں دیا تھا۔ اس میں "واقعۂ نارنگ" کی تفصیل دینے کے بعد آخر میں یہ جملہ تھا "ہم لوگ شیخ الجامعہ پر اپنا اعتماد کھو چکے ہیں"۔ نیچے دستخط دیکھے تو نام بنام تھے۔ صرف میرِ کارواں، یعنی پرنسپل جامعہ کالج ضیاء الحسن فاروقی صاحب کے نہیں تھے جنھوں نے امیرِ جامعہ تک اساتذہ کی رہبری کی تھی۔ ایک دو صدورِ شعبہ کے بھی نہیں تھے۔ امیرِ جامعہ جب اپنے کام سے فارغ ہو گئے تو میں نے ان سے اس مسئلے پر گفتگو کرنی چاہی۔ انھوں نے اغماز کیا اور میمورنڈم کو اس لائق تک نہیں سمجھا کہ مجھ سے تفصیلات تک پوچھتے۔ اتنے میں بھبھکتی ہوئی کافی کے دو پیالے آ گئے اور ہم لوگ اس سے لطف اندوز ہونے لگے۔

جسٹس ہدایت اللہ کا مجھ پر اور میرا ان پر جو اعتماد تھا وہ اور بڑھ گیا۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ پونے پانچ سال کے عرصے میں، جو میں نے ان کے ساتھ گزارا، ایک بار بھی انھوں نے میرے کام میں مداخلت نہیں کی۔ حالاں کہ آجکل تو چانسلروں کا یہ معمول ہو گیا ہے کہ وائس چانسلر کی نکیل اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں "جسٹس" تھے جو معاملات سے خود کو ایک معروضی بلندی پر رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ امیرِ جامعہ شیخ الجامعہ کی مدد کے لیے ہوتا ہے نہ کہ اس کے کاموں میں روڑے اٹکانے کے لیے۔

نارنگ صاحب کے خلاف جامعہ میں تحریک جب کسی طرح ختم ہوتی نظر نہ آئی تو مجھے پولیس کے مشورے پر تین اساتذہ اور ایک طالب علم کے مچلکوں کے لیے اجازت دینی پڑی۔ اس کے بعد خدا خدا کر کے دن رات کے وہ میلے ختم ہوئے جہاں ٹیپ بجا کر نارنگ صاحب کے خلاف جذبات کو بھڑکایا جاتا تھا۔ واقعۂ نارنگ پر سب سے اچھا تبصرہ امیرِ جامعہ ہی نے کیا۔ ایک ملاقات میں کہنے لگے "مسعود صاحب! یہ پروفیسر صاحبان کتنے عقل مند لوگ

ہوتے ہیں کہ طالب علموں سے آدھ آدھ گھنٹہ ٹیلیفون پر بات کرتے ہیں اور ان کا عندیہ نہیں سمجھ پاتے ہیں۔"

ہنگامہ آرائی کی شکل تو ختم ہو گئی لیکن چملکوں کی وجہ سے میرے خلاف تحریک خفیہ انداز میں چلتی رہی۔ میں بھی اب جامعہ سے بددل ہو چکا تھا۔ جون ۷۷ء میں تو میں نے تقریباً طے سا کر لیا تھا کہ مجھے اپنی پروفیسری پر علی گڑھ واپس چلا جانا چاہیے، جس کا تذکرہ میں نے اپنے سیکریٹری عبداللطیف اعظمی صاحب سے کیا بھی تھا۔ لیکن جسٹس ہدایت اللہ صاحب کے اصرار پر اپنا یہ ارادہ تبدیل کرنا پڑا۔ مجھے سب سے زیادہ ملال اس بات کا تھا کہ جن شاخوں پر آشیانہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے۔ کچھ لوگ جو چہروں پر نقاب ڈالے ہوئے تھے، بے جھجک سامنے آگئے۔ بعض نے طلبہ کو جھڑکانا اپنا پیشہ سا بنا لیا۔ چنانچہ جب ایک بار طلبہ کا ہجوم نعرے مارتا ہوا میری رہائش گاہ کی جانب بڑھا تو یہ ان کے ساتھ تھے۔ جامعہ کے استادوں میں بعض سیہ روسیہ کار بھی تھے۔ نہایت رکیک حرکتیں کرنے والے، رسوائے زمانہ، دوسروں کی بہو بیٹی کو بہکانے اور ہر قسم کا نشہ کرنے والے۔ مجھے ان سب کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کے باوجود جامعہ کے اساتذہ اور اہلکاروں کا پرخلوص اور سمجھدار طبقہ میرے ساتھ رہا۔ انھیں کی مدد سے میں جامعہ کو اس پُر آشوب دور سے نکال سکا۔

میں نے نہ صرف شعبۂ اردو کی از سرِ نو تنظیم کی بلکہ بعض حضرات نے 'اسکولوں' کے نام پر جو چھوٹی چھوٹی جاگیریں بنا رکھی تھیں انھیں توڑ کر فیکلٹی سسٹم جاری کیا۔ اس سے بعض مفاد پرستوں پر زد پڑی۔ انھیں میں سے ایک صاحب، جن کی پہنچ وزارت تعلیم تک تھی، اس کے ڈائریکٹر تک پہنچ گئے اور ان کے کان بھر دیئے۔ چنانچہ شری اٹل بورڈیا، جو اب تک ہماری جانب نرم گوشہ رکھتے تھے اور جامعہ کی مجلس عاملہ کے نامزد سرکاری رکن تھے، ان کے بہکاوے میں آکر میری تعلیمی اصلاح کی مخالفت کرنے لگے۔ چوں کہ اس معاملے میں مجلس کی اکثریت نے میرا ساتھ دیا اس لیے اس وقت تو دال نہ گلی لیکن آئندہ چل کر جامعہ کے ہر کام میں روڑے اٹکانا ان کا معمول سا ہو گیا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ بیوروکریسی اپنی ہمہ دانی کے زعم میں کس طرح تعلیمی اداروں کا ناک میں دم کر سکتی ہے، خاص کر

اگر ان کے سربراہوں کی سیاسی پہنچ وزیرِ تعلیم تک نہ ہو۔ اس سے قبل میر اٹکراؤ، نورالحسن صاحب کے دورانِ وزارت میں ڈائرکٹر شری چٹکارا سے ہو چکا تھا، اور مجھے سید عابد حسین اور کرنل بشیر حسین زیدی کے ساتھ ان کی شکایت کرنے کے لیئے ان کے بنگلے پر جانا پڑا تھا۔ نورالحسن صاحب نے ہماری شکایتیں سن کر جہاں بہت سی بات کیں ایک دلچسپ بات یہ بھی کہی تھی کہ مقابلہ پٹھان کا پٹھان سے ہے صرف مسلم اور ہندو پٹھان کا فرق ہے۔ اشارہ تھا میرے پٹھان ہونے کی طرف اور شری چٹکارا کے صوبہ سرحد سے آئے ہوئے شرنارتھی ہونے کی جانب۔ جب شری چٹکارا ریٹائرڈ ہو گئے تو امیر جامعہ نے بھی سانس لے کر کہا: "چلیئے جامعہ کا چٹکارا سے چھٹکارا ہو گیا"۔

میری وائس چانسلری کا آخری نصف سال، یعنی ۱۹۷۸ء کا نصف اول زیادہ پرآشوب تھا۔ اس سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر علی محمد خسرو صاحب نے بڑی اچھی بات کہی تھی۔ ان کے خیال میں ہر وائس چانسلر کے پہلے ایک دو سال ہنی مون کے ہوتے ہیں۔ تیسرے سال سے خانگی زندگی کی سی کھٹ کھٹ شروع ہو جاتی ہے جو آخری سال میں شورش بن جاتی ہے۔ میں اب اپنی وائس چانسلری کے آخری سال سے گزر رہا تھا۔ ایمرجنسی ختم ہو چکی تھی۔ شر پسند اساتذہ اور درجۂ چہارم کے ملازمین دونوں مخالفت کے پلیٹ فارم پر یکجا ہو گئے تھے۔ چلتے چلتے میں نے امیر جامعہ کو خط لکھ کر، آئین کی ایک دفعہ سے فائدہ اٹھا کر جامعہ پر انکوائری بٹھا دی۔ اس کے لیے میں نے شبانہ روز محنت کر کے اپنے معتمد علیہ اسسٹنٹ شعیب احمد خاں کی مدد سے اساتذہ کی ذاتی فائلوں کا مطالعہ کیا اور فرداً فرداً مواد جمع کیا۔ ان دفینوں سے عجیب عجیب خزینے برآمد ہوئے۔ کسی نے فائل سے ہائی اسکول کا سارٹیفکٹ غائب کرا کے اپنی تاریخ پیدائش بدلوا دی تھی۔ دو استاد ایسے ملے جو ۱۹، ۱۹ سال سے پی۔ ایچ۔ ڈی میں نام کا اندراج کرائے ہوئے تھے اور ان کے قلم سے تا حال چند صفحات تک برآمد نہیں ہوئے تھے۔ ایک صاحب ہائی اسکول تا ایم۔ اے تھرڈ ڈویژن سے سرفراز تھے لیکن پروفیسر بنے بیٹھے تھے وغیرہ وغیرہ۔

جسٹس ہدایت اللہ صاحب نے سپریم کورٹ کے ایک جج مرتضیٰ فضل علی صاحب

کو انکوائری کے لیے مقرر کیا۔ ان کی کوٹھی پر میرے اور متعلقہ حضرات کے بیانات لیے گئے۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ سپریم کورٹ کا جج بھی 'آدمی' ہوتا ہے! آخر آخر میں انھوں نے انکوائری سے یہ کہہ کر کنارہ کشی کر لی کہ میں برسرِ کار جج ہوں اس لیے فیصلہ نہیں دے سکتا۔ ہدایت اللہ صاحب نے ان کے بعد سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس ایم ایم بیگ صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس کام کا تکملہ کر دیں۔ ظاہر ہے ان کو انکوائری کا جو مواد دیا گیا تھا اس کی روشنی میں وہ اپنی رائے دے سکتے تھے۔ تاہم انھوں نے بعض حضرات کو سرزنش کی اور بعض کی غلط کاریوں کو نمایاں کیا۔

ان تمام کاموں میں ۱۹۷۸ء کا نصف سال گزر گیا۔ میری وائس چانسلری کی پنج سالہ مدت ۳؍ نومبر ۱۹۷۸ء کو ختم ہو رہی تھی۔ لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ ۱۵؍ اگست میرے لیے بھی یومِ آزادی ہوگا اور میں دو سال کے بائیں تقرر پر مسلم یونیورسٹی چلا جاؤں گا۔ میں نے اس عندیے سے امیرِ جامعہ کو بھی مطلع کر دیا تھا۔ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں ایسا نہ کروں، اور کم از کم اپنی باقی ماندہ مدت پوری کر لوں۔ اس کے لیے انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر علی محمد خسرو کو لکھا یا ٹیلیفون پر بات کی۔ خسرو صاحب نے اس کی فوراً اجازت دے دی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں امیرِ جامعہ کی خواہش پوری نہ کر سکا اور ۱۵؍ اگست کی تاریخ کو آگے نہ بڑھا سکا۔

اس سے کچھ پہلے جامعہ کی مجلسِ عاملہ کا جلسہ تھا جو حالات کے پیشِ نظر میری رہائش گاہ ہی پر رکھا گیا تھا۔ اس میں جسٹس بیگ کی رپورٹ پیش ہونا تھی۔ جامعہ میں مشہور ہو گیا تھا کہ کئی اساتذہ کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔ ان اساتذہ نے اس خوف و تردّد کے پیشِ نظر میری رہائش گاہ کے سامنے ایک مظاہرے کی تنظیم کی۔ پولیس کا انتظام تھا اس لیے احاطے میں داخل ہونے کی کسی نے ہمت نہیں کی۔ برآمدے سے ہم مظاہرین کو دیکھتے رہے۔ عجب عجب چہرے نظر آئے وہ بھی جو کچھ عرصے پہلے تک میرے ساتھ سائے کی طرح چلتے تھے، وہ بھی جن کے بارے میں مجھے کہنا پڑا "تو بھی اے بروٹس!"

مجلس منتظمہ کے جلسے میں وزارتِ تعلیم کے نمائندے شری پنڈتا نے میری خدمات اور ان اقدام کو سراہتے ہوئے جو میں نے پچھلے چند سالوں میں جامعہ کے نظم و ضبط کے سلسلے میں کئے تھے، ایک تحسینی ریزولیوشن پیش کیا جو اتفاق رائے سے منظور ہوا۔ جسٹس بیگ کی سفارشات پر غور کیا گیا اور انھیں یہ کہہ کر ملتوی کر دیا گیا کہ چوں کہ وائس چانسلر جامعہ کی ملازمت سے سبک دوش ہو رہے ہیں اس لیے ان پر پھر کبھی غور کیا جائے۔ اس کے بعد وہ جامعہ کے سر دخانے میں چلی گئیں۔

جامعہ ملیہ کے دورانِ قیام جہاں اور بہت سے فائدے ہوئے مجھے بیرونِ ملک سفر کرنے کے کئی مواقع بھی ملے۔ ان میں سعودی عرب کے دو سفر یادگار رہیں۔ پہلا سفر میں نے ۱۹۷۶ء میں سرکاری حج ڈیلیگیشن کے رکن کی حیثیت سے کیا تھا۔ ڈاکٹر سید محمد، جو اس وقت محکمۂ قانون میں ریاستی وزیر کے عہدہ پر فائز تھے اس کے لیڈر تھے۔ ان کے ہمراہ ان کی دوسری نوجوان بیگم تھیں۔ اسکی ایک رکن آسام کی وزیر بیگم انورہ تیمور تھیں۔ باقی ممبران میں ریاست جموں وکشمیر اسمبلی کے ایک رکن طالب حسین صاحب اور بہار کے ایک ممبر پارلیمنٹ تھے، جو حج ڈیلیگیشن کے پیشہ ور رکن معلوم ہوتے تھے اس لیے کہ اس سے قبل بھی وہ اس حیثیت سے آچکے تھے۔ ان کے پیشِ نظر صرف 'کمانے' کا مشغلہ رہتا، ثواب نہ سہی عذاب سہی۔ ڈاکٹر سید محمد بہت خلیق مگر تند مزاج کے انسان تھے۔ جدّہ پہنچتے ہی ان کا اختلاف ہندوستانی سفیر قریشی صاحب سے ہو گیا، جو بڑھتا ہی چلا گیا۔ سفیر صاحب کو اپنے آئی۔سی۔ایس ہونے کا زعم تھا اور سید محمد صاحب کو اپنی وزارت کا۔ کسی وجہ سے وہ میرا بڑا خیال کرتے تھے اس لیے اپنے دل کی بات مجھ سے کہہ دیتے تھے۔ ادھر ہندوستانی سفارت خانے میں ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کے چھوٹے بھائی انعام الرحمٰن تھے جو سفیر صاحب کے بہت قریب تھے۔ میری ان سے پرانی واقفیت تھی۔ چنانچہ ہر روز ہم ایک دوسرے سے مشورہ کرتے اور کوشش کرتے کہ بہ نام ہندوستان دونوں میں ٹکراؤ کی نوبت نہ آنے پائے۔

مکہ مکرمہ میں وفد کے قیام کے لیے قریب کے ایک فندق (ہوٹل) میں ہمارا

ریزرولیشن تھا۔ کھانا بہت مہنگا تھا جس کے لیے ہمیں سرکاری طور پر جو بھتہ دیا جاتا تھا وہ سخت ناکافی تھا۔ آخر میں ہمیں سیدنا طاہر سیف الدین کے رباط کی فیاضی پر گذر بسر کرنا پڑا جہاں سے دونوں وقت کھانا مفت آجاتا تھا۔

اب حج کا ہنگام آگیا۔ نہ صرف حرم کے اندر بلکہ شہر مکہ میں حاجیوں کی وہ ریل پیل تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ شام کو سوق اللیل میں داد و ستد کا وہ بازار گرم ہوتا کہ معلوم ہوتا تھا حج کا اصل مقصد تجارت ہے۔ حرم کے پاس ایک پیلے رنگ کی دو منزلہ عمارت تھی جس میں اوقاف کا دفتر تھا۔ اس پر پتھر کی تختی پر کندہ تھا کہ یہ جائے پیدائش حضرت محمدؐ کی ہے۔ مجھے 'وہابیت' کا یہ رویہ دیکھ کر سخت کوفت ہوئی۔ کہاں سرکار مدینہ کا مولد اور کہاں یہ سرکاری دفتر۔ آخر ہمارا ایمان اتنا کمزور تو نہیں کہ ہم مولد رسول کی پرستش کرنے لگیں۔ مکہ کا وہ قبرستان جاکر دیکھا جہاں حضرت خدیجہ اور دوسرے اکابرین امت دفن تھے۔ سب ہموار اور بے نشان۔ طوافِ کعبہ کے لیے حرم شریف میں داخل ہوا تو توحید کے پروانوں کا وہ ہجوم کہ اللہ کی پناہ۔ ہر شخص مصروفِ طواف تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ افریقہ اور الجیریا کے چھ فٹے قوی ہیکل سورما عورتوں اور ضعیفوں کے پاؤں کچلتے ہوئے ایسے نکل جاتے تھے کہ دنیا و مافیہا کی خبر تک نہ ہوتی۔ طوافِ کعبہ کرنے کے بعد ہر شخص کا ہدف حجر اسود کا بوسہ تھا۔ کعبے کی سیڑھیوں پر غلاف کا سرا پکڑے ایک حاجب بیٹھا رہتا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ بند مٹھی اس کی طرف بڑھاتے ہیں۔ کچھ دست بدست منتقل ہو جاتا۔ اور وہ اس مومن کا ہاتھ پکڑ کر مجمع کو اپنے ہاتھ سے ہٹاتا ہوا ایک لمحے کے لیے اس کے لب سنگِ اسود تک پہنچا دیتا، جو کثرتِ بوسہ سے اب ایک کاسہ سا بن گیا ہے۔ میں نے یہ صورت دیکھی تو الٹے پاؤں پھر آیا، درِ کعبہ وا نہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ جو تماشا دیکھا اس کے باعث۔ دوسرے روز میں نے عبداللطیف اعظمی صاحب کو دہلی خط میں لکھا: ع

تماشا کا بیاب آیا تمنا بے قرار آئی

مختلف زمانوں میں حرم کی توسیع ہوتی رہی ہے۔ سعودیوں نے اسے اطالوی سنگِ مرمر سے لیس سا دیا ہے۔ معلوم نہیں اقبال کے یہاں یہ ردِ عمل کیوں کر ہوا، اس لیے کہ وہ باوجود نیت زیارت کعبہ سے مشرف نہیں ہوئے تھے۔

میں ناخوش و بیزار ہوں مر مر کی سِلوں سے
میرے لیئے مٹی کا حرم اور بنا دو!

میں نے قیامِ مکّہ کے چند روز دروں بینی میں گزارے میری آنکھیں اب اندر کی طرف کھل رہی تھیں۔ حرم کی مسجد میں اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ گھنٹوں خاموش بیٹھا رہتا۔ حرم کے آس پاس کے دوکانداروں کو دیکھتا جو دکانوں پر صرف ایک جال لگا کر نماز ادا کرنے یہاں آتے تھے۔ وہ ۔ رف فرض پڑھتے تھے اور اس تیزی سے پڑھتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ایسے ٹکریں لگا رہے ہیں۔ انھیں الفاظ بدبدانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ غالباً نماز کے الفاظ اور آیات کی سطریں پوری کی پوری اُن کے تصوّر میں آجاتی ہوں گی اس لیئے لفظ لفظ پر قدم رکھ کر چلنا اس قدر مختصر مدت میں محال تھا۔ مجھے اس پر بھی تعجب ہوتا کہ محض ایک جال کے ذریعے بیرونی مصنوعات سے بھری ہوئی یہ دکانیں اغیار کی دست بردسے کیوں کر محفوظ رہ جاتی ہیں؟ جب کہ خود میری نیت ڈانواں ڈول ہو جاتی تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ 'عمل' تک نوبت نہیں پہنچی ورنہ دست بریدہ ہندوستان پہنچتا کہ اسلام میں سارق کی سزا یہی ہے۔ اسی لیئے کہا جاتا ہے سعودی عرب کی سڑکوں پر آپ سونا اُچھالتے ہوئے چل سکتے ہیں۔

حج اور اس کے دیگر مناسک سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ 'دیارِ حبیب' یعنی مدینے کے لیئے روانہ ہوئے۔ اس وقت سعودی عرب کی شاہراہوں کا صحیح اندازہ ہوا۔ ان پر کم رفتاری سے موٹر چلانا خطرناک ہے۔ سڑکیں ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کالی ربر کو پگھلا کر بچھا دیا گیا ہے۔ میلوں چلے جایئے جھٹکا نہیں لگتا۔ مدینے کو مکّے سے زیادہ پُرسکون فرحت بخش اور سرسبز پایا۔ گنبدِ خضریٰ کی جھلک ہر طرف باغات و سبزہ زاروں میں نظر آئی جس جالی کو پکڑ کر دعا مانگنے کی خواہش ہر حاجی کو ہوتی ہے وہاں حاجبوں کا پہرہ پایا۔ کسی نے بتایا کہ فجر کی نماز سے پہلے پہنچ جایئے تو جالی کے قریب آیا جا سکتا ہے۔ ایک صبح ایسے ہی لمحے میں اندر کی جھلک دیکھی۔ تین قبریں ہیں جن پر سائبان لگے ہیں۔ ایک آں حضرت، دوسرے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور تیسری حضرت عمرؓ کی۔ دوسرے لمحے حاجب سر پہ تھا اور میں دور کھڑا ہوا تھا۔ وہابی دست برد سے بس یہی تین قبریں رہ گئی ہیں۔ پٹنس کے ہوٹل کی چھت سے

جنت البقیع کا نظارہ کیا (ہوٹل والے کو ۵ ریال دے کر) وہاں بھی ہر طرف سپاٹ میدان نظر آیا۔ عقیدت مند ہاتھ میں کچھ پتھر چھپا کر لے جاتے ہیں اور حضرت فاطمہ اور دوسرے اہل خاندانِ رسول کی قبروں کی نشاندہی انھیں رکھ کر کرتے رہتے ہیں۔ یہی حال غزوۂ بدر کے شہیدوں کے قبرستان کا ہے جو راستے میں دیکھا۔ سب سے زیادہ متاثر ہوا اس پہاڑ اور درّہ کو دیکھ کر جہاں سے حملہ کر کے حضرت خالد بن ولید نے جنگ کا نقشہ بدل دیا تھا۔ مدینہ میں عبدالملک صاحب جامعی سے ملاقات ہوئی۔ وہ عرصے سے وہیں آباد ہو گئے تھے اور اس وقت ابتدائی مدارس کے انسپکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ وہ مجھے اپنی موٹر نما کسی چیز میں بٹھا کر 'بیر عثمان' لے گئے۔ یہ وہ کنواں تھا جو حضرت عثمان نے یہودیوں سے خرید کر رفاہِ عام کے لیئے وقف کر دیا تھا۔ مدینہ کی ہر ہر گلی اور نخلستان پر تاریخِ اسلام کے نقش کندہ ہیں۔

سودی عرب کا میرا دوسرا سفر، ۱۹۷۷ء میں پیش آیا۔ یہ عالمی اسلامی تعلیمی کانفرنس کے سلسلے میں ہوا تھا۔ میرے ہم سفر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر علی محمد خسرو تھے۔ وہ بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ انھوں نے بڑی ڈھیل کی وائس چانسلری کی ہے۔ لیکن ان کے دردِ دل کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے "مسعود صاحب! جب میری موٹر کٹ میلے سے اتر کر دہلی کا رخ کرتی ہے تو میرے اعصاب میں سکون کی سی کیفیت آجاتی ہے لیکن جب دہلی سے آتے ہوئے یہ کٹ میلے پر چڑھنا شروع کرتی ہے تو اعصابی تشنج پھر شروع ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا "ہر وائس چانسلر کا یہی مقدر ہے۔ میرے سلسلے میں کٹ میلے پر یہ عمل برعکس انداز میں ہوتا ہے۔"

پاکستان سے کافی حضرات اس میں شرکت کرنے آئے تھے جن میں میرے شاگرد اور دوست کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر احسان رشید بھی تھے۔ احسان رشید علی گڑھ میں بھی ایک انجمن ساز شخصیت کے مالک تھے اور یہاں بھی ویسا ہی پایا۔ ہمارے قیام و طعام کا انتظام اس بڑے انٹرنیشنل ہوٹل میں تھا جو حدودِ مکہ سے باہر ایک بڑے عربی خیمے کی شکل میں بنایا گیا ہے۔ ایسے تمام اجتماع جن میں غیر مسلم بھی شریک ہوں اسی ہوٹل میں منعقد کیئے جاتے ہیں اس لیئے کہ حدودِ حرم میں انِ کے لیئے قدم رکھنا ممنوع

ہے۔ اِس قسم کی تخصیص کا تجربہ مجھے جنوبی ہند کے ایک مندر میں ہوا تھا۔ جہاں لسانیات کے سمر اسکول کا ایک گروہ جب پہنچا تو مسلمان ہونے کی وجہ سے مجھے مندر میں جانے کی ممانعت کر دی گئی۔ اب جب مکہ صورت مکہ میں دیکھی تو اطمینان ہوا کہ اس اعتبار سے کعبہ و کاشی یکساں ہیں، اس لیے شکایت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا، کانفرنس کے پہلے ہی سیشن میں تعلیم کے اسلامی خطوط کا تعین کر دیا گیا اس طرح کہ مسلم طبیعیات، مسلم نباتیات، مسلم جغرافیہ غرض کہ ہر علم کی تدریس کس طرح اسلامی نقطۂ نظر سے کی جائے۔ میری عقل میں شروع سے یہ منطق نہیں آئی، اس لیے اس قضیہ کے صغریٰ و کبریٰ کو کیا سمجھتا۔ میں نے مُسلم اقلیتی ممالک کی سب کمیٹی کا رکن ہونا منظور کیا۔ وہاں بحث و مباحثہ کے دوران سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ ایسے ممالک میں جہاں کی اکثریت غیر مُسلم ہے مُسلم سائنس اور مُسلم آرٹس کے کیا معنیٰ ہوں گے۔ میں نے بحث کے دوران اپنے ساتھیوں کو ہندوستان جیسے ممالک کے سیکولر تعلیم کے خطوط اور ان میں اسلامی عناصر کی آمیزش کے امکانات کی جانب اشارہ کیا، لیکن مسلم ذہن جب ہٹ دھرمی پر اُتر آتا ہے تو پھر نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کی سی کیفیت ہو جاتی ہے۔ مباحثہ، مجادلہ کی صورت اختیار کر لیتا اگر خرطوم (سوڈان) یونیورسٹی کے وائس چانسلر، جو ہندوستان ہو آئے تھے، اِس کمیٹی کے صدر نہ ہوتے اور میرے نقطۂ نظر کی حمایت نہ کرتے۔

اِس سے بدحظ ہو کر میں نے اپنی تمام تر توجہ لذّتِ کام و دہن کی جانب مبذول کر دی جس کے اس ہوٹل میں سارے سامان تھے۔ عرب گوشت بے دریغ کھاتا ہے اور اس سے زیادہ ضائع کرتا ہے۔ کانٹے چمچے پر اپنی انگلیوں کو ترجیح دیتا جنھیں سُنّت کے طور پر بعد کو چاٹتا ہے۔ یہاں دنبے کے پیٹ سے بھنا ہوا مرغ برآمد ہوتا۔ مجھے تلاش رہی کہ یا خدا کہیں اونٹ کے شکم سے بھنا ہوا دُنبا نکل آئے۔

جامعہ کی وائس چانسلری ہی کے دوران مجھے ایک تعلیمی کانفرنس میں قاہرہ جانے کا بھی موقع ملا۔ یہاں بھی خسرو صاحب میرے ہم سفر تھے۔ اس کانفرنس پر الازہر والے چھائے ہوئے تھے جس کے شیخ کچھ عرصے پہلے جامعہ ملیہ آ چکے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں اسکالر آدمی

تھے۔ جتنی دیر جامعہ میں رہے عربی مخطوطات کا مطالعہ کرتے رہے اور اپنے کام کی ایک دو چیزیں دریافت کر لیں۔ مصری عربوں میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ قوم ہے۔ وہاں قدیم اسکالر شپ کے بھی نمونے ملتے ہیں اور جدید کے بھی۔ قدیم و جدید کے فرق کو بھی وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں اور دونوں کی اپنے اپنے مقام پر اہمیت کو بھی جانتے ہیں۔

مصر میں دریائے نیل (جس کے درمیان ہمارا ہوٹل میری دان تھا) کے حسن کے کے علاوہ صحرا کے ان دیو ہیکل پاسبانوں کو بھی دیکھا جنھیں اہرامِ مصر کہتے ہیں۔ ابوالہول کو واقعی 'ہول' کا باپ پایا۔ قدیم مصری ذہن کس بڑے پیمانے پر اشیاء کو متصوّر اور پھر ان کی تجسیم کر سکتا تھا، یہ دیکھ کر ہول اور حیرت دونوں ہوئے۔ حسنِ قلوپطرہ کی تلاش ہوئی تو مصر کے بازاروں میں کچھ نقش و نگار ملے۔ رودِ نیل کی دلکشی اب بھی باقی ہے۔

جامعہ کے پونے پانچ سال کے قیام پر جب غور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کیا کھویا کیا پایا، تو ذاتی طور پر کھونے کا پلّا کچھ بھاری نظر آتا ہے۔ بنیادی طور پر میرے ذہن کی افتاد انتظامی کے بجائے تعلیمی ہے۔ تعلیمی مصروفیات میں مجھے خوشی زیادہ ملتی ہے۔ اسی لیے علی گڑھ کے طویل قیام میں، ابتدا میں وارڈن رہنے کے بعد میں نے کبھی کوئی دوسرا عہدہ قبول نہیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے مجھے سرسید ہال کے پرووسٹ کے عہدہ کی پیشکش کی تھی۔ میں نے اس سے بھی معذرت کر لی تھی۔ لیکن جب عابد صاحب اور دیگر بزرگوں نے مجھے جامعہ چلے آنے کو کہا تو اسے میں نے بہ خوشی منظور کر لیا۔ اس کی وجہ کرسی کی ہوس نہیں بلکہ اس ادارے سے وہ محبت تھی جو اسکول کے دنوں سے میرے قلب میں جاگزیں تھی۔ چنانچہ میں نے اس جذبہ کا اظہار جامعہ پہنچ کر پہلی تقریر میں اس طرح کیا تھا کہ "لوگ اوکھلی میں سر دیتے ہیں میں نے اوکھلے میں سر دیا ہے"۔ اس اسپرٹ کے ساتھ میں جامعہ پہنچا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وائس چانسلری کی ذمہ داریوں کے ساتھ مجھے علمی و تحقیقی کاموں کے لیے فرصت نہیں ملے گی۔ حالاں کہ پروفیسر محمد مجیب مشورہ مجھے یہی تھا کہ میں اپنا

علمی کام جاری رکھوں، انتظامی معاملات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ جامعہ پہنچ کر مجھے بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ تصنیف کا قلم رکھ کر دستخطوں کے قلم پر اکتفا کرنا ہوگا۔ جامعہ کے میرے پونے پانچ سال اِس لیے علمی اعتبار سے "بنجر" رہے کہ سوائے چند خطبات اور مضامین کے اور کچھ نہ لکھ سکا حالاں کہ حیدرآباد کے چھ سالہ قیام اور اس کے بعد مسلم یونیورسٹی کی ۵ سالہ لسانیات کی پروفیسری کے دوران میں نے علمی وتحقیقی کام خاصا کیا تھا۔ اب دفتر، کار اور بنگلے کی سہولت تھی۔ پانچ اسٹار ہوٹلوں میں سرکاری ضیافتوں میں شرکت، اونچی کرسی والوں سے ملاقاتیں، یہ سب کچھ تو تھا لیکن ہمیشہ یہ احساس رہا کہ میاں مسعود! نہ یہ تمہارا صحیح مقام ہے اور نہ منصب۔ بعینہٖ جس طرح آل انڈیا ریڈیو کی چھ مہینے کی سروس کرنے کے بعد محسوس ہوا تھا۔ چنانچہ جیسا کہ کہیں ذکر کر چکا ہوں میں نے ایک سال قبل استعفا دے کر علی گڑھ چلے جانے کے بارے میں سوچ لیا تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے شری اَنِل بورڈیا (جو اس وقت وزارتِ تعلیم میں ڈائریکٹر تھے) اور شری چھابڑا کا دسکریٹری یو۔ جی۔ سی) کہ انھوں نے مسلم یونیورسٹی کی مجلس منتظمہ کے سرکاری نامزد کردہ رکن کی حیثیت سے وائس چانسلر علی محمد خسرو کی میری بازملازمت کی تجویز میں پنچ لگادی اور میں جاتے جاتے رُک گیا۔ بعد کو جب میں نے شری چھابڑا سے اس کی ہنس کر شکایت کی تو انھوں نے اس کی ساری ذمہ داری اَنِل بورڈیا پر ڈال دی۔ مجھے یاد آگیا کہ جب وہ جامعہ ملّیہ کی مجلس عاملہ کے سرکاری رکن تھے تو ایک مسئلہ پر میرا اُن سے اختلاف ہو گیا تھا۔ میں اس واقعہ کو بھول گیا تھا لیکن انھیں یاد رہا!

جامعہ پہنچ کر میرا خیال تھا کہ اس کے ایک قدیم طالب کی حیثیت سے اور میرے خاندان سے اس کا جو تعلق رہا ہے اس بنا پر، ڈاکٹر سیّد عابد حسین کی خواہش اور رشید احمد صدیقی صاحب کی دُعاؤں کے ساتھ میں اِس اِدارے کی روحِ گم شدہ کو واپس لاسکوں گا۔ چنانچہ جاتے ہی میں نے اس کے شعبۂ اردو میں پروفیسری کی اسامی قائم کرائی، اور اس کے لیے علاحدہ سے عمارت خریدی۔ بعد کو جب کالجوں کا نظام ختم ہو گیا اور ان کی جگہ مختلف فیکلٹیوں نے لے لی تو میں نے خاص طور پر عربی، فارسی اور اسلامیات کا ایک مرکز قائم کیا تاکہ جامعہ اپنے ماضی سے وابستہ رہ سکے۔ جامعہ کے سوشل ورک کی حیثیت کے پیش نظر

سوشل ورک اسکول کے 'رجواڑے' کو ختم کر کے سوشل سائنز کی فیکلٹی میں تبدیل کیا۔ اور شعبۂ نفسیات کا اس میں اضافہ کیا گیا۔ رفتہ رفتہ یہ کھلا کہ بیشتر اساتذہ کا نہ جامعہ اسپرٹ سے کوئی تعلق تھا اور اس کے اسلامی ادارہ ہونے سے۔ غالب کے بقول نفسا نفسی کا عالم تھا ۔

اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

چنانچہ عجب عجب طرح کے اتحاد باہمی پائے الٹے سیدھے کا، دیندار دنیا دار کا۔ علمی اقدار یا حُبِّ جامعہ سے کسی کو سروکار نہیں تھا۔ اپنی چودھراہٹ قائم رکھنا ضروری تھی، جامعہ چاہے بھاڑ میں جائے۔ پھر قربانی کے بکرے کے طور پر وائس چانسلر تو ہمیشہ موجود ہی رہتا ہے۔ پروفیسر مجیب کے زمانے میں جو ڈھیل مل گئی تھی، اس کا جاری رہنا ضروری تھا۔ غالباً انھوں نے ان حالات سے دل برداشتہ ہو کر آخری زمانے میں جامعہ کی توسیع میں دلچسپی چھوڑ دی تھی اور اپنا سارا وقت اپنی علمی یا دوسری ذاتی مصروفیات میں صرف کرتے تھے۔

جامعہ کے اساتذہ میں بہت بڑی تعداد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مسترد کردہ نااہلوں کی تھی۔ ان میں فرسٹ کلاس کیریر کے لوگ بہت کم تھے۔ ان میں سے بیشتر ریڈر اور صدر شعبہ کے منصب پر مجیب صاحب کے زمانے میں فائز ہو چکے تھے اور بغیر کسی علمی کام کے جامعہ کی توسیع کے ساتھ ساتھ پروفیسری کے خواب دیکھ رہے تھے۔ چوں کہ بیشتر مضامین میں پوسٹ گریجویٹ کلاسیں نہیں کھلی تھیں اس لیے ان میں سے اکثر کو ایم اے کلاسیں پڑھانے یا تحقیقی کام کرانے کا ایک دن کا بھی تجربہ نہیں تھا۔ تاہم جامعہ کالج کے پرنسپل، انتخابی کمیٹیوں میں یہ کہہ کر ان کی سفارش کرتے کہ اگر ان کو ایم۔ اے پڑھانے کا تجربہ نہیں ہے تو اس کی ذمہ داری جامعہ پر ہے جس نے ان کو اس کام کا موقع فراہم نہیں کیا، گویا جامعہ کے باہر بھی ایسے اُمیدوار موجود نہیں تھے! اسی الٹی منطق سے ایک صاحب کو جو 'الف' سے لے کر 'ی' تک تھرڈ کلاس تھے معاشیات کا پروفیسر بنا دیا گیا اور سیکنڈ کلاس

رکھنے والے تو سبھی لوگ پروفیسر بن گئے، لیکن میرے جامعہ چھوڑنے کے بعد۔

جب اُن بزرگوں اور رفیقوں کو یاد کرتا ہوں جن کے ساتھ یا جن کے درمیان رہ کر میں نے جامعہ چلائی تو ڈاکٹر سید عابد حسین کے علاوہ دو نام فوراً ذہن میں آتے ہیں۔ ایک امیرِ جامعہ جسٹس ہدایت اللہ صاحب کا اور دوسرے اعزازی خازن مدحت کامل قدوائی صاحب کا۔ ہدایت اللہ صاحب کی جانب سے مجھے ہر موقع پر تائید ملی، اس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ یہاں یہ بتا تا چلوں کہ ان کی عدمِ مداخلت کی پالیسی کا سرچشمہ ان کا عرصہ تک کرسیٔ عدالت پر فائز رہنا تھا جامعہ ان کے نقشۂ حیات میں ایک چھوٹا سا مقام رکھتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ وہ خود اس مرتبہ کے لیئے راضی نہیں تھے لیکن اپنی رفیقۂ حیات کے مشورے پر بادلِ ناخواستہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے انتقال کے بعد ۱۹۶۹ء میں قبول کر لیا تھا۔ اس لیۓ انھیں جامعہ کے معاملات سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس بات کا اندازہ مجھے اس بات سے ہوا کہ جب کبھی میں نے جامعہ کی توسیع کے سلسلے میں امداد چاہی تو کہا "میں وزیرِ اعظم کی سطح پر تو بات کر سکتا ہوں لیکن وزیرِ تعلیم یا یو۔ جی۔ سی کے چیرمین وغیرہ سے وائس چانسلر نبٹے تو بہتر ہے"۔ بڑی مشکل سے میں نے ایک بار جامعہ کے معاملات کے سلسلے میں۔ یو۔ جی۔ سی کے چیرمین پروفیسر ستیش چندر اور سکریٹری شری چھابڑا کو اُن کے اشوکا ہوٹل کے 'سوئٹ' میں چائے پر بلایا تھا، اور میں نے دیکھا اس ملاقات کے بعد کئی معاملات کا تصفیہ جلد ہو گیا۔ لیکن وہ اس قسم کی بھی ملاقاتوں کے لیۓ آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ البتہ میری وائس چانسلری کے دوران وہ پہلے اندرا گاندھی اور دوسرے سال، جنتا کے برسرِ اقتدار آجانے کے بعد شری مرارجی ڈیسائی کو کنونشن کو بلانے کے لیے ع معشوق ما بہ شیوۂ ہر کس برابر است کے مصداق جب اندرا جی آئیں تو ع ان کے ہر گام پہ وہ نامِ خدا کہتے تھے۔ عالم یہ تھا کہ جب کنونشن کا جلوس پنڈال میں داخل ہوا تو اس کی سربراہی امیرِ جامعہ کی حیثیت سے ہدایت اللہ صاحب کر رہے تھے اور میں وائس چانسلر کی حیثیت سے معزز مہمان کے ساتھ تھا۔ ہدایت اللہ صاحب ہر پانچ

قدم کے بعد جب فرش کا جوڑ آتا مڑتے اور اندراجی سے کہتے: "احتیاط سے قدم رکھئے گا" جب یہ انتباہ دو تین بار ہو گیا تو اندراجی سے نہ رہا گیا اور مجھ سے آہستہ سے کہا "ان سے کہیے کہ وہ مجھ سے زیادہ اپنی فکر کریں" یہ امر واقعہ بھی ہے کہ اندراجی سے زیادہ وہ ڈگمگ ڈگمگ چل رہے تھے کنونشن کے خطبے اور میرے استقبالیہ کے بعد بھی ایک لطیفہ ہوا۔ ہم دونوں نے عرض مدعا اور جواب عرض مدعا میں اردو اشعار کا استعمال بے تحاشا کیا۔ دوسرے روز اخباروں میں نکلا کہ جامعہ کے کنونشن میں شیخ الجامعہ اور وزیر اعظم کے درمیان شعر بازی رہی۔ اس کے بعد وزیر اعظم کی جانب سے داد دہش کے اعلان کی باری آئی تو ہدایت اللہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ دس لاکھ کا اعلان کر دیجیے یہ میری ناتجربے کاری سمجھئے کہ میں وزیر اعظم کا منہ دیکھنے لگا اور انھوں نے فوراً کہا اس قدر میں کہاں سے دوں گی۔ اس کے بعد پرچے پر ۵ لاکھ لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ چنانچہ گھاٹے کا سودا رہا۔

مرار جی ڈیسائی کنونشن ایڈریس دینے آئے تو ایسا معلوم ہوا کہ ہدایت اللہ صاحب ان سے بھی اتنے ہی قریب ہیں جتنے کہ وہ اندراجی سے تھے۔ اس کی شاید ایک وجہ ان کا 'بمبئی والا' ہونا اور دوسری وجہ ان کی بیوی کا ایک گجراتی ہندو ہونا بھی ہو سکتا ہے۔ بہر حال یہ عالم بالا کی باتیں ہیں۔ اونچی سیاست میں کون کس کے قریب ہوتا ہے یہ ہم جیسے 'ماسٹر' کیا جانیں۔

اس کنونشن میں جامعہ والوں نے وزیر اعظم کو بالکل مختلف پایا۔ لڑکوں میں اس زمانے میں ایجی ٹیشن تھا اس لیے انھوں نے پروگرام بنایا تھا کہ وہ کنونشن میں گڑبڑ کریں گے خفیہ پولیس کو اس کی اطلاع مل گئی تھی۔ چنانچہ ایسے تمام طالب علموں کے پیچھے پولیس کے جوان موجود تھے۔ جوں ہی انھوں نے شور و غل کا آغاز کیا، منہ پر ہاتھ رکھ کر انھیں پکڑ کر باہر لے گئے جہاں خدمت کے لیے پولیس کی لاریاں کھڑی ہوئی تھیں۔ بس ایسا معلوم ہوا کہ ایک حرکت مذبوحی ہوئی اور ختم ہو گئی۔ مرار جی ڈیسائی نے اندازہ کر لیا۔ اپنی تقریر میں انھوں نے سختی سے ڈانٹا اور کہا جس تعلیمی ادارہ کے طالب علموں کو آدابِ معاشرت نہ آتے ہوں ان اداروں کو بند کر دینا چاہیے جیسا کہ میں نے چانسلر کی حیثیت سے ودیا پیٹھ (گجرات) کو کیا ہے۔ ہماری یادوں میں پچھلا کنونشن تازہ تھا۔ جب اندراجی آئی تھیں اور جامعہ کو پانچ لاکھ روپے کی خطیر رقم کا عطیہ دیا تھا۔ مرار جی بھائی موقع

سے فائدہ اٹھا گئے۔ ہمیں مانگنے کی ہمت نہ ہوئی انھیں دینے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اس کے بعد چائے کے موقع پر بھی وہ بدحظ ہی سے رہے۔ صرف سنترے کے ایک گلاس عرق پر اکتفا کیا۔ البتہ جب میں نے ان کے 'پیشاب' کے ذریعے علاج کا تذکرہ کیا (جس کے بارے میں ان کا حال میں کتابچہ شائع ہوا تھا اور میں نے خاص طور پر خرید کر پڑھا تھا) تو ان کے خشک چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

دوسری شخصیت جن کا میرا ساتھ پونے پانچ برس تک رہا، قدوائی خاندان کے ایک فرد مدحت کمال قدوائی تھے۔ وہ مجیب صاحب کے زمانے سے اعزازی خازن کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ سعودی عرب میں ہندوستان کے سفیر رہ چکے تھے اور اب ویسٹ اینڈ میں ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ میرے انتہائی ہمدرد اور خیر خواہ تھے۔ ان کا مقولہ تھا کہ میں یہاں وائس چانسلر کی مدد کے لیے آیا ہوں نہ کہ روڑے اٹکانے کے لیے۔ چنانچہ مجھے کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں پڑتا جب میرا ان کا اختلاف ہوا ہو۔ چوں کہ ان کے جامعہ برادری سے تعلقات وسیع تھے اس لیے ان کے ذریعے اکثر انتظامی معاملات سلجھانے میں مدد ملتی تھی۔ میں نے ہمیشہ صائب الرائے پایا۔ صرف ایک شخص کے بارے میں مجھے اختلاف رہا۔ وہ تھے جامعہ کے اسٹیوارڈ شبیر احمد ندوی۔ وہ ان کے مقربینِ خاص میں تھے۔ لیکن میری رائے ان کے بارے میں اچھی نہیں تھی۔ میرے جانشین اور مدحت کمال قدوائی صاحب کے برادرِ حقیقی جمال قدوائی صاحب سے جب حضرت کا تذکرہ آیا تو ان کی بھی رائے وہی پائی جو میری تھی۔ انھوں نے پروفیسر مجیب کی آرامی کے معاملات اس طور سے پیش کیے گویا جامعہ کی زمین کا کچھ حصہ ان کے احاطے میں آگیا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں کارگزاری کرنی پڑی جس سے میرے اور ان کے اہلِ خاندان کے تعلقات میں کشیدگی آگئی۔ بہرحال مدحت قدوائی صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی بنا دی گئی جس کی رپورٹ پر جامعہ نے اپنا دعویٰ واپس لے لیا۔ مجھے افسوس ہوا جب میں نے یہ سُنا کہ اسی شخص نے جو اپنی دیانت کی قسم کھاتا تھا ریٹائرڈ ہونے سے قبل، کاغذات میں خرد برد کر کے جامعہ کے ایک مکان پر قبضہ کر لیا اور جامعہ اس کو تا حال بے دخل نہیں کر سکی ہے۔

میرے سکریٹری عبداللطیف اعظمی بھی ایک 'کردار' تھے وہ مجھے مجیب صاحب سے ورثہ

میں ملے تھے۔ جامعہ والوں کا خیال تھا کہ ہر وائس چانسلر کو انھیں 'بھگتنا' پڑتا ہے۔ اس پر مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا اپنے سکریٹری الیاس مجیبی صاحب کے بارے میں یہ کہنا یاد آجاتا تھا کہ "ہماری تخلیق کا تو واحد مقصد یہ ہے کہ ہم مجیبی صاحب سے نبھائے چلے جائیں"۔ خیر میرے سلسلے میں یہ نوبت نہیں آئی۔ چوں کہ میں لطیف صاحب سے پہلے سے واقف تھا۔ اس لیئے وہ دوستی اور احترام کے باریک فرق کو سمجھتے تھے۔ وہ جامعہ کے اُن چند لوگوں میں تھے جن پر میں مکمل اعتماد رکھتا تھا اور جنھوں نے وفاداری کا حق بہ شرطِ استواری نبھایا۔ انھوں نے مجھے بہت سی ناخواستہ بلّیات سے محفوظ رکھا۔ ان کے اسی رویے سے جامعہ برادری کے اکثر حضرات ناراض رہتے تھے۔ چوں کہ وہ اہلِ قلم بھی تھے اور رسالہ جامعہ کا بیشتر کام وہی کیا کرتے تھے۔ میں نے مجلس عاملہ میں ایک ریزولیوشن پیش کر کے انھیں رسالہ جامعہ کا نائب مدیر بنا دیا، جو وہ تا حال ہیں۔ رسالہ جامعہ اب تک انھیں کے دم سے پابندی سے نکل رہا ہے۔

جامعہ کے قیام کے آخری سال میں میں یکم اکتوبر ۷۷ء کو مسلم یونیورسٹی کی ملازمت سے ساٹھ سال کی عمر پہنچنے پر سبک دوش ہو گیا۔ ابھی جامعہ میں میری ملازمت کا تقریباً ایک سال باقی تھا، جس کے ۹ مہینے میں نے مکمل کیئے اور ۱۵ اگست ۷۸ء کو دو سال کی باز ملازمت پر پھر علی گڑھ آگیا۔

اس سال کا ایک اہم واقعہ دسمبر ۷۷ء میں میری بڑی بیٹی فریدہ کی شادی ہے۔ اس نے علی گڑھ سے باٹنی میں فرسٹ کلاس ایم۔ ایس۔ سی۔ کرنے کے بعد جامعہ کے ٹریننگ کالج سے بی ایڈ کر لیا تھا۔ اس کے کئی پیغام آئے۔ بالآخر نسبت ڈاکٹر عبدالرشید سے قرار پائی جو مرکزی سرکار کے شوگر کین انسٹی ٹیوٹ، لکھنؤ میں سائنس داں کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ شادی کی رسم بڑی سادگی کے ساتھ ادا کی گئی اور اس کے بعد میری بیوی نے اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ رشید بہت سعادت مند نوجوان ہیں۔ مشرقی یو۔پی۔ کے ایک سیّد گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پابندِ صوم وصلوٰۃ ہیں لیکن حالات کی مجبوری کے تحت انھیں اردو لکھنے پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ میں انھیں ان کی 'اردو ندانی' پر اکثر آڑے ہاتھوں لیتا ہوں۔ ایک دن ان سے میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی کہ "اس خطّے کا کوئی مسلمان اگر اردو سے بے بہرہ ہوتا ہے

تو وہ مجھے مسلمان ہی معلوم نہیں ہوتا۔" اقبال سے معذرت کے ساتھ:

ع کافرِ اردو، ہوں میں دیکھ مرا ذوقِ شوق!

میں نے اپنی تعلیمی ملازمت میں بچیوں کے لیے زیادہ پس انداز نہیں کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ ان کو اعلیٰ تعلیم دلا دینا ہی کافی ہوگا۔ لیکن ہندوستانی سماج میں یہی سب کچھ نہیں۔ بہر حال یہ میری بیوی کی کفایت شعاری کی (جو مجھ سے نظر بچا کر کی جاتی تھی) بدولت تھا کہ ہم لوگ اپنی چار بچیوں کے ساتھ تھوڑا بہت کر سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے سلسلے میں ہم سے بہت تقاضے بھی نہیں ہوئے۔ لیکن سماجی روابط میں بغیر تقاضے کے بھی کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے۔ اس کا انتظام میری بیوی نے 'خفیہ کفایت' کے ذریعے کر دیا، اس طرح کہ مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ میری تنخواہ میں غالب سا کوئی ساہوکار بھی شریک ہو گیا ہے۔

اسی زمانے میں ترقی اردو بورڈ (شم بیورو) سے میرا تعلق گہرا ہو گیا۔ میں ۱۹۷۳ء سے اس کے اردو لغت کے منصوبے میں بحیثیت ایک ایڈیٹر کے اس کی تیسری جلد (د تا س) پر کام کر رہا تھا۔ میرے اسسٹنٹ جنیدی صاحب مع ساز و سامان کے علی گڑھ سے منتقل ہو کر میرے ساتھ جامعہ نگر آگئے تھے لیکن ان کی مسلسل علالت اور میری انتظامی مصروفیات کی بنا پر اس میں خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہو سکی۔ جنیدی صاحب کے علی گڑھ واپس چلے جانے کے بعد میں نے مسعود ہاشمی صاحب کا انتخاب کیا۔ وہ صلاحیت کے آدمی ثابت ہوئے اور جب میں ۱۹۷۸ء میں علی گڑھ منتقل ہو گیا تو اس کے بعد بھی کام کرتے رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے "اردو لغات کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے میرے ساتھ پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔ جامعہ ملیہ کی مجلس تعلیمی نے خصوصی طور پر علی گڑھ منتقل ہو جانے کے بعد بھی مجھے بدستور نگراں رکھا۔ اب اس مقالے پر انھیں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل گئی ہے۔

۱۹۷۳ء ہی سے میں لسانیات کی اصطلاحات کمیٹی کا صدر مقرر کر دیا گیا تھا۔ اس عرصے میں علی گڑھ اور جامعہ ملیہ میں اس کے کئی جلسے ہوئے اور وضع شدہ اصطلاحات کا پہلا مسودہ تیار کر لیا گیا۔ پہلے مسودہ کی تیاری میں ڈاکٹر محمد ذاکر اور آخری میں ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ

سے کافی مدد ملی۔ اصطلاحاتِ لسانیات کا یہ کام میری صدارت میں مکمل ہو کر بیورو کی جانب سے شایع ہو چکا ہے۔ اس پر میں نے بڑی محنت کی ہے۔ اس کے اراکین بدلتے رہے لیکن میں شروع سے آخر تک صدر کی حیثیت سے اس کا ذمہ دار رہا۔ ان کو و منع کرتے وقت پہلی بار اندازہ ہوا جب تک ایک طرف اس علم کے تصورات پر عبور نہ ہو اور دوسری طرف ہماری اصطلاحات سازی کے لیے خاص طور پر عربی زبان کے مادوں سے واقفیت نہ ہو، اس وقت تک آپ اس کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ اردو اصطلاحات سازی میں نہ تو بول چال کی زبان سے کام چلتا ہے اور نہ سنسکرت کے مادّوں اور تراکیب سے۔ بین الاقوامی اصطلاحات بھی زیادہ ساتھ نہیں دیتی خاص طور پر جب مرکبات سے سابقہ ہو۔

۱۹۷۷ء میں جنتا گورنمنٹ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ہر شعبے میں اُلٹ پلٹ کی گئی۔ ترقی اردو بورڈ (بیورو) کی تنظیم بھی از سرِ نو کی گئی یعنی تنخواہ دار ڈائریکٹر کے بجائے حسب سابق اعزازی نائب صدر کا عہدہ پھر قائم اس عہدہ پر پہلے جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب عرصے تک کام کر چکے تھے۔ اس روایتِ دیرینہ کے پیشِ نظر ۱۹۷۸ء میں اس پر میرا تقرر ہو گیا لیکن جنتا سرکار کے ہٹتے ہی بیورو کی تنظیم میں تبدیلی کر کے پھر تنخواہ دار ڈائریکٹر کا عہدہ قائم کر دیا گیا۔

جامعہ اردو علی گڑھ کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے پہلی بار میرا انتخاب ۱۹۷۳ء میں ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۷۶ء۔ ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۴ء میں مسلسل میرا انتخاب ہوتا رہا۔ اس طرح اس ادارے سے میری وابستگی کے ۱۵ سال پورے ہو چکے ہیں۔ اتنی طویل مدت کے لیے کوئی دوسرا شخص شیخ الجامعہ نہیں رہا ہے۔ مختلف اوقات میں نائب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے میرے ساتھ ڈاکٹر عتیق صدیقی (۷۵ تا ۸۰ء) اور پروفیسر عبد العظیم نے (۸۱ تا ۸۶ء) نے کام کیا۔ اعزازی خازن کی حیثیت سے جنید صاحب اور الحاج عبید الرحمٰن خاں شیروانی صاحب (۷۵ تا ۸۵ء) نے کام کیا اور ۸۶ء سے ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ صاحب اس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ جامعہ اردو کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے میں نے کیا خدمات انجام دی ہیں، ان کا تفصیلی تذکرہ آگے آئے گا۔

چودھواں باب

علی گڑھ (۵)

(۷۸ تا ۱۹۸۱)

۱۶ راگست ۱۹۷۸ء کو میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی باز ملازمت میں آگیا۔ کچھ عرصے کے بعد لسانیات کے شعبے کے نئے پروفیسر اور صدر میرے پرانے شاگرد ڈاکٹر عبدالعظیم بھی نیویارک سے آگئے۔ اُن کا اس جگہ پر تقرر میری ہی تحریک پر ہوا تھا، حالاں کہ وہ امریکہ میں صرف عارضی لیکچرر تھے اور انٹرویو کے لیے بھی نہیں آئے تھے۔ اس عہدے کے دعویداروں میں میرے دوسرے شاگرد ڈاکٹر عبدالغفار شکیل بھی تھے، جو میری غیر حاضری میں پانچ سال تک ریڈر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے۔ وہ اوسط درجے کی صلاحیت کے استاد تھے اور اسی وجہ سے عبدالعظیم صاحب کو ترجیح دے کر ڈبل پروموشن کے ذریعے پروفیسر بنا دیا گیا۔ میرا خیال تھا کہ غفار شکیل صاحب اس تبدیلی کو خوش دلی کے ساتھ قبول کریں گے اور میری موجودگی میں دونوں کے تعلقات ہموار رہیں گے۔ لیکن معاملہ برعکس نکلا۔ انھیں علم سے زیادہ اپنی زیادہ عمر پر ناز تھا۔ چنانچہ اُن کے ذہن پر 'مظلومیت' کی نفسیات طاری ہو گئی۔ اور انھوں نے نہ صرف شعبے کے کاموں میں دلچسپی لینا چھوڑ دی بلکہ رفقائے شعبہ سے (بہ شمول میرے) ہر قسم کے تعلقات ختم کر لیے۔ طالب علموں کو پڑھانے میں گریز کرتے تو اپنی 'مظلومیت' کی داستان سنانے لگتے:

یہ دیکھ کر میں بھی کنارہ کش ہو گیا اور اپنے علمی کاموں میں، جو قیام جامعہ ملیہ میں صفر ہو گئے تھے، تیزی کے ساتھ منہمک ہو گیا۔ چنانچہ انھیں چند سالوں میں میں نے روشن علی سہارنپوری کا عاشور نامہ مرتب کر کے شعبے کی جانب سے شائع کیا۔ تدریس کے لیے تاریخ زبان اردو کے علاوہ اسلوبیات، کو اپنا مخصوص میدان بنایا۔ اور اس نقطۂ نظر سے کئی اجتہادی مضامین لکھے۔ میری ہی تحریک پر میرے ایک شاگرد، ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ سولن کے اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر کی پرنسپلی چھوڑ کر شعبۂ لسانیات میں لکچرر کی حیثیت سے آئے۔ انھیں ریڈر کی تنخواہ تو دے دی گئی لیکن اس کا منصب نہ مل سکا۔ خیال تھا کہ چند سالوں میں اس کی بھی صورت نکل آئے گی لیکن یہ اُن کی بدقسمتی ہے کہ صدر شعبہ کی مخالفت اور سیاست کی وجہ سے وہ اب تک لکچرر پڑے ہوئے ہیں۔ وہ بڑے ذہین، محنتی اور فرض شناس استاد ہیں اور میرے خیال میں ان کا معاملہ

ع ہنر بہ چشم عداوت بزرگ تر عیبے ست

کا ہے۔ لسانیات کے استاد اور تحقیق کے نگراں کی حیثیت سے جوں جوں ان کی شہرت بڑھی وہ حسد کا شکار ہوتے گئے۔

بے انصافی ہوگی اگر یہاں میں نئے صدر شعبہ پروفیسر عبدالعظیم کا ذکر قدرے تفصیل سے نہ کروں جنھیں بڑی توقعات کے ساتھ شعبۂ لسانیات کی صدارت پر لایا گیا اور جنھوں نے اپنی دس سال کی سربراہی کی مدت میں اپنی ہوس اقتدار کے باعث اس شعبے کو تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا ہے۔

ان کے تعلیمی کیریئر کی ابتدا ایک عزیز شاگرد کی حیثیت سے ہوئی۔ میں نے انھیں بی اے۔ کی کلاس میں دریافت کیا۔ میں ان کی لگن، محنت اور بعد کے سخت حالات سے، جن سے وہ تعلیم حاصل کر رہے تھے بے حد متاثر تھا۔ جیسے جیسے ان کے ذاتی حالات سے واقف ہوتا گیا میری ہمدردی بڑھتی گئی۔ مالی کفالت کی غرض سے میں نے انھیں اپنی سالی اور بچے کے ٹیوشن پر مامور کیا۔ مجھے اس بات کا بھی اندازہ ہو گیا کہ ان کا ادبی ذوق بہت معمولی ہے اس لیے ان کی توجہ لسانیات کی طرف کرائی جس کے لیے ان کے ذہن کی ساخت اور

سخت محنت کرنے کی عادت مناسبت رکھتی تھی۔ چنانچہ اردو ایم۔ اے میں میرے ساتھ تاریخ زبانِ اردو کا کورس کرنے کے بعد میری ہی تحریک اور مدد سے وہ میسور کے لسانیات کے سمر اسکول تک پہنچے۔ ۱۹۵۸ء میں میں امریکہ چلا گیا۔ وہاں سے ۱۹۶۰ء میں جب واپس آ رہا تھا تو ڈاکٹر جان گمپرز نے مجھ سے کہا کہ میں انھیں ایک ایسا اسسٹنٹ دوں جو لسانیات سے بھی واقف ہو، اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہو، اور اردو ٹائپنگ بھی جانتا ہو۔ ان کے پیشِ نظر برکلے یونیورسٹی (کیلفورنیا) کے اردو نصابات کی تیاری کا منصوبہ تھا۔ میں نے عظیم صاحب کے نام کی سفارش کی۔ کچھ عرصے کے بعد ڈاکٹر گمپرز نے انھیں برکلے بلا لیا، وہاں ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کے شعبے کے تمام اساتذہ کا دل انھوں نے اپنی محنت سے جیت لیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے بال بچوں کو بھی بلا لیا اور کولمبیا یونیورسٹی (نیویارک) منتقل ہو گئے۔ جہاں پروفیسر ولیم ڈائی ور کے ساتھ پی ایچ۔ ڈی میں داخلہ لیا۔ چوں کہ اس عرصہ میں ان کی زیادہ توجہ کمائی اور اپنے بچوں کی تعلیم کی جانب رہی اس لیے پی ایچ۔ ڈی کا کام بہت سست رفتاری سے کرتے رہے۔ ۱۹۷۳ء میں میں جامعہ ملیہ کا وائس چانسلر ہو کر دہلی چلا گیا اور ڈاکٹر عبدالغفار شکیل میری جگہ بحیثیت ریڈر اور قائم مقام صدر شعبہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اسی عرصے میں شعبۂ لسانیات میں ایک اور پروفیسری کی جگہ منظور ہوئی۔ پروفیسر خسرو نے مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے بلا تکلف عبدالغفار شکیل صاحب کے مقابلے میں عظیم صاحب کا نام پیش کیا۔ اس وقت وہ کینسس یونیورسٹی میں عارضی لکچرر تھے۔ میرا خیال تھا کہ انھوں نے اپنی پی ایچ۔ ڈی مکمل کر لی ہے۔ لیکن یہ راز بعد کو کھلا کہ انھوں نے اس کام کو ختم تو کر لیا تھا لیکن جب ان کا تقرر ہوا ہے اس وقت تک انھوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل نہیں کی تھی۔

پروفیسر خسرو نے میری رائے پر اعتماد کرتے ہوئے غیر حاضری میں ان کا پروفیسری پر تقرر کر دیا۔ میں بھی انتخاب کمیٹی کا رکن تھا۔ جب انھیں اس تقرر کی اطلاع نیویارک میں ملی تو انھوں نے وہاں سے مجھے ٹیلیفون کیا اور اپنی پی ایچ۔ ڈی کے بارے میں تفصیلات بتائیں۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان کی سرزمین پہ اسی وقت

تک قدم نہ رکھیں جب تک انھیں پی ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری نہ مل جائے۔ اس کے بعد انھوں نے یونیورسٹی سے تین ماہ کی مہلت مانگی اور شب و روز محنت کے بعد ڈگری حاصل کرلی۔ چنانچہ جب اکتوبر ۸۰ء کے آخر میں وہ علی گڑھ پہنچے تو مستعد یافتہ تھے۔ میں جامعہ ملیہ سے فارغ ہوکر ۱۵ اگست ۸۰ء ہی کو اپنی باز ملازمت پر علی گڑھ پہلے سے پہنچ چکا تھا۔

عظیم صاحب کا دورِ صدارت ابتدا میں بہت اچھا رہا سوائے اس کے عبدالغفار شکیل نے ان کے تقرر کو عقلی یا جذباتی طور پر بھی تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ شعبے کے ہر کام سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور دوسرے شعبوں میں جاکر ہم سب کے خلاف پروپیگنڈا کرنا ان کا معمول ہوگیا۔ اسی زمانے میں میرے مشورے سے عظیم صاحب شعبے کے ایک گمشدہ لعل کو (میری مراد ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ سے ہے) سولن کے اردو ٹیچنگ اور ریسرچ سینٹر سے واپس لائے۔ وہ وہاں پرنسپل سینٹر کی حیثیت سے ریڈر گریڈ کی تنخواہ پا رہے تھے لیکن تحفظِ مشاہرہ کی شرط پر وہ شعبۂ لسانیات کی لکچراری پر آنے کے لئے آمادہ ہوگئے۔ خیال تھا کہ تنخواہ تو انھیں ریڈر کی مل ہی گئی ہے ریڈر کا منصب بھی بہت جلد مل جائے گا۔

شعبے کی بدقسمتی سے اب عظیم صاحب تدریس و تحقیق کے بجائے فیکلٹی آف آرٹس کے انتظامی امور میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ اس کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ فیکلٹی کی سیاست میں سرگرم حصہ لیں اور اسی نسبت سے دوست اور دشمن بنائیں۔ انھیں سیاست کا چسکا شاید اس وجہ سے بھی لگا کہ انھیں غفار شکیل صاحب کے ہمہ وقتی پروپیگنڈے کا جواب دینا بھی ضروری ہوگیا۔ بعض صدور شعبہ نے شکیل صاحب کا پارٹ لیا۔ اس طرح فیکلٹی آف آرٹس سیاست کا اکھاڑہ بن گئی۔ شعبہ کی بدقسمتی کہ جنوری ۸۲ء میں عظیم صاحب ڈین بھی بن گئے اقتدار کا نشہ اپنے عروج پر تھا۔ میں شعبے سے دو سال باز ملازمت پر اور ایک سال وزٹنگ پروفیسر رہنے کے بعد ستمبر ۱۹۸۱ء میں مکمل طور پر سبک دوش ہوچکا تھا۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل، اب دیکھنے کی مروّت بھی باقی نہیں رہی۔ اس زمانے میں وہ مجھ تک سے مربیانہ انداز کا برتاؤ کرنے لگے۔ مثلاً کبھی کہتے میں لنگوئسٹک سوسائٹی کا نام مسعود حسین لنگوئسٹک سوسائٹی کرنا چاہتا ہوں۔ کبھی لا سا لگاتے کہ وہ میری ایک تصویر

بانی صدر شعبہ کی حیثیت سے شعبۂ لسانیات کے سیمنار میں ٹانگنا چاہتے ہیں۔ میں قبل از وقت متشکرانہ نگاہوں سے دیکھتا اور اس کے بعد اپنے اوپر لعنت بھیجتا کہ میری اب یہ اوقات رہ گئی ہے!

مجھ سے زیادہ ان کا نزلہ شعبہ کے دوسرے رفقا پر گرا جس سے اُن کا رویّہ روز بروز تحکمانہ ہوتا گیا۔ خاص طور پر وہ مرزا خلیل احمد بیگ کی مجھ سے قربت اور شعبہ کے طلبہ میں ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو بالکل انگیز نہ کر سکے۔ اب تو یہ حال تھا کہ طالب علم اگر انتہائی معصومیت کے ساتھ اپنے تحقیقی کام کے نگراں کی حیثیت سے بیگ صاحب کا نام بھی لے دیتا تو وہ اس طالب علم کے دشمن ہو جاتے۔ مرزا خلیل احمد بیگ میرے لسانیات کے اوّلین طالب علموں میں تھے۔ میں ہمیشہ اُن کے علمی کام کی قدر کرتا رہا۔ لسانیات میں ان کی دلچسپی کے موضوعات وہی ہیں جن پر میں کام کرتا رہا ہوں۔ یعنی تاریخ اردو زبان اور اسلوبیات، وہ ہر کام کو نہایت سلیقے سے کرتے ہیں۔ ہاں غالبؔ کی طرح ستائش کی تمنا سے بے نیاز نہیں۔ عظیم صاحب کو اُن کا یہ رویّہ بھی کھلتا تھا۔ چنانچہ جب میں نے انھیں جامعہ اردو کے اعزازی خازن کے منصب کے لیے منتخب کیا تو اس وقت عظیم صاحب کی عین خواہش تھی کہ یہ ذمہ داری میں ڈاکٹر اصغر عباس (لکچرر شعبۂ اردو) کے سپرد کروں۔ خود عظیم صاحب اس وقت جامعہ اردو کے نائب شیخ الجامعہ تھے۔ انھوں نے میری اس تجویز کی جامعہ کی مجلس عام میں مخالفت تو نہیں کی لیکن دل سے قبول کبھی نہیں کیا۔ مجھ سے تو کچھ بن نہ پڑا، بیگ صاحب کی جانب سے رشک و حسد اور بڑھ گیا۔

مجھے ان واقعات اور بدلتے ہوئے حالات سے سخت تشویش رہتی۔ بالآخر میں نے اپنی ہمدردی کا وزن اپنے محروم طلبہ اور بیگ صاحب جیسے اساتذہ کی جانب ڈال دیا۔ چنانچہ دو ایک ملاقاتوں میں میں نے عظیم صاحب سے کھل کر باتیں کیں اور آخر میں صاف صاف کہہ دیا کہ کسی انسان کو خود کو خدا نہیں سمجھنا چاہیے۔ ذہن کی اسی بحرانی کیفیت میں جب لسانیات کی ایک انتخابی کمیٹی میں ڈاکٹر ہنس راج دُوآ کا تقرر ان کی سخت مخالفت کے باوجود ہو گیا، تو انھوں نے اگست ۱۹۸۷ء میں یونیورسٹی کے پروفیسر اور جامعہ اردو کے

نائب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے استعفا دے دیا۔ ہمدردوں کی دوڑ دھوپ سے انھوں نے مسلم یونیورسٹی سے تو اپنا استعفیٰ واپس لے لیا لیکن چوں کہ اس قسم کی کوئی کوشش جامعہ اردو کے سلسلے میں نہیں ہوئی وہ کچھ عرصے کے بعد منظور کر لیا گیا۔

اس کے بعد انھوں نے میرے یہاں کا آنا جانا بند کر دیا لیکن میری جانب ان کا احترام کا جذبہ قائم رہا۔ کچھ عرصے بعد، غالباً میرے احسانات کا بوجھ کم کرنے کے لیے انھوں نے شعبۂ لسانیات سے مجھے پروفیسر ایمریٹس بنانے کی تجویز منظور کرائی جو فیکلٹی، اکیڈمک کونسل سے متفقہ طور پر پاس ہوتی ہوئی بالآخر جولائی ۸۷ء میں یونیورسٹی کی ایکزیکیٹو کونسل نے منظور کر لی۔ عظیم صاحب اب خواہش مند تھے کہ میں پروفیسر ایمریٹس بننے پر ایک خطبہ دوں۔ جو میں نے "اردو زبان: تاریخ، تشکیل، تقدیر" کے عنوان سے ۱۳ر جنوری ۸۸ء کو وائس چانسلر سید ہاشم علی کی صدارت میں دیا۔ اس میں میں نے بہ بانگِ دہل کہا کہ "سرسید تا حال علی گڑھ نے اردو کے حق کو ادا نہیں کیا ہے" مجھے نہیں معلوم اس کا مجموعی اثر مجمع پر (جو بڑی تعداد میں تھا) کیا پڑا لیکن سید ہاشم علی نے خطبے کے اختتام پر یہ کہا کہ ان کے پیشِ نظر اردو کرسپانڈنٹ کورس کی تجویز ہے۔

بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ عظیم صاحب اور میرے تعلقات میں جو کشیدگی آگئی تھی وہ دور ہو چلی ہے۔ پروفیسر ایمریٹس کی حیثیت سے شعبۂ لسانیات میں میرے لیے ایک کمرہ بھی مخصوص کر دیا گیا۔ میں نے وہاں جانا شروع کر دیا کہ بدقسمتی سے وہ واقعہ پیش آیا جس کی بدولت ہم ایک دوسرے سے اور زیادہ دور ہو گئے۔ ۱۶ر فروری ۸۸ء کو لسانیات کی پروفیسری کا انٹرویو تھا۔ بہت دنوں کے بعد اس بار سید ہاشم علی صاحب نے مجھے بھی اس کمیٹی کا رکن نامزد کیا۔ میں نے کمیٹی کے سامنے بیگ صاحب کا معاملہ بالتفصیل زوردار طریقے پر پیش کیا۔ دو ہی امیدوار تھے، ڈاکٹر اقتدار حسین خاں اور ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ ڈاکٹر اقتدار حسین، بیگ صاحب سے صرف دو سال سینیئر تھے لیکن بیگ صاحب شعبۂ لسانیات کے پہلے پی ایچ۔ڈی تھے انھوں نے ڈاکٹر اقتدار حسین خاں سے چار سال اور عظیم صاحب سے ۲ سال قبل حاصل کی تھی۔ وہ سولن کے اردو ریسرچ سنٹر کی پرنسپلی کو چھوڑ کر یہاں آئے تھے

جس کا گریڈ ریڈر کے برابر تھا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اقتدار حسین خاں پروموشن کی پروفیسری کے مستحق بن چکے ہیں اور اس پر بآسانی ہو جائیں گے۔ دوسری جگہ پر بیگ صاحب کو کردیا جائے جو ملازمت میں کھانچا پڑ جانے کی وجہ سے پروموشن اسکیم سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن عظیم صاحب نے بعض اراکینِ انتخاب کمیٹی کا ذہن اس طرح متاثر کر رکھا تھا کہ میری ایک نہ چلی اور وائس چانسلر نے یہی فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر اقتدار حسین کا اِس پروفیسری پر تقرر کردیا جائے۔ میں اس بے انصافی کو (جو بیگ صاحب اور شعبۂ لسانیات دونوں سے تھی) برداشت نہ کر سکا اور مجھے اپنے ضمیر کو اختلافی نوٹ لکھ کر سبک سار کرنا پڑا۔

میری پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی اور یو۔جی۔سی سے پروموشن اسکیم میں توسیع کی اجازت دو ہفتے کے اندر آگئی! اگر میری تجویز کو مان لیا جاتا تو اقتدار حسین خاں صاحب اور بیگ صاحب دونوں اس وقت پروفیسر ہوتے اور شعبۂ لسانیات کا وقار بڑھ جاتا۔ مجھے سیّد ہاشم علی صاحب کے فیصلے اور فراست دونوں پر حیرت ہے۔

میرے اوپر عظیم صاحب کی کارگزاری اور وائس چانسلر کے فیصلے کی کمزوری دونوں کا بڑا اثر پڑا اور میں نے طے کر لیا کہ اب عظیم صاحب سے مصالحت کی کوئی شکل ممکن نہیں مگر واہ ری ریاکاری! کسی سے کہا کہ بیگ نے باپ کو بیٹے سے لڑوا دیا۔ کسی سے کہا کہ بیگ نے میری ساری عمر کی ریاضت برباد کردی۔ اس ریاضت ایک بار پھر باکار بنانے کا یہ منصوبہ بنایا گیا کہ مجھے 'نذرِ مسعود' کے نام سے ایک جلد پیش کی جائے۔ فوراً ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس میں بیگ صاحب کے علاوہ شعبے کے سارے اساتذہ کو شامل کیا گیا۔ باہر سے پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مختارالدین احمد اور ڈاکٹر اصغر عباس کے نام شامل کیے گئے۔ اتفاق سے جس روز مشورت کمیٹی کی پہلی میٹنگ تھی اس سے دو روز قبل سرور صاحب میرے یہاں آئے اور اس تجویز کا تذکرہ کیا۔ میں نے ان سے احترام کے ساتھ کہا: نذر تو اس وقت نذر ہوتی ہے جب قبول کرلی جائے جب میں اسے قبول کرنے کو تیار نہیں تو اس سعیٔ رائیگاں سے کیا حاصل۔ اُنھوں نے میرا اشارہ پالیا اور عظیم صاحب کو تیسرے روز میٹنگ سے قبل میری نیت اور اپنی معذرت لکھ بھیجی۔ کچھ اسی قسم کی گفتگو میں نے

مختارالدین صاحب سے بھی کی تھی۔ لیکن انھوں نے اس کے باوجود مشورت کے جلسے میں شرکت کی اور سرور صاحب کی رائے سن کر ایک بہت اچھی پیالی چائے کی پی کر فرحاں و شاداں میرے یہاں آئے اور ساری تفصیل سنائی سُنا ہے موصوف نے شام کو سرور صاحب کے یہاں پھر دھاوا بولا اور بربنائے اس خلوص کے جو انھیں مجھ سے ہے ان کو میرے اوپر اشہ انداز ہونے کے لیے آمادہ کرنا چاہا، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اب جس نسبت سے ان کی محبت مجھ سے بڑھتی جارہی ہے اِسی نسبت سے بیگ صاحب سے ان کی نفرت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ مجھے بیگ صاحب سے بھی زیادہ شعبۂ لسانیات کے مستقبل سے ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگلے پانچ سال میں یعنی اپنے ریٹائرڈ ہونے تک، پروفیسر عبدالعظیم شعبے کو مکمل طور پر تباہ کرجائینگے۔

خاندانی محاذ پر اس زمانے میں میں نے اپنی دوسری بیٹی نادرہ کی (جس نے انگریزی میں فرسٹ کلاس ایم۔ اے۔ کیا تھا) شادی سے فراغت حاصل کی۔ اس کا امتحان صرف ایک دن پہلے ختم ہوا اور دوسرے دن ناصر محمد خاں سے نکاح پڑھا دیا گیا۔ اس کے نانا قدوس عالم خاں صا سب کے لیے یہ نئی بات تھی کہ لڑکی نہ مایوں میں بیٹھی اور نہ اور رسمیں ہوئیں اور سیدھی دُلہن بنادی گئی۔ میں نے اب اپنی بچیوں کی شادی کے لیے ایک نئی تکنیک ایجاد کی۔ یعنی یہ گھر کے آنگن میں ہوگی اور اس میں دونوں طرف سے مدعوئین کی تعداد اس قدر محدود ہوگی کہ نکاح تا کھانا سب گھر کے اندر کیا جاسکے۔ مجھے خوشی ہے کہ ناصر محمد خاں کے والد فضل محمد خاں (مرحوم) نے اس سلسلے میں مجھ سے تعاون کیا، اس طرح فریقین بے جا اسراف سے بچ گئے۔ ناصر محمد خاں، علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہیں اور اس وقت جدہ میں سیل انجنیئر کی حیثیت سے ایک فرم میں کام کر رہے ہیں۔ نادرہ کی شادی میں جو طرز قائم ہوگیا اسی انداز پر میں نے ۶۸۶ میں باقی ماندہ دونوں بچیوں کا نکاح کیا۔

پندرھواں باب

"رخت بہ کاشمر کُشا....."

(۸۱ تا ۸۲ء)

پچھلے باب کی داستان میں تسلسل کی خاطر ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۸ء تک لے آیا ہوں۔ لیکن اس مدت میں چند اور واقعات رونما ہوئے جن کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔

یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ۱۹۷۸ء میں جامعہ ملّیہ سے واپس آکر میں نے دو سال تک شعبۂ لسانیات میں باز ملازمت کی جس پہ میرا تقرر پروفیسر علی محمد خسرو نے کیا تھا۔ نئے وائس چانسلر سیّد حامد باز ملازمت کے بارے میں زیادہ گرم جوش نہیں تھے اس لیے جب پروفیسر عبدالعظیم نے میری دو سال کی مدّت میں مزید توسیع کی خواہش کی تو انھوں نے باوجود ہمدردی کے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ ایک دو ماہ تک میں بیکار رہا۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۸۱ء میں اچانک پروانہ ملا کہ مجھے سال بھر کے لیے اپنے ہی شعبے میں وزٹنگ پروفیسر بنا دیا گیا ہے۔ یو۔ جی۔ سی کے قاعدے کے مطابق جس یونیورسٹی میں کسی نے ملازمت کی ہو وہاں اُسے وزٹنگ پروفیسر نہیں بنایا جاتا۔ بعد کو معلوم ہوا اس کے لیے سیّد حامد صاحب نے خاص طور پر یو۔ جی۔ سی کو لکھا تھا اور وہاں اس شرط کے ساتھ منظوری ملی تھی کہ اسے آئندہ کے لیے نظیر نہ بنایا جائے۔ چنانچہ اس طرح میں

مزید سال پھر شعبۂ لسانیات سے منسلک رہا۔ آخر کار ستمبر ۱۹۸۱ء میں مسلم یونیورسٹی کی ملازمت سے مکمل طور پر سبکدوش ہو گیا۔

دورانِ ملازمت مسلسل آمد و رفت کی وجہ سے میرے ریٹائرمنٹ بے نی فٹس پر بُرا اثر پڑا۔ جب ۱۹۶۸ء میں عثمانیہ سے علی گڑھ واپس آیا تو اس وقت تک پنشن اسکیم آ چکی تھی۔ میرے ریٹائر ہونے میں اس وقت ۹ سال دو مہینے تھے۔ اس خیال سے کہ تعلیمی سال کے دوران ریٹائر ہونے والوں کو سال کے آخر تک توسیع خود بخود مل جاتی ہے۔ میں نے پنشن اسکیم کا انتخاب کیا۔ پنشن کے لیے کم از کم دس سال کی مدتِ ملازمت درکار ہے۔ میری شومئی قسمت دورانِ ملازمت قاعدوں میں تبدیلی ہوئی اور توسیعِ ملازمت کا طریقہ ختم کر کے باز ملازمت کا جاری کیا گیا۔ باز ملازمت کی مدت کا شمار پنشن کے لیے نہیں کیا جاتا۔ اس طرح دس سال کی مدت میں میرے دس مہینے کم رہے۔ مجھے اب پراوِڈنڈ فنڈ کی اسکیم میں پھر جانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں پنشن کے حقوق سے کلیتہً محروم رہ گیا۔ قسطوں میں جو پراویڈنڈ فنڈ ملتا رہا وہ خرچ ہوتا رہا۔ اس سے واحد فائدہ میں مکان کی تعمیر میں اٹھا سکا۔ جس کے لیے میں نے ۱۹۵۵ء میں بہت سستے داموں دو بیگھ کا پلاٹ یونیورسٹی کیمپس کے بالکل قریب خرید لیا تھا۔ چنانچہ یونیورسٹی سے جب ۱۹۸۱ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوا ہوں تو میرے پاس پراویڈنڈ فنڈ کے چند ہزار کی رقم کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ہمیشہ اچھا کھایا اُجلا پہنا، اس لیے پس انداز کچھ نہ کر سکا۔

علی گڑھ کے شعبۂ لسانیات میں میری وزٹنگ پروفیسری کی مدت ختم ہوئے ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ کشمیری یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں میرا تین ماہ کے لیے بحیثیت وزٹنگ پروفیسر تقرر ہو گیا۔ میں وہاں ستمبر ۸۲ء کے وسط میں پہنچا اور ۱۵ دسمبر تک فرائض انجام دیئے۔ چلتے وقت یونیورسٹی نے مارچ ۸۳ء سے ایک تعلیمی سال کے لیے پھر اس حیثیت میں میرے تقرر کی توسیع کی۔ دو حصوں میں میرا تقرر صرف تعطیلات کی تنخواہ بچانے کی نیت سے کیا گیا۔

میں اس پر بھی خوش تھا، دو وجہوں سے، ایک تو لسانیات سے مجھے ایک بار پھر شعر و ادب کی جانب گریز کرنے کا موقع ملا اور دوسری خوشی کی بات میرے لیے یہ تھی کہ جنتِ ارضی میں ایک بار پھر طویل قیام کا موقع مل گیا۔ تکلیف صرف کھانے کی تھی۔ ابتدا میں مَیں نے گیسٹ ہاؤس کے میس میں کھانا شروع کیا لیکن بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ گاڑی یوں نہ چل سکے گی۔ چنانچہ مارچ ۸۳ء میں تعلیمی سال کے آغاز سے میں نے طے کر لیا کہ اب دستِ خود دہانِ خود کا تجربہ رہے گا۔ کھانا پکانے کے فن سے میں قطعاً ناواقف ہوں۔ اس سلسلے میں مَیں نے ایک اچھے برہمن کی طرح ہمیشہ اپنی نصف بہتر کا سہارا لیا ہے جو اتفاق سے اس فن کی ماہر ہیں۔ ہمیشہ انھیں کے ہاتھ کا پکا یا کھایا، حالاں کہ میں اس طبی قول سے واقف ہوں کہ "حملۂ قلب، کو دعوت دینا ہو تو ایک خوب صورت اور عمدہ کھانا پکانے والی عورت سے شادی کر لو"۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ دونوں صفات سے متّصف ہونے کے باوجود میری بیوی میرے لیے 'دل شکنی' کا باعث اب تک نہیں ہوئیں، بلکہ ہمیشہ راحتِ جاں کے ساتھ ساتھ قوتِ دل کا باعث بنی رہیں۔ بہر حال اس زمانے میں طبّاخی کے نئے نئے تجربے خوب ہوئے۔ گوشت تو 'مینو' سے قطعاً خارج رہا۔ لیکن ارہر کی دال پکاتا تو مونگ کی دال بن جاتی۔ تنگ آ کر دودھ، ڈبل روٹی اور انڈے پر اکتفا کیا۔ البتہ خشک و تازہ میوہ جات کا کثرت سے استعمال رہا۔ کچھ ہی عرصے میں تقلیلِ بدن کا عمل شروع ہو گیا اور تلخیص نکل آئی لیکن صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑا۔ ہلکا پھلکا ہونے کے ساتھ چاق چوبند محسوس کرنے لگا، ناشپاتی اور بگوگوشوں نے گالوں پر غازہ سا پھیر دیا۔ ہماری فاقہ مستی اس طرح رنگ لائی۔ جون ۸۳ء میں بنجہ آ گئیں، اور خاں صاحب کا پھر ٹھاٹھی 'کھانا شروع ہو گیا۔ کشمیر کا گوشت دلبشرطیکہ وہ کشمیری بھیڑ کا ہو پنجابی بھیڑ کا نہیں نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ بجلی کے اسٹو ہی پر بنجہ اپنے فنِ طباخی کا کمال دکھانے لگیں، اس طرح کہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طالبات کے لیے لنگر سا کھل گیا۔ خاں صاحب کے جسم پر 'ڈنلپ فوم' پھر سے چڑھنے لگا

اس دور کی فاقہ مستی اور لذّت پرستی یہ سب تیاری تھی علامہ اقبال کے فکر و فن سے نمٹنے کے لیے۔ چنانچہ جلد ہی میں نے مکمل دل جمعی کے ساتھ خود کو اس کام میں جھونک دیا۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ تھوڑے سے فاصلے پر اقبال لائبریری کے ایک حصے میں واقع تھا۔ یہ شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی دور بینی اور پروفیسر آل احمد سرور کی محنت کا ثمرہ تھا۔ سرور صاحب پہلے نو قائم کردہ 'اقبال چیئر' پر ۱۹۷۷ء میں پروفیسر کی حیثیت سے آئے تھے۔ چند سال کے بعد اس نے ایک انسٹی ٹیوٹ کی شکل اختیار کر لی جہاں اقبال اور متعلقاتِ اقبال پر تحقیقی کام ہوتا تھا۔ سرور صاحب کے علاوہ یہاں

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی اور سید محمد امین اندرابی صاحب مستقل حیثیت سے کام کر رہے تھے اور ایک جگہ وزٹنگ پروفیسر کے لیئے مخصوص تھی۔ مجھ سے قبل اس جگہ پر عالم خوندمیری صاحب کام کر چکے تھے۔ انسٹی ٹیوٹ کے پاس اقبال اور متعلقات پر مشتمل ایک اچھی لائبریری تھی جہاں پاکستانی مطبوعات اور رسائل دستیاب تھے۔ کئی طالب علم اقبال سے متعلق موضوعات پر ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی۔ کے لیئے کام کر رہے تھے۔ میرے ذمہ متفرق کام تھے جن میں اپنے منتخب کردہ موضوع پر لکچر دینے کے علاوہ اقبال کے فکر و فن کے کسی موضوع پر ایک کتابچہ بھی تصنیف کرنا تھا۔ اتفاق سے سرور صاحب نے جس طالبہ، طالعہ مخدومی کو میری نگرانی میں دیا وہ اقبال کے تصوراتِ جمالیات پر کام کر رہی تھیں۔ انھیں معیاری کام کرانے کے لیئے مجھے خود بھی اس موضوع پر مطالعہ کرنا پڑا۔ اس طرح اس مختصر سے رسالے۔ 'اقبال کی نظری و عملی شعریات'۔ کی داغ بیل پڑی جس پر ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی نے مجھے ۱۹۸۴ء کا اردو انعام دیا۔ میں نے اس میں اقبال کے شعریاتی تصوریات سے بحث کرنے کے علاوہ لسانیاتی اسلوبیات کے نقطۂ نظر سے اقبال کے صوتی آہنگ کا جائزہ لیا ہے اور نمونتہً چند نظموں کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ غالباً میری تنقید کا یہی نیا انداز تھا جس کی وجہ سے مجھے ساہتیہ اکیڈمی کے ایوارڈ کا مستحق سمجھا گیا۔

انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام سال میں ایک دو کل ہند پیمانے پر اقبال پر سمینار بھی منعقد کرائے جاتے تھے۔ جن میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ بعد کو انسٹی ٹیوٹ کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہوتا۔ اب تک اس طرح کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں اقبال کے فکر و فن کے مختلف گوشوں پر لکھے ہوئے میرے بھی کئی مضامین شامل ہیں۔

کشمیر کے قیام میں میرے اندر کا شاعر آخری بار جاگ اٹھا۔ میں نے پہلا شعر ۱۹۳۲ء میں جب میں اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں کشمیر گیا تھا، کہا تھا۔

نہیں نہیں نہیں جاتے تم اس طرف کو مگر
قدم قدم پہ یہ لرزہ قدم کا کیسا ہے

اور آخری شعر بھی وہیں ۱۹۸۲ء میں پچاس برس کے بعد کہا سہ

ہر گلی کوچے میں، ہر موڑ پہ وہ ہی آہٹ
کیسا یہ شہر ہے، ہر راہ میں تم ہی تم ہو!

میں نے ۱۹۵۶ء تک جو کچھ کہا تھا اس کا انتخاب "دو نیم" کے نام سے اسی سال شائع کرا دیا تھا۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شعر کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ اس کا باعث کچھ میری عملی زندگی کی مصروفیات اور کچھ مطالعۂ لسانیات تھا۔ بہر حال نہیں کہہ سکتا کہ تخیل و جذبات کو ۶۲ برس کی عمر میں اس جنتِ ارضی میں کس چیز یا شخص، نے مشتعل کیا کہ شعر پھر اُبل پڑا۔ شام کو میں نسیم باغ کے سامنے جھیل ڈل کے کنارے لگے ہوئے چمن میں پابندی سے ٹہلنے جاتا۔ وہیں شعر کا نزول ہوتا۔ دو غزلیں تو عین اس قطعۂ چمن میں لکھیں جہاں آج شیخ محمد عبداللہ آسودۂ خواب ہیں۔ ایک کو "وادیٔ گل" کا عنوان دے کر میں نے دو نیم کے نئے ایڈیشن (۱۹۸۶ء) کی نظموں میں شامل کر دیا اور دوسرے کو بلا عنوان کی غزل رہنے دیا۔ جیسا کہ بار بار کہہ چکا ہوں کہ میری شاعری، میری اصل خود نوشت ہے لیکن اسے بین السطور دیکھنا ہو گا:

وادیٔ گُل

دید ہی دید ہے اے عمرِ رواں! کچھ بھی نہیں
یہ جہاں کتنا حسین ہے، یہ جہاں کچھ بھی نہیں
یہ تبسّم، یہ تکلّم، یہ تماشا، یہ نگہ،
یوں تو سب کچھ ہے یہاں اور یہاں کچھ بھی نہیں
تیرے ابرو سے سوادِ نگہِ تشنۂ خوں
تیر جب نکلا کماں سے تو کماں کچھ بھی نہیں

عمر کے فاصلے طے کر نہ سکا جذبۂ شوق

خونِ دل کچھ بھی نہیں، قلبِ تپاں کچھ بھی نہیں

ڈھونڈھیے چل کے کہیں عمرِ گذشتہ کا سراغ

کشتیٔ دل کے لیے سیلِ زماں کچھ بھی نہیں

ان نظاروں میں نظر اپنی بھی جانب مسعودؔ

وادیٔ گل میں بجز دل کا زیاں کچھ بھی نہیں (کشمیر، ستمبر ۱۹۶۸ء)

کیا اس میں "ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا" کی حسرت اور "دل کو خوں کرنے کی فرصت ہی سہی" کا احساس نہیں ملتا؟

یہ حسرت جب کسی شخص کی تمنا کا پیکر اختیار کر لیتی ہے تو غزل کا یہ پیکر اختیار کر لیتی ہے:

ترے خیال سے رقصِ رواں ہے میری غزل

تری نگاہ سے اب تک جواں ہے میری غزل

یہ لفظ و معنی کا رشتہ یہ میرا، تیرا وجود

ذرا میں پیدا، ذرا میں نہاں ہے میری غزل

ہدف شناس! یہ دل تیرے انتظار میں ہے

تری نظر کے لیے تو کماں ہے میری غزل

مِرے وجود میں پنہاں ہوں مثلِ آتشِ گل

مرے وجود میں جیسے نہاں ہے میری غزل

تری نگاہ نے بخشی وہ رفعتِ جذبات

کہ اس زمین میں بھی آسماں ہے میری غزل

کہاں سے اہلِ سخن لائیں طالعِ مسعودؔ

وہاں گذر نہیں ممکن، جہاں ہے میری غزل

(کشمیر، اکتوبر ۱۹۶۸ء)

لیکن یہ ۶۲ برس کی عمر کی شاعری تھی جب کہ کہا جاتا ہے کہ فنِ شعر کی عمر اس کے نصف برابر ہوتی ہے۔ محرکات موثر طریقے پر اسی وقت کارگر ہوتے ہیں جب زمین تیار ہو۔ آپ لاکھ ساٹھے پاٹھے ہوں، شعر کی دیوی کی نظر میں تو آپ کچھ سٹھیائے ہی کہے جائیں گے۔

کشمیر کے قیام میں مجھے کئی دلچسپ تجربے ہوئے۔ ایک تو اس زیریں رقابت کے جذبے کا احساس ہوا جو کشمیریوں اور غیر کشمیریوں کے درمیان رہتا تھا۔ یہ کبھی کبھی اخباروں کے کے مزاحیہ کالم میں اس انداز میں اُبھر آتا تھا کہ "شمالی ہند کی جتنی بوڑھی گائیں ہیں، ہماری شاداب وادی میں چرنے چلی آتی ہیں"۔ کبھی کشمیری مچھلی اور پنجابی مچھلی یا کشمیری بھیڑ اور پنجابی بھیڑ کی تفریق میں ظاہر ہوتا تھا۔ دراصل (شاید تاریخی اسباب کی بنا پر) کشمیری زبان میں پنجابی' 'غیر ملکی' کے لیئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک طالبہ نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ مجھے اور سرور صاحب کو 'علی گڑھ کا پنجابی' کہتی ہیں!

اتفاق سے "شمالی ہند کی یہ بوڑھی گائیں" کشمیر یونیورسٹی میں خاصی تعداد میں موجود تھیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں! ابتدا سے وائس چانسلر بھی سب کے سب غیر کشمیری ہوتے رہے۔ جب میں وہاں تھا تو وحید الدین ملک صاحب وائس چانسلر تھے۔ وہ زبان کے پھوہڑ تھے اس وجہ سے بھی علی گڑھ والوں کا پنجابی ہونا ثابت ہو جاتا تھا۔ ان کا اپنے رجسٹرار پر (جو کشمیری تھے) خفگی کا ایک عالم میں نے بھی دیکھا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ایک جلسے میں تشریف لائے تھے۔ جلسے کے بعد سب لوگوں کو اقبال لائبریری میں ایک نمائش کے افتتاح کے لیئے جانا تھا۔ ظاہر ہے وائس چانسلر صاحب شیخ صاحب کی کار میں تھے۔ کار اقبال لائبریری کے دروازے پر پہنچی۔ لوگوں نے بڑھ کر شیخ کو نرغے میں لے لیا۔ اتنے میں کار کا دروازہ جو بند ہونے کے خود کار آلے سے مسلح تھا، بند ہو گیا۔ وائس چانسلر صاحب کار کے اندر رہ گئے۔ شیخ صاحب کی پذیرائی کی گھما گھمی میں کسی نے یہ تک نہیں دیکھا کہ وائس چانسلر کہاں ہیں۔ وہ اندر سے کار کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کرتے

رہے مگر سیکورٹی کا یہ دروازہ کیوں کر کھلتا۔ بہر حال شیخ صاحب نے مقررہ مقام پر پہنچ کر نمائش کے افتتاح کا فیتہ کاٹا اور اسے دیکھنے کے لیے ہجوم کے ساتھ ہال کے اندر داخل ہو گئے۔ اس وقت کسی کو وائس چانسلر کی غیر حاضری کا احساس ہوا تو انھیں کار کا دروازہ کھول کر لایا گیا۔ رجسٹرار یونیورسٹی شرمندہ کھڑے تھے اور وائس چانسلر صاحب نمائش کے دروازے پر کھڑے ہوئے انھیں بے نقط سنا رہے تھے۔ ایک نمائش ہال کے اندر تھی اور ایک تماشا ہال کے باہر ہو رہا تھا!

کشمیریوں کا غیر کشمیریوں کے بارے میں جو احساس تھا، میرے خیال میں اس کی ذمہ داری غیر کشمیریوں پر بھی تھی۔ وہی احساسِ برتری کا جذبہ، جس کی ہمیں شکایت انگریزوں سے رہی ہے۔ میں نے دیکھا کہ باہر سے آئے ہوئے لوگ جو کشمیریوں کی سطح پر اتر کر ان کے جذبات و خیالات کا احترام کرتے ہیں، وہ ان میں محترم اور عزیز رہتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر رئیس احمد کو پروفیسر وحید الدّین ملک سے زیادہ مقبول پایا۔ ایک اسلامی ذہن کے کشمیری استاد نے تو مجھ سے یہاں تک کہہ دیا کہ اسلامی شعائر کے پابند ملک سے تو کمیونسٹ رئیس احمد اچھے تھے کہ وہ انسان کی عزت کرنا جانتے تھے، اور ہمیشہ معقولیت سے کام لیتے تھے۔ شعبۂ اردو میں پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کو جتنی مقبولیت حاصل رہی۔ اردو کے کسی دوسرے پروفیسر کو نہیں رہی۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنے قیام کے تھوڑے ہی عرصے میں اردو ادب سے متعلق کشمیریوں کی خدمات پر کئی تصانیف لکھ ڈالیں۔

عام طور پر اہلِ کشمیر نے اردو کو اپنی تعلیمی و سرکاری زبان کی حیثیت سے شیخ محمد عبداللہ مرحوم کی قیادت میں تسلیم کر لیا تھا۔ اُردو کی اہمیت اس لیے بھی تھی کہ یہ کشمیر کے تین مختلف اللسان علاقوں۔ جموّں، لدّاخ اور وادیٔ کشمیر۔ کے درمیان ایک رابطے کی زبان کا حکم رکھتی ہے۔ تاہم نوجوان کشمیریوں میں کشمیری کو سر آمد بنانے کا جذبہ خاصا شدید تھا۔ اسی کے تحت کشمیر یونیورسٹی میں کشمیری کا شعبہ قائم کیا گیا جس کے سربراہ کشمیری کے مشہور شاعر رحمان راہی تھے۔ وہ کشمیری تحریک

کے میرِ کارواں تھے اور اردو فارسی کی اچھی استعداد رکھنے کے باوجود اردو والوں کی جانب سے شاکی اور مشتبہ رہتے تھے۔ میں نے جب ان سے لِسانیاتی سطح پر کشمیری زبان کے سلسلے میں ہمدردی کی باتیں کیں تو کچھ مطمئن ہوئے اور کھلے۔ میں نے صاف الفاظ میں کہا اپنی مادری زبان کے سلسلے میں اُن کے جو عزائم ہیں اردو والوں کو ان کا احترام کرنا چاہیئے۔ اردو کو کشمیر میں قائم رہنے کا حق اسی وقت ہے جب تک اہلِ کشمیر اپنی ضرورت کے مطابق اسے رکھنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ کہ خود ہندی والوں سے انصاف کے طالب ہیں وہ کشمیری کا حق کیوں کر سلب کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ اس سے قبل بیان کر چکا ہوں، میں اگست ۱۹۸۱ء میں علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی کی ملازمت سے مکمل طور پر سبکدوش ہو گیا تھا، یعنی دو سال باز ملازمت اور ایک سال وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد۔ ابھی بے کار رہتے مجھے ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ پروفیسر آل احمد سرور کی تحریک پر مجھے کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں پہلے تین ماہ اور اس کے بعد مزید ایک تعلیمی سال کے لیئے وزٹنگ پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ کشمیر میں پہلی بار اسکول کے ایک طالبِ علم کی حیثیت سے ۱۹۳۲ء میں آیا تھا۔ طویل وقفے کے بعد دوسری بار ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیئے حیدر آباد سے ۱۹۶۶ء آنا ہوا۔ اس کے بعد کئی بار مختصر مدت کے لیئے اس جنّتِ ارضی کا چکّر لگایا لیکن بھر پور انداز میں یہاں قیام کا موقع یا تو ۱۹۳۲ء میں ملا تھا یا اِس بار ۸۲ء، ۸۳ء میں۔

وہاں میرا قیام یونیورسٹی کیمپس میں نسیم باغ میں تھا جہاں مجھے پہلے ایک کمرہ اور جون ۸۳ء میں بیوی کے آجانے کے بعد دو کمرے رہائش کے لیئے دیئے گئے تھے۔ اکبر بادشاہ کا بنا کردہ چنار کا یہ باغ جھیل ڈل کے کنارے واقع ہے جہاں سے جھیل کا پُر لطف نظارہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ عین وسط میں 'چار چناری'، کا جزیرہ ہے اور ڈل کے دوسرے کنارے پر چشمہ شاہی، شالامار اور نشاط باغ تھے۔ مُغلیہ عہد کی صبح و شام کی دلچسپیوں کا

ذکر کسی شاعر نے اس انداز میں کیا ہے ؎

صبح در باغِ نشاط و شام در باغِ نسیم

چناروں کی کثرت کی وجہ سے نسیم باغ کے باشندے موسمِ سرما میں دھوپ سے محروم رہتے ہیں لیکن اگست کے گرم مہینے میں بھی یہاں بجلی کے پنکھے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ موسم خزاں میں رنگوں کی وہ بہار ہوتی ہے جیسے چناروں کے درختوں میں آگ سی لگ گئی ہو۔ سردی کا موسم آتے آتے یہ درخت برہنہ (مادر زاد برہنہ) ہو جاتے ہیں۔ پتے سوکھ کر زمین پر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ کشمیریوں کی سردی کے موسم کی مونس "کانگڑی" کے لیے چنار کے پتوں کا ایندھن سب سے اچھا سمجھا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ برہمنی کے دل کی مانند مسلسل سلگتا رہتا ہے۔ کشمیری کانگڑی کو ساتھ لے کر سو بھی جاتے ہیں۔

جی گھبراتا تو شکارا، کرایے پر لے لیتا اور ڈل کو پار کر کے نشاط باغ یا شالامار ۱ جا پہنچتا۔ اس سے زیادہ پُر سکون سفر کا تجربہ مجھے اور کہیں نہیں ہوا۔ اتوار کا دن بالعموم دریائے جہلم کے کنارے "بند" پر گزرتا، جہاں "احدوس"، یا کسی اور ریستوران میں مُنہ کا مزہ بدلنے کے لیے کشمیری "گوشتابہ" کا لطف اٹھاتا اور پھر "بند" کے چکر لگاتا۔ ۳۲ء میں جب میں کشمیر آیا تھا تو اسی "بند" کے کنارے سرکاری کوارٹروں میں ڈھائی مہینے تک میرا قیام رہا تھا اس لیے اس کی یادیں حافظے میں تازہ ہو جاتیں۔ میرے ایک کشمیری واقف کار، جو آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھے، مجھے وہاں اکثر ٹہلتا پا کر ایک روز کہنے لگے آپ کو تو "بند" سے عشق سا ہو گیا ہے۔ میں نے کہا عشق اور وحشت میں صرف ایک قدم کا فاصلہ ہوتا ہے۔ میں اس جنتِ ارضی میں تنہائی کی وحشت کو بہلانے یہاں آجاتا ہوں۔

---

۱ میں جب ستمبر ۸۲ء میں کشمیر پہنچا تو شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ حیات تھے اور صاحبِ اقتدار۔ اس سے قبل میں اُن سے دو تین بار دہلی میں مل چکا تھا۔ جامعہ اُردو

نے جب شریمتی اندرا گاندھی کو 'ڈکٹورِ ادب' کی اعزازی سند دہلی یونیورسٹی کے شنکر ہال میں منعقدہ خاص کنووکیشن میں دی تھی، تو وہ اور ڈاکٹر کرن سنگھ دونوں اس میں موجود تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ڈاکٹر کرن سنگھ مرکزی وزارت میں شامل تھے اور شیخ صاحب ابھی تک مسندِ وزارت سے محروم تھے۔ اس کے بعد دوسری ملاقات حکیم عبدالحمید صاحب کے دولت کدے پر ایک دعوت میں ہوئی تھی اس وقت ان کا اندازِ گفتگو کسی حد تک جارحانہ تھا۔ سردار پٹیل پر طنز کرتے رہے حتیٰ کہ جب میں نے اردو کی کس میرسی پر گفتگو کرنا چاہی تو اسے بھی انھوں نے ایک غیر اہم موضوع قرار دیا۔ اس صحبت میں مجھے مرزا افضل بیگ ان سے زیادہ سمجھدار اور ٹھہرے نظر آئے۔ بات کم کرتے تھے مگر تول کر۔ مشہور تھا شیخ صاحب کے 'نفسِ غیر ناطقہ' وہی تھے۔

لیکن اس کے بعد جب ایک بار شیخ صاحب جامعہ ملّیہ تشریف لائے تو انھیں بالکل بدلا ہوا پایا۔ اب وہ ملّت کی باتیں بھی کر رہے تھے، اردو کی بھی اور اقبال کی بھی۔ ان کے ایثار اور قربانیوں کے پیشِ نظر میرے دل میں ان کا بڑا احترام تھا۔ کشمیر پہنچ کر مجھے کشمیریوں کو شیخ صاحب سے جو عقیدت تھی اور شیخ صاحب کو اقبال سے اس کا صحیح اندازہ ہوا۔ انھوں نے نہ صرف اقبال چیئر اور اقبال انسٹی ٹیوٹ کی داغ بیل ڈالی بلکہ کشمیر یونیورسٹی کی لائبریری کا نام بھی اقبال لائبریری رکھا۔ شیخ صاحب کی کشمیر اور کشمیریوں کے لیے قربانیوں کا اعتراف ہر شخص کی زبان پر تھا سوائے نوہٹّہ کے علاقے کے میر واعظ اور چند قدیم خاندانوں کے بعض افراد کے۔ ان میں سے بعض کا خیال تھا کہ ہم تو اُس 'شیخ' کے قائل ہیں جو ہماری آزادی کی تحریک کا ہیرو اور 'شیر' رہا ہے'۔ اُس 'شیخ' کے نہیں جو وزارتِ عظمیٰ کا مسند نشیں ہو کر اپنے اہلِ خاندان کا مربّی بن گیا ہے۔ انھوں نے اپنے 'یارِ غار' مرزا افضل بیگ کو کشمیر کی سیاست سے دودھ کی مکھّی کی طرح نکال باہر کیا؛ اس کا بھی لوگوں کو قلق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب شیخ صاحب

آخری بار افضل بیگ کی عیادت کو گئے تو انھوں نے بسترِ مرگ پر کہا "شیخ صاحب! میں ہمیشہ آپ کے پیچھے چلا ہوں۔ اب میں آپ سے آگے جا رہا ہوں آپ میرے پیچھے آئیے"۔

شیخ صاحب کو آخری بار میں نے ۱۵ / اگست ۸۲ء گورنمنٹ سینٹرل ایمپوریم کے لان پر یومِ آزادی کی تقریب میں دیکھا۔ وہ صحت کے اعتبار سے اس وقت تک بالکل ٹوٹ چکے تھے۔ اس قابل بھی نہیں رہے تھے کہ لوگوں سے کھڑے ہو کر ہاتھ ملا سکیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا کیے جیسے فرضِ کفایہ ادا کرنے آگئے ہوں۔ موٹر میں اپنی نشست تک آئے اور موٹر ہی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ تین ہفتے کے بعد، ستمبر کو اپنے مولا سے جا ملے۔

ان کی تدفین کا منظر میں نے نسیم باغ سے دیکھا۔ یہ ڈل کے کنارے عین اُسی مقام پر ہوئی جہاں میں روز شام کو ٹہلنے جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ جگہ انھوں نے اپنے لیے پہلے سے مختص کر لی تھی۔ ڈل کے کنارے اس چمن کے ایک کنارے پر حضرت بل کی درگاہ ہے، جہاں شیرِ کشمیر ہر جمعہ کو نماز کے بعد گرجتا تھا اور دوسرے کنارے پر ان کی آخری آرام گاہ ہے۔ میرا بس چلتا تو حضرت بل جیسی دوسری سنگِ مرمر کی پاکیزہ عمارت شیخ صاحب کے مزار پر بنوا دیتا!

شیخ صاحب کی تدفین کا منظر دیدنی تھا۔ ایک شورِ ماتم تھا جس میں بچّے، بوڑھے مرد، عورتیں، شہری، دیہاتی سب شریک تھے۔ تدفین کے بعد عقیدت کا یہ منظر بھی دیکھا کہ لوگ ...ں میں ان کے مرقد کی ... بھر کر تبرک کے طور پر ساتھ لے گئے۔ یہ غالباً بودھوں کا کشمیری اسلام پر اثر تھا۔ یہ اثر ان کے طرزِ عبارت پر بھی نظر آیا۔ حضرت بل میں نماز پانچ منٹ کی ہوتی تو قُل، گھنٹہ بھر تک ہوتا رہتا۔ لا الٰہ الا اللہ کی آواز جب ڈل کے پانی پر چاروں طرف کے پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس آتی تو بقولِ اقبال، "شبستانِ وجود لرز اٹھتا۔"

کشمیر کے دورانِ قیام میں، میں کچھ دنوں کے لیے اپنی عقلیت کو بالائے طاق رکھ کر درگاہی بن گیا تھا۔ ہاری پربت کے دامن میں مخدوم صاحب کی بڑی درگاہ ہے جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ وادیٔ کشمیر کے ولی ہیں اور یہاں ہر کام ان کے حکم سے ہوتا ہے۔ میں اس زمانے میں اپنے اکلوتے بیٹے جاوید کی جانب سے بہت متردّد رہتا تھا۔ اس نے نیویارک یونیورسٹی سے فزکس میں پی ایچ ڈی امتیازات کے ساتھ کر لی تھی اور اب میری خواہش تھی کہ وہ ہندوستان واپس آکر اپنا گھر بسائے۔ کشمیر یونیورسٹی کے فزکس ڈپارٹمنٹ میں اس کا بحیثیت لیکچرر انٹرویو کے بغیر تقرر بھی ہو گیا تھا۔ گھر بسانے کے سلسلے میں اُس کا ذہن صاف نہیں تھا ذرا میں ہاں اور ذرا میں نہ۔ ہم لوگ چاہتے تھے کہ جس طرح ہو یہ طائر رمیدہ زیرِ دام آجائے۔ ظاہر ایسے میں جہاں کسی اچھی لڑکی پر نظر پڑتی تو دل میں منصوبے بننا شروع ہو جاتے تھے۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ میں مخدوم صاحب کے خاندان کی ایک طالبہ، طالعہ مخدومی ریسرچ کر رہی تھیں چوں کہ ان کا موضوع "اقبال کے تصوراتِ فن و جمالیات" تھا اس لیے سرور صاحب نے خاص طور پر مجھے اُن کی نگرانی پر مامور کیا۔ کچھ عرصے میں نہ صرف طالعہ کے جوہر مجھ پر کھلے وہ بھی میرے حُسنِ سلوک کی وجہ سے مجھ سے بہت زیادہ مانوس ہوتی گئیں۔ ان کے والد عرصے سے بیمار اور حواس باختہ تھے۔ ممکن ہے انھیں میری شفقت میں ایک پدرانہ محبت کا بدل ملنے لگا ہو۔ جون ۸۳ء میں جب میری بیوی بھی سری نگر آگئیں تو طالعہ ان کی شخصیت سے بھی بہت متاثر ہوئیں اور ایک دن کہنے لگیں میری والدہ اور ان میں ہر اعتبار سے بڑی مشابہت ہے "بس ایک کو چھپاؤ اور دوسرے کو نکالو"

میری نظروں نے بہت جلد جاوید کے لیے طالعہ کا انتخاب کر لیا۔ میں نے ان سے غائبانہ طور [illegible] کا تعارف بھی کرا دیا۔ اسی زمانے میں جاوید کا کشمیر یونیورسٹی میں لیکچرر [illegible] سے انتخاب عمل میں آگیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ سب وادی کے

ولی مخدوم صاحب کے حکم سے ہو رہا ہے اس لیئے میں نے ہر اتوار کی صبح باوضو ان کی درگاہ پر حاضری دینی شروع کردی۔ یہ ذہن میں رہے کہ اس قسم کی حرکت میں نے کبھی چوبیس خواجاؤں کی چوکھٹ والی دلّی میں بھی نہیں کی تھی، اس لیئے کہ میرا ذہن کسی بھی قسم کی مزار پرستی کو قبول نہیں کرتا۔ مزاروں کے عود و لوبان کی خوشبو اور قُل اور قوالی کے شور سے میری سوچنے کی صلاحیت مفقود سی ہو جاتی ہے لیکن بہر حال مخدوم صاحب کی درگاہ میں بڑی عقیدت سے جاتا، دیر تک آنکھیں بند کیئے بیٹھا رہتا اور اُن سے انھیں کے خاندان کی ایک لڑکی کا طالب ہوتا۔

اِدھر میں نے جاوید کو امریکہ خط لکھ کر ٹٹولنا شروع کیا۔ کبھی امید بندھتی تھی اور پھر ٹوٹ جاتی تھی۔ جب اس نے کشمیر کی ملازمت کی پیش کش کو بالآخر ٹھکرا دیا اور شادی کے مسئلے پر بھی گفتگو کرنے سے انکار کر دیا تو میرے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ مجھے اس سے بھی شکایت ہوئی اور مخدوم صاحب سے بھی جو اس کے دل کو نہ بدل سکے۔ ایک دن شکارے میں بیٹھ کر ڈل کو پار کیا اور نشاط باغ جا کر اضطراب کے عالم میں جاوید کو خوب کوسا اور بد دعائیں دیں۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ بس جھیل ڈل مجھے ایک بڑی چشمِ پُر آب کے مانند نظر آرہی تھی!

اس عیوضی محبت، کی جانب میں نے قدم جس احتیاط سے بڑھائے تھے اسی احتیاط سے پیچھے ہٹا لیئے۔ کچھ عرصے کے بعد طالعہ کی شادی ہو گئی۔

میں اقبال کے فکر و فن کا شائق اپنی طالب علمی کے زمانے سے رہا ہوں۔ اس کے بعد ایم۔ اے کی کلاسوں کو مدتوں اقبالیات کا درس دیتا رہا ہوں۔ لیکن جس یکسوئی کے ساتھ مجھے اقبال کے مطالعے کا موقع اپنے کشمیر کے سوا سالہ قیام میں ملا اور کہیں نہیں ملا۔ اس سے میری عقیدت مطالعہ کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی گئی۔ یہ مطالعہ میں ایک مکمل سپردگی کے ساتھ کرتا۔ اور میرا یہ خیال راسخ ہوتا

گیا کہ کسی بڑے شاعر کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لیئے خود کو اس کے حوالے کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے اردو کے عظیم شاعر صرف دو ہیں۔ غالب اور اقبالؔ، اور اقبالؔ کو منظم فکر کے اعتبار سے غالبؔ پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ اسی زمانے میں رفتہ رفتہ مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ میں اقبال کی فکر کے تمام پہلوؤں سے متفق نہیں ہوں۔ ان کی فکر کی مابعد الطبعیاتی سطح اور اس کے تصوّرات ــ خودیٔ عشق، وجدان، عظمتِ آدم مردِ مومن تصوّرِ ابلیس وغیرہ میں بہت جاذبیت اور عمومیت پائی لیکن جب وہ اس سطح سے اتر کر معاشرتی مسائل پر آتے ہیں تو وہاں میرا آزاد ذہن ان کا ساتھ نہیں دیتا تھا اور میں انھیں اسلام کی آڑ میں بہت زیادہ قدامت پسند پاتا تھا۔ میں خود نوشت کے گذشتہ ابواب میں مسلسل یہ اشارہ کرتا آیا ہوں کہ بچپن سے میرا ذہن آزاد خیالی کی طرف مائل رہا ہے اور میں نے ہر مذہب کو (بہ شمول اسلام) عقلیت کے معیاروں پر پرکھنے کی کوشش کی ہے، خاص طور پر مذاہب کی فروعات کو۔ اقبال اپنی مذہبی فکر میں (اور نتیجۃً معاشرتی افکار میں) ہندوستانی مسلمانوں کے متوسط طبقے کے اندازِ فکر سے آگے نہ جا سکے۔ وہ فقہِ اسلامی کی از سرِ نو تدوین کرنے کا عزم رکھتے تھے اور ایک جگہ کہا بھی ہے کہ اس دور کا مجدّد وہی کہلائے گا جو اس کام کو انجام دے گا۔ کاش وہ اس کام کو مکمل کر لیتے تو معلوم ہوتا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔

شروع شروع میں اقبال کے فن کے جادو نے مجھے اس انداز میں سوچنے کی مہلت نہیں دی۔ وہ مجھے ایک رَو میں لے جاتا تھا اور میں اسلامی تاریخ کو صحیح تناظر میں نہیں دیکھ پاتا تھا۔ اب اقبال کی اسلامی فکر اور 'اسلامیت' کو میں نے ناقدانہ نظر سے دیکھنا شروع کیا اُن کی ہمہ اسلامیت، کی معنویت کے بارے میں اندیشہ ہائے دراز پیدا ہونے لگے۔

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لیے

مجھے ایک منیت پرست کا خواب نظر آنے لگا۔ تاریخِ عالم پر جب میری نظر پڑ جاتی تو مجھے اس بات پر یقین کرنے میں تامل ہوتا کہ سارے عالم کی تنظیم اسلام کی اساس پر کی جاسکتی ہے، جیسا کہ اقبال کا عقیدہ تھا۔ دنیائے عرب میں جو انتشار تھا اس سے میرے خیال کی تصدیق ہو جاتی تھی۔

میں اب اس قسم کے تصورات یا زن، رقص اور تیاتر کے بارے میں اقبال کے خیالات کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ لیکن شعر کے پیرائے میں ہر بار اقبال کا وار بھرپور پڑتا۔ اور میں ان کے اس قسم کے اشعار کو بھی وحی الہام سمجھ کر وردِ زبان رکھتا۔ جنھیں عقل یا تاریخی شعور قبول نہیں کرتا ؎

نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود

اب میری ذہنی کشمکش یہ تھی کہ اقبال کا ہر حرف، 'حرفِ آخر' کا حکم نہیں رکھتا۔ ان کی فکر کے بارے میں اگر خالص علمی انداز میں گفتگو کی جائے تو اس کے بہت سے گوشے 'غیر منوّر' نکلیں گے لیکن ان کے فن کی ساحری سے کس طرح بچا جائے، کہ جو کہدیا ہے وہ دل میں تیر بن کر اُتر جاتا ہے۔ مثلاً ان کی نظم 'مسجدِ قوت الاسلام' ہی کو لے لیجیے کس پیمبرانہ آواز کے ساتھ دعوت دی ہے۔

کیوں مسلماں نہ خجل ہو تری سنگینی سے
کہ غلامی سے ہوا مثلِ زجاج اس کا وجود!

ہے تری شان کے شایاں اسی مومن کی نماز
جس کی تکبیر میں ہو معرکۂ بود و نبود

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص مورخ کی نظر سے 'مسجد قوت الاسلام' کو دیکھتا اور جانتا ہے کہ اس کی تعمیر کے لیۓ ایک دوسرے مذہب کی عبادت گاہ کی تخریب کی گئی ہے (جس کے آثار آج بھی نمایاں ہیں) تو وہ بحیثیت انسان کس طرح اقبال کی اس تمجید اور تکبیر میں تہ دل سے شرکت کر سکتا ہے۔

لیکن ایسا نہیں ہے کہ اقبال کے افکار کے اس حصّے سے قاری متاثر نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ 'جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے'، فنِ شعر کے جادو پر یہ قول پوری طرح صادق آتا ہے۔ اسی لیۓ کہا گیا ہے کہ 'صداقتِ شعری'، 'تاریخی صداقت'، سے مختلف ہو سکتی ہے۔ یہ سحر اور علم کی صداقت ہوتی ہے جس کی عقل منکر ہوتی ہے اور دل شہادت دیتا ہے۔

چنانچہ رفتہ رفتہ میں اس نتیجے پر پہنچا ہیں سروکار اقبال کی فکر سے زیادہ ان کے فن سے رکھنا چاہیئے۔ اقبال کی فکر کی ساری برائی اسی تہمتِ شعر، کی وجہ سے ہے جس کو زائل کرنے کے لیۓ وہ بار بار تاویلیں پیش کرتے رہے۔ اُن کی عظمت کا اصل راز خود ان کے بقول یہ ہے ؎

یہ کون غزل خواں ہے پُرسوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

معاشرتی سطح سے قطع نظر اقبال کے سیاسی تصوّرات میرے لیۓ اور بھی اُلجھن کا باعث رہے ہیں۔ مثلاً ان کا 'اسلامیت'، یا 'قومیتِ اسلام'، کا تصوّر۔ باوجود اس کے کہ وہ نہایت خوبصورت شعری پیکر میں پیش کیۓ گۓ ہیں، جنھیں پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیۓ انسان کی سوچنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے لیکن جو منطقی استدلال یا تاریخی حالات کی کسوٹی پر مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ میں قطعی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جب دنیاۓ عرب میں ایک اسلامی مملکت کی تشکیل نہیں ہو سکی تو اس کے دامن میں

اس قدر مختلف النوع قومیتیں جیسے ترکی، ایران، افغانستان، پاکستان یا بنگلہ دیش کس طرح محض 'عقیدہ' کے اشتراک کی بنیاد پر یکجا کئے جا سکتے ہیں؟ جاوید اقبال نے لکھا ہے کہ "اقبال اسلام کو ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک اصول یا انسانی اتحاد کو وجود میں لانے کے لیے ایک عملی تحریک تصور کرتے تھے" (زندہ رود ص ۶۵۷) یہ تاریخ انسانی کا ایک خواب ہے یا حقیقت؟

اسی طرح بحیثیت ایک ہندی مسلمان ہونے کے میں اقبال کے آخری دور کے شمال مغربی اسلامی مملکت کے خواب کو اپنے لیے کیوں کر حقیقت سمجھ سکتا ہوں۔ پاکستان کی قیمت ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے خون سے چکائی ہے!

میرے خیال میں اقبال کی سیاسی فکر کو بدلتے ہوئے حالات کے آئینہ میں دیکھنا ضروری ہے۔ انھوں نے ایک جگہ کہا ہے "ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنا نظریہ تبدیل کرے اور بقول ایمرسن صرف پتھر ہی اپنے آپ کو نہیں بدلتے" (زندہ رود ص ۶۵۵)۔ آجکل جو اقبال کی آخری دور کی سیاسی فکر کے بارے میں بحث چل نکلی ہے اس کا جواب صرف یہ ہے کہ اقبال ابتدا میں یقیناً قوم پرست تھے۔ ان کی قومی اور وطنی شاعری کا جواب پوری اردو شاعری میں نہیں ملتا لیکن جب یہ قوم پرستی ان کی اسلامیت کے آڑے آتی گئی تو وہ اس حقیقت سے کنارہ کش ہو کر 'ہمہ اسلامیت' کا خواب دیکھنے لگے۔ صرف کبھی کبھی 'شعاعِ امید' جیسی نظموں میں 'خاکِ وطن' کی محبت ایک بار پھر ان کے دل میں کروٹیں لینے لگتی ہے ؎

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب

یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ نظم ۱۹۳۶ء میں خطبۂ مسلم لیگ (۱۹۳۰ء)

کے بہت بعد لکھی گئی ہے، جو شامل ضرب کلیم ہے۔

اقبال ۱۹۳۰ تا ۱۹۳۷ء مسلم لیگ کے دیگر قائدین کی طرح ایک آزاد اسلامی مملکت کی اصطلاح میں نہیں سوچ رہے تھے۔ انھیں پاکستان، کی نہیں مسلمانوں کے لیے ایک تہذیبی 'گھر' کی تلاش تھی۔ ۳۷ء تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان کے سیاسی حالات تیزی سے بدلنے لگے۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کانگریس کئی صوبوں میں برسرِ اقتدار آگئی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلم عوام سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کا پروگرام بنایا۔ اب اقبال کی سیاسی بصیرت پر بھی یہ بات روشن ہوگئی جو سرسید نے ۱۸۶۷ء میں اردو کے معاملے میں بنارس میں محسوس کی تھی۔ یعنی "یہ دونوں قومیں کسی معاملے میں صدقِ دل سے اور پوری طرح ایک دوسرے سے اشتراک نہیں کرسکتیں..."

انھوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کو لکھا!

"..... شریعت اسلامیہ کا نفاذ اور ارتقا اس ملک میں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں وجود میں نہ لائی جائیں۔ سال ہا سال سے یہی میرا پختہ عقیدہ رہا ہے اور میں اب اسی عقیدے کو مسلمانوں کے افلاس اور ہندوستان کے امن کا بہترین حل سمجھتا ہوں..... مسلم ہند میں ان کے مسائل کے حل بآسانی رائج کرنے کی خاطر ملک کی تقسیم کے ذریعے ایک یا زائد مسلم ریاستوں کا قیام اشد ضروری ہے۔

کیا آپ کی رائے میں اس مطالبے کا وقت آن نہیں پہنچا؟....."

تین ہفتے کے فصل سے اقبال نے محمد علی جناح کو دوسرا خط ۲۱ جون ۳۷ء کو لکھا جس میں تقسیم ملک اور بنگال کے مسلمانوں کا زیادہ کھلے الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:

"..... ہندوستان میں قیام امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ اور تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب وہی ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے، یعنی صوبوں

پر مشتمل ایک جداگانہ وفاق کا قیام ۔ ۔ ۔ ۔ میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ شمالی مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہیئے ۔ مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت کے صوبوں کا بہترین مفاد اسی طریق سے وابستہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

ان دو خطوں کی موجودگی میں، جو انتقال سے صرف دس گیارہ ماہ قبل لکھے گئے ہیں، اقبال کی سیاسی فکر کا جواز ڈھونڈھنا، حقائق سے انحراف کرنا ہے ۔ مسلم اقلیت کے صوبوں کو انھوں نے جس سہل انگاری کے ساتھ صرفِ نظر کیا ہے اس کے بارے میں ہندی مسلمان اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہے ؂

اقبالؔ! اپنا محرم کوئی نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

تاہم اقبال ایک عظیم مفکر اور شاعر ہیں ۔ ہمارے نقطۂ نظر سے ان کے اس جرم پر کہ انھوں نے تقسیمِ ملک کی حمایت کی انھیں نہ تو ان کی ہندوستانیت سے محروم کیا جا سکتا ہے اور نہ اُن کی فکر کے عالمی پہلوؤں سے ۔

پاکستان کی تائید تو شری راجگوپال اچاری نے بھی کی تھی اور اس کی منظوری مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد کے علی الرغم پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل نے دی تھی ۔ تو کیا یہ سب لوگ ہماری قومی عدالت میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے کیے جائیں گے؟

دراصل ٹیگور ہوں کہ اقبال، ان شخصیتوں کو سیاست کے بدلتے ہوئے پیمانوں سے ناپنا غلط ہوگا ۔ ٹیگور کی ویدانیت، ہو کہ اقبال کی اسلامیت، وحدتِ انسانیت کا دوسرا نام ہے ۔ دونوں آج بھی ہند و پاک کے افق پر شعر کی توسِ قزح کے ذریعہ فصل میں وصل کی کیفیت پیدا کیے ہوئے ہیں ۔

سولھواں باب

علی گڑھ (۶)

(۱۹۸۳ء تا حال)

صبح کا بھولا شام کو واپس آئے تو اسے بھولا نہ جانیئے۔ علی گڑھ میرا مقدّر بن چکا تھا۔ ابھی کشمیر کی شاداب وادی میں اِس بوڑھی گائے کی کُلیلیں، ختم نہیں ہوئی تھیں کہ علی گڑھ سے بُلاوا آگیا۔ وہاں ترقی اردو بورڈ (ثم بیورو) کا ایک اردو۔ اردو لغت کا منصوبہ ۱۹۷۳ء سے چل رہا تھا۔ اس کے تحت پانچ مولفین ۔ پروفیسر آل احمد سرور، مالک رام صاحب، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر مختار الدین اور راقم الحروف کو ایک ایک جلد کا ایڈیٹر مقرر کر کے ایک ایک اسسٹنٹ کی مدد سے ایک جامع اور جدید لغت کی تالیف کا کام ۱۹۷۳ء میں سپرد کیا گیا تھا۔ بوجوہ اس کام میں زیادہ پیش رفت نہ ہو سکی اور چار پانچ برس کے بعد بورڈ کی جانب سے اعتراضات ہونے لگے۔ جب میر نصر اللہ صاحب، وزارتِ تعلیم کے ایڈیشنل سکریٹری کی حیثیت سے اردو بیورو کے افسرِ اعلیٰ تھے تو انھوں نے لغت کی سست رفتاری کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا کہ یہ کام انگریزی۔ اردو لغت کے نمونے پر پانچ مولفین سے لے کر ایک۔ کے سپرد کر دیا جائے تو زیادہ ذمہ داری سے ہو سکے گا۔ اتفاق سے دونوں لغات کے ... ایک زمانے میں ترتیب دیئے گئے تھے جب کہ

انگریزی۔ اردو لغت کا کام تنہا پروفیسر کلیم الدین کے سپرد کیا گیا، اردو۔ اردو لغت کا کام پنچایتی بنا دیا گیا وہ بھی ۳۵۰ روپے کے حقیر اعزازیے پر۔ اس وقت مالک رام صاحب کے علاوہ ہم سب یونیورسٹی میں پروفیسری کی خدمات پر مامور تھے اور قاعدے کے مطابق اپنی تنخواہ کے ۲۰ فی صد سے زیادہ اعزازیہ نہیں لے سکتے تھے، اور وہ اسی قدر ہوتا تھا۔ بہر حال اردو جو جوہ ہول اردو لغت کے کام میں پیشرفت نہیں ہو سکی۔ جب کہ پروفیسر کلیم الدین اپنے مکان پر انگریزی اردو لغت کا دفتر جما کر، اطمینان سے کام کرتے رہے۔

جولائی ۸۲ء تک وزارت تعلیم نے طے کر لیا کہ اردو لغت کی تنظیمِ نو انگریزی اردو لغت کے انداز پر کر کے اس کام کو بھی ایک شخص کے سپرد کر دیا جائے۔ چنانچہ میر نصر اللہ صاحب کے دفتر میں ایڈیٹوریل بورڈ کا جلسہ ہوا جس میں ان کی تجویز پر طے پایا کہ یہ کام راقم الحروف کے سپرد کر کے لغت کا دفتر علی گڑھ میں میرے مکان کے دو کمروں میں انگریزی۔ اردو لغت کے انداز اور شرائط پر قائم کر دیا جائے۔ چنانچہ میں نے یکم دسمبر ۸۲ء کو کشمیر کو خیر باد کہا اور علی گڑھ آ کر اپنے نئے کام کا چارج لے لیا۔ چارج ان معنوں میں کہ دوسرے مولفین کے یہاں سے تیار شدہ کارڈ متعلقہ لغات اور دیگر سامان کو اپنے یہاں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ترقی اردو بیورو کے اربابِ حل و عقد کو امدادی اسٹاف کے تقرر کی اجازت کے لیے عرض داشتیں بھیجنا شروع کیں۔ واہ رے دفتر وزارتِ تعلیم! اور واہ ری بدنصیب اردو! وہاں لغت اردو کی فائل پر یہ نوٹ لکھا گیا کہ ایڈیٹر کے تقرر کی اجازت تو مل گئی ہے لیکن باقی اسٹاف کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ میں انگشت بدنداں تھا! کیا آپ یقین کریں گے کہ دفتری گھس گھس میں اسٹاف کے تقرر کی منظوری مجھے جون ۸۳ء میں جا کر ملی۔ اس کے بعد مجھے پہلے ۶ ماہ کی مد فاضل سمجھ کر ادائیگی نہیں کی گئی۔ حالاں کہ میں نے اپنا کام دسمبر ۸۲ء میں کشمیر سے واپس آنے کے فوراً بعد شروع کر دیا تھا۔ بالآخر وزارتِ تعلیم کو بہت تگ و دو کے بعد یہ ادائیگی کرنا پڑی۔ اس طرح کام کا آغاز بددلی کے ساتھ ہوا۔ جون ۸۳ء سے

جب بیشتر مددگاروں کا تقرر ہو گیا تو تالیفِ لغت کے کام میں تیز رفتاری آنا شروع ہوئی۔ میرے بیشتر مددگاروں کو لغت نویسی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ صرف ایک یوسفی صاحب کو پہلے سے اس اسکیم میں کام کرنے کا تجربہ تھا۔ لیکن وہ جغرافیہ میں ایم اے تھے اس لیے اُن کی اردو کی معلومات محدود تھی جس کی کمی وہ اپنی محنت اور وقت کی پابندی سے کر دیتے تھے۔ میں نے دو سال کے اندر اس لغت کی جلدِ سوم جو د تا س کے حروف پر مشتمل تھی مکمل کر لی اور اس کی پریس کاپی تیار کر کے بیورو کے ڈائریکٹر کو بھیج دی۔ اس کے بعد جلدِ اوّل کی تیاری کے لیے چھ مہینے اور دیئے گئے، اس کا بھی کچھ حصّہ مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد اسکیم ختم کر دی گئی اور تا حال دو ریویو کمیٹیوں کی سفارشوں کے باوجود معاملہ معلّق ہے اور اس کا سارا ساز و سامان اب تک میرے یہاں پڑا ہوا ہے۔

لغت نویسی کے فن میں داخل ہونے کے بعد مجھے علم ہوا کہ فرہنگ آصفیہ کے اختتام پر اس کے مؤلف نے جو لکھا ہے وہ فاعتبروا یا اولی الابصار کے تحت حرف بہ حرف صحیح ہے۔

"...... ہمارے ناظرینِ فرہنگ واقف ہو گئے ہوں گے کہ ہم نے کس کس جاں کاہی، جانفشانی اور اخراجات برداشت کر کے اس فرہنگ کو انجام پر پہنچایا... خود ہماری آٹھوں پہر کی روزانہ جمتول نشست نے مصائب کے ضمن میں یہ مزید عنایت فرمائی کہ پیٹ بڑھا کر توندل کر دیا۔ ریاحی بواسیر ضعفِ مثانہ بہم پہنچا دیا، معدہ بگاڑ دیا، اعصاب کو ڈھیلا کر دیا......"

لغت نویسی کی ہمارے یہاں روایت قدیم ہے لیکن ہمارا لغت نویس اس فن کی اُن باریکیوں سے واقف نہیں جن کی مغرب میں آکسفورڈ ڈکشنری یا ویبسٹر کی لغتِ کلاں نے روایات قائم کی ہیں۔ میں نے اردو لغت کا نمونہ ویبسٹر کی لغتِ کلاں سے لیا۔ اندراجات کے اصول، ذیلی اندراجات کا محل و مقام، تلفظ، قواعدی زمرہ اور سب سے اہم الفاظ کے مشتقات کا التزام رکھا۔ تمثالیں صرف

ان الفاظ کی دیں جو یا تو متروک ہو گئے ہیں یا جو مخصوص معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔ محاورات بھی ضرورت کے مطابق دیئے لیکن صاحب آصفیہ یا مہذب اللغات کی طرح لغت کو محاورات کی کھتونی بنانے سے احتراز کیا اس لیئے کہ ہر زبان میں محاورات پر مشتمل علاحدہ سے لغات تصنیف کی جاتی ہیں۔ اس لغت کو جامع تر بنانے کے لیئے اس میں دکنی اردو کے الفاظ کا بھی شمول کیا گیا۔ غرض کہ ہر لحاظ سے حوالہ کی ایک ایسی کتب بنانے کا التزام کیا جس کی مدد سے قدیم تا جدید ہر عہد کے ادب کا مطالعہ کیا جا سکے۔ مختلف علوم کی اصطلاحات کو اسی قدر جگہ دی گئی جس قدر کہ وہ عام زبان کا حصہ بن گئی ہیں۔

مجھے اس کا بھی احساس ہوا کہ لغت نویسی ایک تاب شکن فن ہے اور ایک اس میں داخل ہو جانے کے بعد انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ اس کا مولف شیر کے منہ میں اپنا ہاتھ دیتا ہے۔ تحسین سے کم اور تعریض سے زیادہ سابقہ پڑتا ہے اور اس کو مرنے کے بعد ستائش ملے تو ملے، جیتے جی یہ اس سے محروم رہتا ہے۔ لغت کی تالیف کے لیئے طویل مدت اور کثیر سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کام عجلت میں نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سرکار ان مسائل سے بے خبر ہوتی ہے اور ہتھیلی پر سرسوں اگانے کی قائل ہوتی ہے۔ چنانچہ وزارتِ تعلیم نے ۱۹۷۲ء سے لے کر ۱۹۸۳ء تک کی مدّت اور اخراجات کو مجھ سے محسوب کر کے ڈھائی سال کے بعد اس اسکیم کو یک لخت بند کر دیا۔

لغت نویسی کے فن سے مجھے ذاتی طور پر بہت فائدہ پہنچا۔ ہر قسم کے الفاظ کی پرکھ ہو گئی۔ اس تربیت کے بعد اب میں صحیح معنوں میں لغت کی باقی ماندہ جلدوں کا حق ادا کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی نوعیت ابھی تک نہیں آئی ہے اور اب جو آئی تو یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ میری تربیت یافتہ جماعت تتر بتر ہو گئی ہے۔ اردو کے جس ٹائپسٹ کو میں نے بڑی محنت سے اس قابل بنایا تھا کہ وہ لغت کا مسوّدہ صحیح ٹائپ کر سکے دوسروں کے ہاتھوں میں

چلا گیا ہے۔ غرضیکہ آشیانے کے لیئے ایک ایک تنکا پھر جمع کرنا پڑے گا۔ اب میں ترقی اردو بیورو کے وعدوں پر بے دلی کے ساتھ یقین کرتا رہتا ہوں۔

اسی زمانے یعنی ۱۹۸۴ء میں بیرونِ ہند کا ایک غیر متوقع سفر درپیش آیا جسکی تمام تر ذمہ داری میرے عزیز دوست پروفیسر احسان رشید پر ہے جو اس وقت اُردن میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے متعین تھے۔ حکومت اردن کا ایک ثقافتی ادارہ ہر سال ایک علمی و تحقیقی سیمینار منعقد کرتا ہے جس میں باہر کے اساتذہ و علماء کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پروفیسر مختارالدّین احمد صاحب تقریباً ہر سال اس میں شرکت کرتے ہیں۔ احسان صاحب کی تحریک پر اس سال مجھے بھی مدعو کیا گیا۔ میں پریشان تھا کہ میں وہاں اپنی موجودگی کا اظہار کس طرح کرسکوں گا اس لیئے کہ میں عربی زبان بالکل نہیں بول سکتا، سمجھتا بھی نہیں صرف پڑھ کر مطلب نکال لیتا ہوں۔ بہر حال موقع سے فائدہ اٹھا کر میں مختارالدّین صاحب کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم صاحبہ بھی تھیں، جن کا پروگرام وہاں سے مقاماتِ مقدسہ کی سیر تھی۔ وہاں ہمارا قیام ایک نہایت نفیس ہوٹل میں تھا۔ کانفرنس کے اجلاس بھی اسی ہوٹل میں ہوتے تھے۔ کھانے پینے کی اشیاء کی افراط تھی۔ جب سے میرے خون میں شکر دریافت ہو گئی ہے میں ہاتھ روک کر کھاتا ہوں، خاص کر میٹھے سے اجتناب کرتا ہوں۔ لیکن خورد و نوش کے اس ماحول میں اس حکیمانہ قول کو نظرانداز کرنے لگتا ہوں کہ خوردن برائے زیستن نہ کہ زیستن برائے خوردن۔ کیوں صاحب، پھر زندگی ضروری کیا ہے جب قدم قدم پر نواہی سے سابقہ ہو۔ ایک شام کا ڈنر پرنس حسن بن طلال برادرِ خورد ولی عہد شاہ حسین کی جانب سے تھا۔ میں نے اس سے بہتر روسٹ کہیں نہیں کھایا، وہ تو ہماری میز پر وہاں کے میڈیکل کالج کے ایک بزرگ شریک ہو گئے۔ نہ خود کھاتے تھے نہ اوروں کو کھانے دیتے تھے۔ یا فتّاح! یہ کیا مصیبت ہے ہر لذیذ غذا کا تیر قلب یا جگر پر پڑتا ہے۔ کھانا کھا کے بے مزہ رہا۔

کانفرنس کے اختتام پر احسان رشید صاحب مجھے ہوٹل سے اٹھا کر اپنے یہاں لے گئے۔ دو تین دن ان کے یہاں قیام رہا۔ ان کی بیگم کا آپریشن ہوا تھا اور وہ چند روز قبل اسپتال سے مکان پر آئی تھیں لیکن احسان صاحب کی توجہ میں کمی نہ پائی۔ مجھے گھمانے بحرالموت (ڈیڈ سی) لے گئے جو سطح سمندر سے نیچے ہے۔ اس کے دوسرے کنارے سے اسرائیل کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ دوسرے روز اپنے ڈرائیور سے کہا کہ مجھے حضرت شعیب کی قبر اور اصحاب کہف کا غار دکھالاؤ۔ دونوں چیزیں قابل دید ہیں۔ حضرت شعیب کی قبر بلا مبالغہ نو دس فٹ کی ہوگی۔ کہا جاتا ہے اس زمانے میں اس علاقے کے تمام لوگ ڈُنٹے ہوتے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر رومن سلطنت کے آثارِ قدیمہ بڑے بڑے ستونوں کی شکل میں دیکھے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیا شوکت اور دلآویزی کی شان ہوگی۔ اصحابِ کہف کا قصّہ تو قرآن کریم میں بھی موجود ہے سگِ اصحابِ کہف کی ہڈیاں تک شیشے کے اندر محفوظ رکھی ہوئی ہیں۔ واللہ اعلم۔

اردن ایک قدیم ملک لیکن جدید ریاست ہے۔ میں اس بات پر حیران ہوتا تھا کہ اہلِ اردن کی خوش حالی کا راز کیا ہے۔ بالکل ایک یورپی ملک معلوم ہوتا ہے۔ ایک روز وہاں کی یونیورسٹی دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اسے کسی بھی یورپی یونیورسٹی سے صفائی اور سلیقے میں کم نہیں پایا۔ سب سے پہلے مہمان کو یونیورسٹی پر بنی ہوئی مختصر سی فلم دکھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کی دلچسپی کے مطابق ان شعبوں میں گھمایا جاتا ہے جن کو وہ دیکھنا چاہے۔ میں نے لائبریری جانا پسند کیا۔ اس کو بھی امریکی یونیورسٹی کی لائبریری کے مماثل پایا۔ سہولتوں اور سروس دونوں اعتبار سے۔ طلبہ کو بھی ہندوستان سے زیادہ چاق چوبند پایا۔ یہ سب دیکھ کر میں سوچتا رہ گیا کہ اس قدر ترقی یافتہ قوم کو اسرائیلی کس طرح زیر کیے رہتے ہیں۔ یقیناً وہ ان سے بھی بہتر ہوں گے۔

اُردن سے واپسی پر چند روز راستے میں کراچی رُکا۔ بیشتر وقت اپنے عزیز دوست فرمان فتح پوری صاحب کے ساتھ اردو لغت بورڈ کے دفتر میں گزارا

میں نے فرمان صاحب سے کہا کہ آپ لوگوں نے یہ بہت بڑا کام اٹھایا ہے۔ اتنی بڑی لغت کے لیے قدیم متون کی ترتیب کا کام پہلے ہونا چاہیے۔ مصنفین اور تصانیف کے سنین کے بارے میں فیصلے ہونے چاہئیں۔ ان کے بغیر تاریخی اصولوں پر لغت کیوں کر مرتب کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے ان دقتوں کا اعتراف کیا اور کہا ”لا محدود التواء کے مقابلے میں کچھ تو کیا چاہیے کی پالیسی بہتر ہوتی ہے“۔

۱۹۸۵ء میں اردو لغت کی اسکیم کو ایک بند باب سمجھنے کے بعد میں نے اپنی ساری توجہ جامعۂ اردو اور اپنے تصنیفی کاموں کی جانب مبذول کر دی۔ جامعۂ اُردو کا، جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے میں جنوری ۱۹۷۳ء میں پہلی بار شیخ الجامعہ منتخب کیا گیا تھا۔ اسی سال نومبر میں دہلی بحیثیت وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ میرا تقرر عمل میں آیا اور وہاں چلا گیا۔ میری غیر حاضری میں جامعہ اردو کے کام کی نگرانی نائب شیخ الجامعہ ڈاکٹر عتیق صدیقی کرتے رہے۔ میں مختلف مواقع پر، خصوصاً مختلف مجالس کی صدارت کرنے کے لیے دہلی سے علی گڑھ آتا جاتا رہا۔ لیکن اگست ۱۹۷۸ء میں جب میں جامعہ کو خیر باد کہہ کر پھر علی گڑھ آ گیا تو جامعہ اردو کی ذمہ داری میں نے پھر سنبھال لی۔ کچھ عرصے کے بعد جب تیسری بار میرا انتخاب عمل میں آیا تو میری تجویز پر پروفیسر عبد العظیم، صدر شعبۂ لسانیات کا انتخاب نائب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ہو گیا۔ اعزازی خازن کے عہدے پر الحاج عبید الرحمن خاں شیروانی حسب سابق کام کرتے رہے۔ ان کے بعد ۸۶ء میں اس عہدے پر ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس زمانے میں جامعہ کے امتحانات میں بیٹھنے والوں کی تعداد بڑھ کر چودہ ہزار کے قریب ہو گئی۔ ۱۹۷۶ء میں معلم اردو کا نیا امتحان کھل جانے کے بعد طلبہ نے اس کی جانب بھی توجہ کی۔ اس لیے کہ یہ پروفیشنل امتحان ہے۔ طلبہ کی تعداد کے ساتھ آمدنی بھی بڑھی۔ سالانہ بجٹ تین لاکھ سے بڑھ کر دس لاکھ ہو گیا۔ آمدنی بڑھنے کے ساتھ ہم نے کئی بار اہلکاران جامعہ اردو کے گریڈوں

پر نظرِ ثانی کی اور مہنگائی بھتّہ میں ہر سال اضافہ کیا۔

ایک خیال جو میرے ذہن میں عرصے سے گھوم رہا تھا یہ تھا کہ جامعہ اُردو کے میڈیکل کالج سڑک کے رُخ پر اگر دکانیں تعمیر کر دی جائیں تو اس کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا۔ یہ ضمانت ہو گی جامعہ کے بُرے دنوں کے لیے۔ میں اِس سلسلے میں جب بھی تجویز رکھتا مجلسِ عام کے ایک بااثر رکن یہ کہہ کر کہ اس سے جامعہ کی عمارت کی 'جمالیات' خراب ہو جائے گی، مسترد کرا دیتے۔ بالآخر اورنگ آباد کی ۸۶ء کی مجلسِ عام کے جلسے سے پہلے میں نے امیرِ جامعہ، ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب سے اس سلسلے میں گفتگو کی اور ان کی مدد چاہی۔ چنانچہ انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے اس سال بہ سال دہرائے جانے والے اعتراض پر کل اختیارات صدر کو سونپ دینے کی تجویز رکھی، جو منظور ہو گئی۔ اور اس کے بعد انھوں نے دکانوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے مجھے ہری جھنڈی ہلا دی۔ آجکل ترقی پسندی جس قدر آسان ہے تعمیر پسندی اسی قدر مشکل ہے۔ میں نے کچھ ذاتی تجربے کی بنا پر اور کچھ دوسرے لوگوں کے تجربے کی مدد سے دکانوں کا اچھا سا نقشہ بنوایا۔ جس میں جامعہ کی مرکزی عمارت کی جمالیات اور پیش منظر کا نمایاں خیال رکھا گیا اور ان دکانوں کو 'اردو بازار' کے نام سے ۱۹۸۷ء میں مکمل کر دیا۔ اسی سال امیرِ جامعہ نے مجلسِ عام کے اراکین کے سامنے اس کا افتتاح کیا۔ اس وقت ہر شخص کے لب پر تحسین کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ 'اردو بازار' صحیح معنوں میں جمالیات اور مالیات کا سنگم بن گیا ہے۔

اس 'کارے کردم' کے ساتھ میری خواہش تھی کہ نئے انتخابات کے وقت میں سبکدوش ہو جاؤں، لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ میری مدتِ عہدہ آئندہ انتخابات ہونے تک بڑھا دی گئی۔ پچھلے چند سالوں سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ بعض حضرات کی جاہ طلبی کی وجہ سے جامعہ اردو میں سیاست آتی جا رہی ہے۔

میرا ایک خواب اور اردو ذریعۂ تعلیم کے جونیر اسکول قائم کرنے کا رہ گیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں اس کو شرمندۂ تعبیر کر سکوں گا۔ یہ خواب میں اپنے

عزیز شاگرد اور جامعۂ اردو کے اعزازی خازن، ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کے لیۓ چھوڑے جا رہا ہوں۔ انھوں نے اس سلسلے میں بہت تپاک ظاہر کیا ہے اور چوں کہ اس وقت جامعہ کا بجٹ تین لاکھ سے بڑھ کر دس لاکھ ہو گیا ہے اور اسی قدر رقم فکسڈ پازٹ میں پس انداز ہے، قدم بہ قدم جامعہ اردو اس منزل کی جانب بھی بڑھ سکتی ہے۔ دیکھنا ہے کہ معترضینِ جامعہ اردو کیا فرماتے ہیں، بیچ اس مسئلے کے!

جامعہ اردو کے سلسلے میں ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب سے میری رفاقت کا یہ پندرھواں سال ہے، یعنی جنوری ۱۹۷۳ء سے وہ جامعۂ اردو کے چانسلر اور میں اس کے وائس چانسلر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک فعّال شخصیت کے مالک ہیں۔ ان میں علمی و عملی دونوں قسم کی صلاحیتیں خداداد ہیں۔ ابتدائی چند سالوں میں ان کے توسط سے جامعۂ اردو کو چند بڑی رقوم بھی حکومتِ اتر پردیش اور مہاراشٹر کی جانب سے ملیں۔ یہ انھیں کے سیاسی اثرات کا کرشمہ تھا کہ شریمتی اندرا گاندھی، اپنے مشیروں کی صلاح کے علی الرغم جامعۂ اردو کی 'دکتورِ ادب' کی اعزازی ڈگری قبول کرنے پر تیار ہو گئیں۔ اس سلسلے میں دہلی یونیورسٹی کے شنکر ہال میں مارچ ۱۹۷۴ء میں ایک خصوصی کنونشن کی تقریب منعقد کی گئی، جس میں مرکزی سرکار کے کئی وزرا کے علاوہ شیخ محمد عبداللہ بھی شریک تھے۔ بایں ہمہ اس قدر ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ اپنے 'منسٹرانہ' طرزِ عمل کی وجہ سے بعض اوقات ان کا رویہ دوسرے عہدیدارانِ جامعہ اردو اور اراکینِ مجلسِ عام کے ساتھ وہ نہیں ہوتا جس کی تعلیمی حلقوں میں توقع کی جاتی ہے۔ جامعہ اردو کو بعض اوقات وہ اپنے سیاسی مقاصد کے لیۓ بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایمرجنسی کے زمانے میں اس کی مجلسِ عام کا تائیدی ریزولیوشن پاس کرنا۔ اُن میں اور چیف جسٹس ہدایت اللہ صاحب میں، جن کے ساتھ مجھے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کام کرنے کا شرف حاصل رہا ہے، بنیادی فرق ایک 'جسٹس' اور 'وزیر' کا ہے۔

۱۹۸۵ء میں اردو لغت کی پیشہ ورانہ مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد میں نے جامعۂ اردو کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اپنی علمی تعمیر کا بھی سلسلہ شروع کردیا۔ اسی زمانے میں 'ایجوکیشنل بک ہاؤس کے مالک و منیجر اور اپنے دوست اسد یار خان صاحب کے پیہم اصرار پر میں نے 'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو' کا ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن تیار کیا جسے انھوں نے نہایت اہتمام کے ساتھ ۱۹۸۷ء میں آف سیٹ کی دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع کیا۔ اس سے ایک سال قبل وہ میرے مجموعہ کلام 'دونیم' کا اضافہ شدہ ایڈیشن شائع کر چکے تھے۔ میرے مرتب کردہ کے قصہ مہر افروز و دلبر کا نیا ایڈیشن انجمن ترقی اردو عنقریب شائع کرنے والی ہے۔ میرے انگریزی تحقیقی رسالے A Phonetic and Phonological study of the word in Urdu کا ترجمہ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے نہایت صحت اور محنت کے ساتھ کیا جسے شعبۂ لسانیات نے اہتمام سے ۸۶ء میں شائع کیا۔ اسی سال میں نے فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام لکھنؤ میں 'ہندوستانی زبانوں میں اردو کا مقام' پر خطبہ دیا۔ جنوری ۸۷ء میں 'نیاز فتحپوری کے اسلوبِ نگارش' پر نیاز میموریل خطبہ کراچی (پاکستان) جاکر دیا۔ جہاں مجھے 'نیاز فتحپوری ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ (دہلی) کے لیے ایک مقالہ بعنوان 'ڈاکٹر یوسف حسین خاں بحیثیت ناقدِ اقبال' ۸۸ء میں لکھا، جو انسٹی ٹیوٹ کے اگلے مجلّے میں شائع ہوگا۔ اترپردیش اردو اکاڈمی کے لیے نظیر اکبرآبادی کی نظموں کا انتخاب تیار کیا اور ساہتیہ اکاڈمی (دہلی) کے لیے محمد قلی قطب شاہ پر "ہندوستانی ادب کے معمار" سیریز کے لیے ایک مونوگراف تصنیف کیا۔ یہ دونوں زیرِ طبع ہیں

دسمبر ۸۴ء میں میں مرکزی وزارتِ تعلیم کے ایک ثقافتی وفد کے رکن کی حیثیت سے میں پاکستان گیا۔ اس وفد کے لیڈر کنور مہندر سنگھ بیدی تھے اور دیگر اراکین میں ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، پروفیسر جگن ناتھ آزاد،

پروفیسر حامدی کاشمیری، اور ڈاکٹر خلیق انجم تھے۔ ہماری پہلی منزل کراچی تھی جہاں ہوائی اڈے پر ہمارے استقبال کے لیے ڈاکٹر جمیل جالبی، جمیل الدین عالی صاحب، غلام ربّانی آگرو صاحب (ڈائریکٹر پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز)، ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور دیگر مشاہیر موجود تھے۔ یہاں کی ایک مجلس میں ہم نے ہندوستان میں اُردو کی ترقی کے مختلف پہلوؤں پر پرچے پڑھے۔ پاکستان کے اردو لغت بورڈ کا معائنہ کیا اور روزنامہ 'جنگ' کے دفتر میں سوال وجواب کی ایک صحبت میں شرکت کی، اور اس کی طباعت کی جدید ٹیکنیک کو دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ کراچی کے چوٹی کے ہوٹل آوری ٹاور میں سرکار کی جانب سے ہمارا قیام تھا۔ ہوٹل میں مُشروباتِ تلخ' مسلمانوں کے لیے ممنوع تھے۔ اس لیے ان سے استفادہ کنور صاحب، نارنگ صاحب، اور جگن ناتھ آزاد صاحب نے خوب اٹھایا۔ ان کے طفیل میں کچھ پاکستانی شعراء وادبا بھی غیرقانونی طور پر مستفید ہوتے رہے۔ ہم مُسلین، ترسا کیے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ نقل کے لیے جو بھُنے ہوئے بادام ہر کمرے میں رکھے رہتے تھے، میرے پڑوسی جگن ناتھ آزاد نے اپنی بڑھتی ہوئی ضرورت کے پیش نظر میرے کمرے سے غائب کرنا شروع کر دیئے۔ ایک دن میں ان کے کمرے میں گیا اور اپنا 'نقل' یہ کہہ کر طلب کیا میں نقل اور مے دونوں سے محروم ہونا نہیں چاہتا ورنہ بدعا دوں گا۔ معلوم نہیں کہ یہ دھمکی کن لمحات میں دی تھی کہ دوسرے دن سے آزاد صاحب کے اسہال شروع ہوگئے اب ان کے بھی نُقل میں نقل کرتا تھا!

کراچی ہی کے دورانِ قیام ہمیں دن بھر کے لیے ہوائی جہاز سے موہن جُداڑو لے جایا گیا۔ جس کو نہ دیکھنا اپنے ورثے کے قدیم سرمائے سے محروم رہ جانا ہے۔ چنانچہ پاکستان کی ادبی اکیڈمی کے ڈائریکٹر آگرو صاحب کی رہبری اور ایک ماہرِ آثارِ قدیمہ کی معیت میں ہم نے وادی 'سندھ' کے قدیم ترین آثار کو بالتفصیل دیکھا۔ یہاں شہری مدنیت کے تمام آثار موجود تھے۔

کشادہ سڑکیں، مکانات، غسل خانے، عبادت گاہیں غرض کہ ایک ترقی یافتہ تمدن کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ جب ہم ایک عبادت گاہ کے آثار کو بہ غور دیکھ رہے تھے تو ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے نہایت معصوم سا سوال اپنے رہبر سے کیا "کیا یہاں کسی مسجد کے آثار نہیں ہیں؟!!"

دوپہر تک قیام گاہ پر واپس آئے تو تھک کر چور تھے۔ وہاں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پُر تکلف مگر قصباتی انداز کے کھانے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ کھانے کے بعد سندھی موسیقاروں نے کچھ دیر نوازا۔ اس کے بعد وفد کے ہر رکن کو ایک ایک سندھی شال کا تحفہ پیش کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سندھ کی رسم قدیم ہے۔ جب چلنے لگے تو سندھی ہندو نوجوانوں اور لڑکیوں کا ایک گروہ ہم سے ملنے آیا۔ زور سے السلام علیکم کہا لیکن ماتھے کی بندیوں سے شناخت ہو گئی۔ جگن ناتھ آزاد نے بے تابانہ انداز میں بڑھ کر ان سے کچھ پوچھ گچھ کی اور واپس آکر ہمیں بتایا کہ یہ لوگ کئی لاکھ کی تعداد میں سندھ میں موجود ہیں اور حکومت کے روّیے سے مطمئن ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں "جس طرح مسلمان ہندوستان میں!"

کراچی سے ہم اُڑ کر اسلام آباد پہنچے۔ اس نئے شہر کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا لیکن اب تک دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ واقعتاً نہایت دلکش مقام پر بسایا گیا ہے، پس منظر میں مری کی پہاڑیاں ہیں۔ کچھ دہرہ دون کا سا انداز پایا۔ گرمی کے موسم میں چند میل کے فاصلے پر مری پہاڑ پر چلے جایئے اور قدیم انداز کی شہریت سے دلچسپی رکھتے ہوں تو راولپنڈی اُتر آیئے۔ ابھی یہ شہر عالم کُن فیکون میں ہے۔ صدر کا محل اور جامع مسجد زیر تعمیر تھیں لیکن سڑکیں، مکانات، بازار، ہوٹل اور دفاتر بن چکے تھے۔ نئی دہلی کی طرح وسیع و عریض ہے۔ اس لیے متوسط طبقے کے لیے ذرائع آمد و رفت کا مسئلہ رہتا ہے۔ یہاں ہمیں کئی استقبالیئے دیے گئے جس میں "مقتدرہ" کا سب سے دلچسپ تھا۔ اس کے سربراہ اردو کے مشہور مزاح نگار شفیق الرحمٰن تھے

وہ بنیادی طور پر فوجی تھے اور سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد فوجی مقتدرین نے ان کے سپرد مقتدرہ کر دیا تھا۔ لیکن اس کی علمی سرگرمیوں کی تمام تر ذمہ داری ڈاکٹر وحید قریشی کی تھی جو اس وقت اس کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

اسلام آباد میں ہمارے پروگرام میں صدر پاکستان سے ملاقات کرنا بھی شامل تھی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ہمارے اعزاز میں دعوت دینا چاہتے ہیں جس میں ادیبوں اور شاعروں کو لاہور اور کراچی تک سے بلایا گیا ہے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں ایران کے اعلیٰ عہدیدار اپنے تمام حشم کے ساتھ آ گئے۔ صدر پاکستان کی تمام تر توجہ ان کی جانب ہو گئی۔ لہٰذا طے پایا کہ چونکہ لاہور بھی ہمارے پروگرام میں تھا، پہلے وہاں ہو آئیں۔ اس کے بعد ایک دن کے لیے صدر پاکستان کی دعوت کھانے راولپنڈی لوٹ آئیں۔ لاہور میں ادیبوں کا جم غفیر زیادہ پایا۔ الحمرا میں پرچہ خوانی تھی لیکن بجلی فیل ہو جانے کی وجہ سے ہال کے بجائے باہر انتظام کیا گیا پچھلی قطاروں تک آواز نہ پہنچنے کی وجہ سے نہ مقالہ نگار کو مزا آیا اور نہ سامعین کو۔ اس لیے لاہور کا سفر علامہ اقبال کے مزار پر فاتحہ خوانی اور میل ملاقات تک محدود رہا۔ ہم اس سے قبل کراچی میں قائدِ اعظم کے مزار پر حاضری دے آئے تھے۔ اس کو ہر اعتبار سے جاہ و جلال کا مظہر پایا۔ علامہ اقبال کا مزار چونکہ شاہی مسجد کے دامن میں ہے اس لیے یہ نہ صرف مختصر ہے بلکہ غیر نمایاں بھی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ مسجد کے زیرِ سایہ خرابات کی گنجائش ہے کسی مزار کی ہرگز نہیں۔ یقین نہ آئے تو اقبال اور مولانا آزاد کے مزاروں کا دیکھ لیجیے، دونوں شاہی مسجدوں کے جاہ و جلال میں غرق ہیں!

اسلام آباد کے سفر میں مجھے ایک نیا احساس ہوا (جس کی بعد کو شہادت ہمارے سفیر سنگھ صاحب نے دی) وہ یہ کہ پاکستان میں فوجی حکومت کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد تمام دوسرے سیاست میں مفکرِ اسلام علامہ اقبال کا پلاّ بھاری اور

قائدِ اعظم محمد علی جناح کا پلّا ہلکا ہوتا جا رہا ہے۔ جناح صاحب سے عقیدت اور ان کی مقبولیت اب کراچی تک محدود ہے جب کہ اقبال پاکستان کی پوری فضا پر چھاتے جا رہے ہیں۔ پاکستانی ٹیلی ویژن پر دونوں کی تصویریں ان کے اقوال اور اشعار کے ساتھ دکھائی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کسی سیاست داں کا قول اقبال کے شعر کی 'بُراقی' کو کہاں پہنچ سکتا ہے۔ اقبال کو یہ فوقیت بھی حاصل ہے کہ اس کی فکر پاکستان کو ایک اسلامی اساس بخشتی ہے جب کہ قائدِ اعظم کی اسلامی اساس ہی بہت کمزور تھی۔ ہر چند اقبال نے آخری ایّام میں انھیں اپنا قائد کہا ہے لیکن اب سارا پاکستان اقبال کو اپنا قائد سمجھتا ہے۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کو جو مقام دیا جا رہا ہے وہ اس کے مستحق بھی ہیں۔ پاکستان کسی نہ کسی معنوں میں، اسی مفکرِ اسلام کی امنگوں آرزوؤں، امیدوں اور جستجوؤں، کا عکس ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہندی مسلمانوں کے لیے ان کی سیاسی فکر کی اب کوئی معنویت نہیں رہی ہے۔

دوسرے دن لاہور سے پھر اسلام آباد پہنچے، صدر پاکستان کی ضیافت کھانے کے لیے۔ اسلام آباد سے شام کو موٹروں میں راول پنڈی جانا تھا جہاں صدر پاکستان کی قیام گاہ تھی۔ اس وقت کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب سے ایک لطیفہ سرزد ہو گیا۔ جب ہوٹل کے صدر دروازے پر سب جمع ہو گئے اور روانہ ہونے ہی والے تھے کہ کنور صاحب نے مجھے کوئی کام یاد دلایا جس کے لیے مجھے اوپر کی منزل پر اپنے کمرے جانا ضروری ہو گیا۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میرا انتظار کریں گے۔ چند منٹ بعد جب میں واپس آیا تو قافلے کے سارے ساتھی جا چکے تھے۔ مجھے بعد کو ٹیکسی سے راول پنڈی جانا پڑا۔

صدر پاکستان کی ضیافت ان کی رہائش گاہ کے بڑے ہال میں تھی۔ ان کی تواضع و مدارات کے بارے میں جو سن رکھا تھا، ویسا ہی پایا۔ چہرے پر مستقل خندۂ دنداں نما تھا، گرم جوشی اور گرم اختلاطی۔ مجھے ان کے خاص گول میز پر بیگم ثاقبہ رحیم الدّین اور جنرل رحیم الدّین کے درمیان جگہ دی گئی۔ یہ دونوں میرے

صلبی رشتے سے عزیز ہیں اور جنرل ضیاء الحق کے نسبتی رشتے سے۔ ضیافت کے بعد دونوں جانب سے منتخب حضرات نے اپنا کلام سنایا۔ میں نے وہ غزل سنائی جو ۵۸ء میں امریکہ میں لکھی تھی لیکن بعض اشعار حسب حال تھے۔

ترے دیار میں کوئی بھی ہم زباں نہ ملا
ہزار نقش ملے، کوئی رازداں نہ ملا
میں سوچتا ہوں کہ یہ بھی حسین ہیں لیکن
تصورِ رخِ جاناں کا امتحاں نہ ملا
کسے سنائیں غزل بہرِ شرحِ دلِ مسعود
کہ اس دیار میں کوئی بھی نکتہ داں نہ ملا

غزل پڑھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اس کا پس منظر بیان کر دینا چاہیئے تھا تاکہ پاکستانی میزبانوں کو کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ لیکن موقع ہاتھ سے نکل گیا اور اب ہم رخصت ہو رہے تھے۔ میں نے جنرل ضیاء سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "آپ کے بارے میں جو سنا تھا ویسا ہی پایا"۔ کہنے لگے "اس بار آپ آئیں گے تو ہمارے مہمان ہوں گے"۔

دوسرے روز لاہور کے ہوائی اڈے پر پھر پہنچے۔ اب سوئے وطن رواں تھے۔ یہاں جگن ناتھ آزاد نے، جن کے میرے درمیان پاکستان کے سارے سفر میں مزاح المومنین قسم کی نوک جھونک ہوتی رہی، یہ تجویز پیش کی کہ کیوں نہ ریل سے سفر کیا جائے۔ میں نے کہا جی ہاں، مجھے اس سے اتفاق ہے اس لیئے کہ میں پنجاب کے طول و عرض سے نہایت اطمینان سے گزر جاؤں گا لیکن آپ کا 'جگن ناتھ' امرتسر ہی میں رہ جائے گا البتہ 'آزاد' دلی پہنچ جائے گا۔

راول پنڈی کے قیام میں ہم ننکانہ صاحب بھی گئے، جہاں پنجاہ صاحب گوردوارہ ہے۔ یہاں ایک پہاڑی چشمہ بہتا ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ باباگرونانک نے پتھر پر اپنا پنجہ لگا کر دھارے کو روک دیا تھا۔

دھارے کے منہ پر جو پتھر ہے اس پر انسانی پنجے کا نشان اب تک نمایاں ہے۔ میں اس کرامت سے تو زیادہ متاثر نہیں ہوا لیکن جس خاموش تنہائی میں گوردوارہ اپنا تماشائی بنا ہوا تھا اسے دیکھ کر افسوس ضرور ہوا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی نے چوکھٹ پر ماتھا ٹیکا اور دس روپے نذر کئے۔ جگن ناتھ آزاد صاحب نے ماتھا تو نہیں ٹیکا لیکن پانچ روپے نذرانے کے دیئے۔ وہاں بند دروازے کے علاوہ کوئی نذر لینے والا تک نہیں تھا۔ وہاں سے لوٹے تو میں گرونانک کی عظمت کے بارے میں سوچتا رہا۔ مہاتما گوتم بُدھ کے بعد ہندوستان کی تاریخ کی اگر کوئی غیرمسلم شخصیت مجھے متاثر کرتی ہے تو وہ گرونانک کی ہے۔ نظیر اکبرآبادی نے کس عقیدت سے انھیں یاد کیا ہے ؎

اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابانانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہردم بولو "واہ گرو!"

وہاں سے لوٹتے وقت میں نے اقبال کے عقیدت مند اور اپنے دوست جگن ناتھ آزاد سے عجیب وغریب سوال کیا اور وہ اس سیاق میں کہ انھوں نے کہا جب مجھے کوئی 'شری' کہتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی گالی دے رہا ہو۔ میں نے کہا تلوک چند محروم کے صاحبزادے، عیسیٰ خیل کے باشندے آپ کی تو رگ و پے میں اقبال سرایت کئے ہوئے ہے۔ یہ مجھے بتائیے کہ آپ اقبال کے اس قسم کے کلام کو کس طرح انگیز کرتے ہیں:

خودی کا سرِ نہاں لاالٰہ الاّ اللہ
خودی ہے تیغ فساں لاالٰہ الاّ اللہ
دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لاالٰہ الاّ اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لاالٰہ الاّ اللہ

عملی مسلمان نہ ہونے کے باوجود، میرے وجود میں یہ اشعار ایک برق سی دوڑا دیتے ہیں۔ آپ اس "برہمن زادہ" کی وجدانی اسلامیت سے کیوں کر بچ نکلتے ہیں۔ اگر آپ اقبال کے اس قسم کے کلام کو من میں ڈوب کر محسوس کرتے ہیں تو آپ کو اب تک مشرف بہ اسلام ہونے سے کس چیز نے مانع رکھا ہے۔ گہرے سوچ میں پڑ گئے میں نے اپنے سوال کے نشتر کو اور زیادہ گہرا نہیں چبھویا۔

میں نے موجودہ زمانے میں خلقیۂ اسلامی سے قریب جن چند ہندو بزرگوں اور دوستوں کو پایا ہے ان میں پنڈت آنند نرائن مُلّا، جناب مالک رام صاحب، جگن ناتھ آزاد صاحب، اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نام سرِ فہرست ہیں۔ اور ڈاکٹر گیان چند جین، اردو کے بڑے محقق ہونے کے باوجود میری اس فہرست سے خارج ہیں۔ لیکن مجھے آج مسلمانوں میں ایک بھی صاحبِ قلم ایسا نظر نہیں آتا جو ہندو خلقیہ میں رچ بس گیا ہو!

۸۶ء میں میں اپنی آخری گھریلو ذمہ داریوں سے فارغ ہو گیا، یعنی شاہدہ اور زیبا کی شادیاں کر ڈالیں۔ چھوٹی بیٹی زیبا کی شادی جنوری ۸۶ء میں عبدالحق خاں صاحب سابق پرنسپل ٹیچرز ٹریننگ کالج کے چھوٹے صاحبزادے محمد عمران خاں سلّمہٗ سے ہوئی، جو جامعہ ملّیہ کے انجینئرنگ کالج میں لکچرر ہیں۔ اور شاہدہ کی شادی چھ ماہ کی تاخیر سے جولائی ۸۶ء کو اپنے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر شارق عالم آفریدی سے ہوئی جن سے اس کی نسبت عرصے سے طے تھی۔ برات کراچی سے آئی تھی۔ شارق فی الحال امریکہ میں ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگری کے لیے کام کر رہے ہیں اور شاہدہ بھی ان کے ساتھ وہیں مقیم ہے۔ زیبا نے باٹنی میں ایم۔ اے۔ فرسٹ کلاس کیا تھا۔ شاہدہ نے میری تحریک پر ایم اے۔ لسانیات میں داخلہ لیا اور اوّل درجہ میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد ایم۔ فل۔ کیا جس میں اس نے "قائم گنج کے پٹھانوں کی لسانی خصوصیات" پر مختصر سا مقالہ لکھا۔ یہ بعض لحاظ سے ایک منفرد تالیف تھی جسے آئندہ پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے پھیلایا جا سکتا تھا۔ لیکن شادی کے بعد اس کی

ساری ریسرچ دھری رہ گئی۔ ہندوستانی لڑکیوں کا یہی المیہ ہوتا ہے کہ اچھی طالبات بھی بعض اوقات گھر گرہستی میں پھنس کر رہ جاتی ہیں۔ میری ایک پرانی خواہش یہ تھی کہ میری چاروں لڑکیوں میں سے کوئی نہ کوئی اپنے لیے تعلیمی کیریئر اختیار کرے۔ ان سب کا تعلیمی ریکارڈ بھی بہت اچھا رہا ہے لیکن غالباً اپنی والدہ کی تربیت کے زیرِ اثر ان سب نے گھریلو زندگی کو ملازمت پر ترجیح دی۔ بہرحال ان کی خوشی میں میری خوشی ہے۔ اب جو چاروں اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی ہیں تو "گھر" خالی ہو چکا ہے۔ صرف لَمْ یَلِدْ کی تثلیث رہ گئی ہے: میں (۶۹ سال)، میری بیوی (۵۸ سال)، اور میرا ناکتخدا بیٹا، جاوید حسین (۳۸ سال)۔

سترھواں باب

"شادم از زندگیٔ خویش ...."

میں اب عمر کی سترّویں سال کی چوٹی پر کھڑا ہوں۔ ۲۸ر جنوری ۱۹۸۹ء کو امید ہے اسے سر کرلوں گا۔ یتیمی کے بچپن سے لے کر شادمانی کے اس دور تک جب میں اپنی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو خود کو مطمئن پاتا ہوں۔ ہر چند ماں باپ کی بے وقت موت کی وجہ سے میں ان کی محبّت اور شفقت سے محروم رہا۔ زندگی کے بعض موڑوں پر مجھے ان کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا اور اس وقت بے بسی کے عالم میں میری آنکھوں آنسو چھلک اٹھتے۔ لیکن چوں کہ میرے حافظے میں ان کا کوئی مادّی نقش محفوظ نہیں تھا، اس لیے اس کیفیت پر بہت جلد قابو پالیتا، اور اس کے ساتھ یہ احساس قوی تر ہوجاتا کہ مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے۔ مجھے میری ننھیال کے مشترکہ خاندان نے زندگی کی بہت سی تلخیوں سے بچالیا۔ اسی لیے میں ایسے خاندان کی برکتوں کا قائل رہا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ مجھے ضروریاتِ زندگی کے سلسلے میں وہ فراخ دستی حاصل نہیں رہی جو مجھے ہوتی اگر والدین کی شفقت کا سایہ نصیب رہتا لیکن میں اِس اعتبار سے خوش قسمت رہا کہ مجھے ایک محبت اور خدمت کرنے والی رفیقۂ حیات ملی، جس نے "ممتا" کی کمی کو بہت کچھ دل سے بھلا دیا۔ وہ مجھ سے عمر میں ۱۲ برس چھوٹی تھی، جب ۱۹۴۸ء میں وہ میرے گھر میں دلھن بن کر آئی تو اس وقت سترہ برس

کی بھولی بھالی لڑکی تھی۔ آتے ہی اس پر خانہ داری کا بوجھ پڑ گیا۔ اپنی والدہ کی تربیت کی وجہ سے وہ اِس پُر آشوب دور سے خوش اسلوبی سے گزری۔ کم عمری کی وجہ سے اس سے کبھی کبھی کوتاہیاں ہو جاتی تھیں۔ میں بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر بَرافروختہ ہو جاتا، غصّے سے زیادہ ضد ہوتی۔ لیکن داد دیتا ہوں اس وفا کی دیوی کے صبر و تحمّل کی، وہ ہر بار یہی کہتی کہ میری ماں نے رخصت کرتے وقت نصیحت کی تھی کہ بیٹی! جس گھر میں جا رہی ہو کیسے ہی نا مساعد حالات کیوں نہ ہوں وہاں سے چار کے کاندھوں ہی پر نکلنا۔ اس مہر و وفا کی دیوی کے صبر و تحمل نے بالآخر کام کیا اور یہ کندۂ ناتراش پٹھان بچہ رفتہ رفتہ رام ہوتا گیا۔ نجمہ کا کہنا ہے کہ عین غیظ کے عالم میں بھی اس کے اس اعتماد میں کبھی کمی نہیں آئی کہ میں اُسے دل سے چاہتا ہوں، اس لیئے انتظار کرتی رہی کہ اِس وحشئ رمیدہ پہ کبھی تو فتح حاصل ہوگی۔ عمر کے ساتھ ساتھ ہم دونوں کی محبت، رفاقت سے مل کر دو آتشہ ہو گئی۔ اب من تو شدم تو من شدی کا مقام ہے۔ وہ یقیناً میری نصف بہتر ہے اور میں اس کا نصف کم تر۔

اب جو اپنی نالائقیوں کا خیال آتا ہے تو وہ منظر سامنے آجاتے ہیں جب میں اسے سرزنش کرتا تو اس کے گلابی رخسار آنسوؤں سے تر ہو جاتے۔ میں بہت جلد اپنی حرکت پر نادم ہو جاتا اور وہ نہایت فیّاضی سے مجھے معاف کر کے زندگی کا سرا وہیں سے اُٹھا لیتی جہاں اُسے چھوڑا تھا۔ نہیں کہہ سکتا کہ تجدیدِ محبّت کا یہ عمل اگر بار بار نہ ہوتا تو شاید بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ یہ بھی نہ بڑھتی۔ چوں کہ وہ میری بیوی ہی نہیں میرا "انتخاب" بھی تھی اور یہ انتخاب مشترک خاندان کے اس ماحول میں ہوا تھا جس کی عکّاسی حسرت کی غزلوں میں ملتی ہے۔ اس لیے میں اپنی واردات کے اظہار کے لیئے یہاں سے حسرت کے حسن کارانہ الفاظ کا سہارا لیتا ہوں:

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

با ہزاراں اضطراب وصد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو از راہِ لحاظ
حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں مجھ کو بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

آج تک نظروں میں ہے وہ صحبتِ راز و نیاز
اپنا جانا یاد ہے، تیرا بلانا یاد ہے

دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سَو سَو ناز سے
جب منا لینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے

چوری چوری ہم سے تم آ کر ملے تھے جس جگہ
مدّتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

"گفتہ آید در حدیثِ دیگراں" کا تطابق جو میری اور حسرت کی عشقیہ واردات کے درمیان ملتا ہے، مجھے اپنا "سرِّ دلبراں" بیان کرنے کی زحمت اور رسوائی دونوں سے فارغ کر دیتا ہے۔

نجمہ نے مجھے پانچ تندرست، خوبصورت اور ذہین بچّوں کا باپ بنایا۔ میری چاروں لڑکیاں — فریدہ، نادرہ، شاہدہ اور زیبا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے گھروں کی ہو چکی ہیں، جہاں وہ خوش اور مطمئن ہیں۔ میں اب پانچ بچّوں کا نانا بن چکا ہوں۔ گرما کی تعطیلات

میں جب ان کے آمد گھر بھر جاتا ہے تو مجھے اپنے بچوں کے بچپن کا سماں یاد آجاتا ہے۔ اور دن بھر کی کلفت' کو فت ختم ہو جاتی ہے۔

نجمہ بڑی گہری ممتا کی مالک ہیں۔ انھوں نے اپنی بچیوں کو اس کا بہرہ وافر دیا ہے۔ ان کی چاروں بچیاں اپنی ماں پر جان دیتی ہیں۔ جس پر اکثر مجھے رشک آتا ہے۔ میری جانب ان کی محبت، خدمت اور خیال کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

اپنے لڑکے جاوید حسین کی جانب سے۔ جواب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے انجینرنگ میں فزکس کا پروفیسر ہے۔ البتہ ہم دونوں فکرمند رہتے ہیں۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ ہندوستان اور امریکہ دونوں جگہ شاندار رہا ہے۔ اسی بنا پر اُسے پہلے ایک امریکن یونیورسٹی اور اس کے بعد ظہران کی یونیورسٹی آف پیٹرولیم اینڈ منرلز (UPM) میں کولمبیا یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کرنے کے فوراً بعد ملازمت مل گئی۔ اپنے تحقیقی کام اور تعلیمی تجربے کی بنا پر وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۳۵ سال کی عمر میں پروفیسری کے اعلیٰ عہدے کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ وہ ہر اعتبار سے ایک سعادت مند بیٹا ہے لیکن اپنی دنیا میں اس قدر مست رہتا ہے کہ نہ اُسے اہلِ خاندان کا خیال ہے اور نہ سماجی رشتوں کا۔ اس تنہائی پسندی نے اس کے ذہن سے گھر بسانے کا خیال بالکل نکال دیا ہے۔ مجھے بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں اس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ سوائے کتاب کے اسے کسی کی رفاقت عزیز نہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ (اب وہ ۳۸ برس کا ہو چکا ہے)، نہ صرف وہ ہمارے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے بھی ع

سعدیؔ از دستِ خویشتن فریاد

ہم اس کے ماضی سے مطمئن رہے ہیں، حال بھی ایسا بے حال نہیں لیکن مستقبل میں اس پر کیا گذرے گی؟ اس کے لیے دونوں متوحش اور مشوّش رہتے ہیں۔

جب میں اپنی گذری ہوئی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ایک خاص قسم کی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے سب سے بڑی خوشی اس بات سے ہوتی ہے

کہ خود کو دوسروں اور اپنی نظر میں باوقار پاتا ہوں۔ میں روایتی قسم کا مذہبی انسان نہیں ہوں تاہم مخصوص قسم کی سرّیت کا قائل ہوں اور وہ حضرات جو ان گذرگاہوں کے راہ رو رہے ہیں ان سے عقیدت رکھتا ہوں۔ زندگی میں میرا عمومی رویّہ عقلیت پسندی کا ہے لیکن سینے میں ایک دلِ گداختہ رکھتا ہوں۔ سیاست کو اجتماعی زندگی کی ناگزیر ضرورت سمجھتے ہوئے مشتبہ نظروں سے دیکھتا ہوں اس لیے کہ اس میدان میں جواہر لال جیسے انسان کم نظر آتے ہیں۔ میری نظر میں اہل علم و ہنر زیادہ لائق تعظیم ہیں اسی لیے میر، غالب، اقبال اور ٹیگور جیسی ہستیوں کو دل سے عزیز رکھتا ہوں۔

عزتِ نفس مجھے ورثہ میں ملی ہے۔ یہی میری طاقت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ میں نہ کسی کی توہین کرنا چاہتا ہوں اور نہ توہین برداشت کرتا ہوں۔ عام طور پر صلح کل میرا مسلک ہے لیکن جب خودی اور خودداری پر چوٹ پڑتی ہے تو اس کی خاطر اپنا سب کچھ لگا دینے پر تیار رہتا ہوں۔ میں عام طور پر دوست داری کا رویّہ رکھتا ہوں لیکن نامعقولوں سے انتہائی درجے کی سرد مہری بھی دکھا سکتا ہوں۔ میری بڑی بیٹی فریدہ کو میرا یہ قول بہت پسند ہے کہ جب میں کسی کو پسند نہیں کرتا تو اس کے وجود تک کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہوں اور ہندوستان کی ستّر کروڑ کی آبادی کے ہجوم میں پھینک کر اس کی جانب سے مکمل طور پر غافل ہو جاتا ہوں۔ ایسا شخص کبھی سامنے آبھی جاتا ہے تو میں اُسے نہیں پہچانتا۔ اسے دیکھ کر مجھے غصّہ بھی نہیں آتا اس لیے کہ یہ بھی اثباتِ وجود کی ایک علامت ہو گی۔

انسانی تعلقات میں میں ذکی الحس اور زود رنج واقع ہوا ہوں لیکن اسی وقت جب کسی کے قول و فعل سے مجھے تکلیف پہنچی ہو۔ بنیادی طور پر میں جلوت کا نہیں خلوت کا آدمی ہوں۔ اس لیے زندگی میں میرے دوستوں کا حلقہ ہمیشہ محدود و مخصوص رہا۔ میں کسی دوست کو اپنی نسبت سے احساسِ برتری کا شکار نہیں ہونے دیتا۔ میرے لیے سب دوستوں کے 'قد' برابر ہوتے ہیں یہ اور بات ہے کہ اگر

وہ کسی لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے تو میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ جہاں کسی دوست نے آنکھیں بدنیں میں نے راہیں بدل لیں۔ دوست داری کے مسلک کے سلسلے میں مجھے رحیم خان خانان کا یہ دوہا بہت پسند رہا ہے:

رحمن دھاگا پریم کا مت توڑ دو چٹکائے
ٹوٹے پاچھے پھر نہ ملے ملے گانٹھ پڑ جائے

اسی لیے ساری عمر میرا سفر ہجوم سے تنہائی کی طرف رہا ہے۔ میں تنہائی سے مطلق نہیں گھبراتا اس لیے کہ خود سے نہیں گھبراتا۔ البتہ اس دن کے تصوّر سے کبھی کانپ اٹھتا ہوں جب 'مونسِ تنہائی' کی رفاقت سے محروم ہو جاؤں گا۔

میں عام طور پر پابندئ اوقات سے کام کرتا ہوں لیکن بعض دنوں میں میرے معمولات میں کوئی نظم و ضبط نہیں رہتا۔ یہی صورت جسمانی ورزش کی ہے، جس میں مجھے صبح و شام ٹہلنا سب سے زیادہ پسند ہے۔ دہلی جیسے بڑے شہروں میں میرا سب سے محبوب مشغلہ 'دکان بینی' رہا ہے۔ اس مشغلے میں گھنٹے گزار سکتا ہوں۔ میری اس عادت پر میرے دوست ڈاکٹر خلیق انجم نے ایک بار کہا تھا "آپ کو کناٹ پلس سے خریداری کرنے کا بہت شوق معلوم ہوتا ہے حالاں کہ وہ سب سے مہنگا بازار ہے" انھیں کیا معلوم ہے کہ کناٹ پلس سے صرف کتابیں خریدتا ہوں جن کی قیمت ہر جگہ یکساں ہوتی ہے۔ باقی دید ہی دید ہے خرید کچھ بھی نہیں۔ روپے پیسے کی جانب سے لاپرواہ رہا ہوں یعنی کوئی گوں کی چیز مل جاتی ہے تو پھر "مانع دشت نوردی کوئی 'زنجیر' نہیں ہوتی۔ پیسہ کو میں نے ہمیشہ خرچ کرنے کی چیز سمجھا لیکن اسی قدر کہ قرض لینے کی نوبت نہ آئے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے آج تک نہ کسی سے قرض نہیں لیا اور نہ دیا۔ کبھی دینا پڑا تو اس کو شمار نہ کیا۔ روپے پیسے کے سلسلے میں مجھے عُرفی کا یہ مشہور مصرع بہت پسند ہے ع

ہر چہ باشی باش عرفی اند کے زردار باش

یہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ میں کسی منظّم مذہب کا پابند نہیں ہوں سب

مذاہب کو تاریخ کی رد کا آوردہ سمجھتا ہوں، جو اپنا اپنا رول ادا کرتے ہیں اور فرسودہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے احیاء کا دور شروع ہوتا ہے، دوسرے الفاظ ان کے خرقۂ کہنہ میں نئی فکر کے پیوند لگنا شروع ہو جاتے ہیں لیکن ایک جگہ سے پیوند لگتا ہے تو دوسری جگہ سے مسک جاتا ہے۔ سب مذاہب میں کچھ دیرپا اقدار ہوتی ہیں جو اخلاقی اور معاشرتی قدروں کی شکل میں زندہ رہتی ہیں۔ لیکن ان اقدار کو بھی اضافی سمجھنا چاہیئے اس لیئے کہ ہر لحظہ بدلتی ہوئی دنیا میں اقدارِ مطلقہ قسم کی کوئی چیز قائم بالذات نہیں ہوتی۔ ان کا مقام تو اعیانِ نامشہود میں ہو سکتا ہے۔

میں تاریخ انسانی کو ہمیشہ معاشی محرکات کے تابع نہیں سمجھتا۔ ہر شخص اپنی زندگی میں تجربہ کر سکتا ہے کہ اس کا ہر عمل معاشی دباؤ پر سرزد نہیں ہوتا۔ انسانی ذہن جسم و جان کا ایک عجیب و غریب مرکب ہے جس کی پُر پیچ راہوں میں وہ اقدارِ عالیہ پیدا ہوتی ہیں جو آدمی کو انسان بناتی ہیں۔ اسی طرح فنونِ لطیفہ اور افکار و تصورات ہمیشہ معاشیات کے تابع نہیں ہوتے۔

میں چوکھٹوں اور سانچوں کی فکر کا قائل نہیں ہوں چاہے وہ سیاسی ہو یا معاشی یا مذہبی۔ یہ انتہائی شکل میں 'عقیدہ' کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور عقیدہ منافیٔ عقل ہوتا ہے۔ میں چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کا انفرادی حق سے کبھی بھی دستبردار ہونا نہیں چاہتا۔ انسانی سماج کے لیئے اشتراک بہت اچھی قدر ہے لیکن اشتراکیت کی جن شکلوں میں یہ رونما ہوا ہے، اس سے تشویش پیدا ہوتی ہے 'زر، زن اور زمین' کی اشتراکیت سے مسائل کم ہونے کے بجائے زیادہ ہو جاتے ہیں۔ 'زن' کے اشتراک پر تو اب تک کمیونسٹ روس تک عمل پیرا نہیں ہو سکا ہے۔

ستّر برس کی عمر ہو جانے پر بھی میں ابھی زندگی سے تھکا نہیں ہوں۔ ع

میری پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب

ابھی تک میرے دل و دماغ چاق و چوبند ہیں اور مجھے کسی قسم کا جسمانی عارضہ لاحق نہیں ہوا ہے۔ خون میں شکر کی زیادتی ہو جاتی ہے جسے میں غذا میں احتیاط کر کے قابو میں رکھتا

ہوں۔ مجھ میں ابھی تک حوصلۂ قلم ورقم باقی ہے۔ بلکہ یہ کہوں کہ زورِ قلم زیادہ ہوگیا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ علمی کاموں کے کچھ منصوبے رہ گئے تھے جن کی سمیٹا سمیٹی میں لگا ہوا ہوں۔ البتہ شاعری اب دور کی آواز ہو گئی ہے اور یہ تمنّا دل کی دل میں رہ گئی کہ کاش میں اپنے خونِ جگر سے کچھ اور شعری پیکر تراش سکتا! بعض اوقات اپنا کلام دیکھتا ہوں تو ایک اجنبیت سی محسوس ہوتی ہے۔ یہ میں نے کیوں کر کہا؟ اگر مجھے زندگی دوبارہ عطا ہو تو نجمہ کے ساتھ شعر کی دیوی کا پھر خواہش مند رہوں گا۔

بچوں کی جانب سے اطمینان ہے لیکن میری بیوی بیمار رہنے لگی ہیں۔ خون کا دباؤ ہے، ذیابیطس کی بھی شکایت ہے اور سب سے تکلیف دہ بات جوڑوں کا درد ہے۔ اب پتے میں کنکر پڑ گئے ہیں جس کے لیے آپریشن تجویز کیا گیا۔ یہ آپریشن چند ہفتے قبل خوش اسلوبی کے ساتھ ہو گیا۔ نجمہ آپریشن کے سلسلے میں ایک بہادر عورت ہیں۔ میں جس قدر جرّاحی سے گھبراتا ہوں وہ نہایت اطمینان کے ساتھ اسے قبول کر لیتی ہیں۔ کہتی ہیں میرا عقیدہ ہے کہ موت کا ایک دن معیّن ہے، اس لیے اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس عمر میں مجھے ان کی رفاقت کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ وہ ابھی زندگی میں دیر تک میری ہم سفر رہیں۔ ہر چند وہ بار بار یہی خواہش کرتی ہیں کہ وہ اس دنیا سے سہاگن جائیں۔

مکینوں سے قطع نظر مجھے اپنے مکان سے بھی بہت محبت ہے۔ میں نے اس کا نام 'جاوید منزل' اپنے بیٹے کے نام پر رکھا تھا۔ اس کا دوسرا نام جو اس وقت میرے ذہن میں تھا، 'وُرُودِ مسعود' تھا۔ اب یہ اِس خود نوشت کا رکھ دیا گیا ہے۔ لیکن اب یہ کلمۂ توصیفی نہیں کلمۂ اضافی ہے۔

چالیس سال کے ہمسفر

ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ کے جل گئے

مسعود حسین خاں